نقاط

۱

قاسم یعقوب

نئے ادب کا ترجمان

فیصل آباد

نقاط

نئے ادب کا ترجمان

PERSONAL COPY

جگر سے ٹوٹی ہوئی ہو گئی سناں پیدا
دہانِ زخم میں آخر ہوئی زباں پیدا
لسانِ سبزہ، رگِ خواب ہے زباں ایجاد
کرے ہے خامشی احوالِ بیخوداں پیدا
صفا و شوخی و اندازِ حُسن پا بہ رکاب
خطِ سیاہ سے ہے گردِ کارواں پیدا

ادبی سلسلہ (غالب)

نقاط
P-240 رحمٰن سٹریٹ سعید کالونی مدینہ ٹاؤن فیصل آباد

اپریل 2006ء

❁ ادارت : قاسم یعقوب

❁ مشاورت : یوسف حسن، انجم سلیمی

❁ معاونت : پروفیسر سعید احمد، زاہد حسین
ثناء اللہ ظہیر، سید علی محسن

❁ شعبہ اشتہارات : طیب یعقوب 0300-6604048
حافظ طاہر اعوان 0300-7668283
ارشد محمود بٹ 0320-5141055
عاقل فاروق 0300-7226362

❁ شعبہ ترسیل : اعظم رؤف، حبیب احمد چوہدری
ڈاکٹر اشفاق ملک

❁ قیمت : 120 روپے، 12 ڈالر

❁ مطبع : شرکت پرنٹنگ پریس لاہور

❁ رابطہ : P-240 رحمٰن سٹریٹ سعید کالونی مدینہ ٹاؤن فیصل آباد
041-8523241, 0300-6663350
qasimyaqub@hotmail.com

❁ اہتمام : IQRA COMPUTERS PUBLICATIONS

● فیصل آباد ● کولون ● ایڈنبرا

پاکستان
● 1st Floor Rahim Center, Press Market, Faisalabad, PAKISTAN
Tel: 0092(0)41 263 3231, Mob: 0092(0)333 654 1232
Website: www.iqrapub.com, E-mail: info@iqrapub.com

جرمنی
● International Press Haupt Bahnhof, Cologne, GERMANY
TEL/FAX:+ 49 221 6366001
Website: www.iqrapub.com, E-mail: info@iqrapub.com

برطانیہ
● Idara Taleem-ul-Quran Trust, 8 Temple Park , Edinburgh EH11 1HT.UK
TEL: 0044(0)131 229 3844, MOB: 0044(0)7796 460 702
Website: www.iqrapub.com, E-mail: info@iqrapub.com

ترتیب

مضامین

افسانہ

کہانیاں (عالمی ادب سے تراجم)

خصوصی مطالعہ

نظمیں

طویل نظم

عالمی ادب (نظم)

غزلیں

آغاز

اس مابعد جدیدی منظر نامے میں جہاں تفہیم و ترسیل کا دائرہ لامحدود ہے ادب کی تخلیق اور اشاعت کن زمانی و مکانی رنگوں کو وحدت میں پرونے میں مدد دے سکتی ہے؟ ایک ایسا دور جہاں تہذیب و ثقافت کے معاشرتی رویوں کی کوئی حد بندی نہیں وہاں خواب دیکھنے والی آنکھوں کے لئے تعبیر کی بشارت کیا معنی رکھتی ہوگی۔

ادبی اشاعت کی جس حیرانی کا ہم ذکر کرتے آرہے ہیں ایسی بھی کوئی بات نہیں کہ یہ حیرانی کا باعث ہو۔ اردو داں طبقے کے تخلیقی ذوق کی آبیاری کے لئے تقریباً ہر اہم شہر سے جریدے اپنی تخلیقی زیبائش کے ساتھ منظر عام پر آرہے ہیں۔ ان ادبی جریدوں نے کتابوں سے ہٹ کر نہایت اہم کردار ادا کیا ہے مگر گروہ بندیوں نے تشنگی کے احساس کو اب بھی برقرار رکھا ہوا ہے۔ فیصل آباد شہر تخلیقی سرگرمیوں کے حوالے سے اردو اور پنجابی ادب میں اہم مقام رکھتا ہے جب چمنیوں کے دھویں میں کھڈیوں کی آوازیں زیادہ ہو جائیں تو فنون پرورش پاتے ہیں۔ییٹس (Yeats) کہتا ہے کہ ہم اوروں کے ساتھ جھگڑیں تو خطابت کرتے ہیں اور اپنے آپ سے جھگڑیں تو شاعری۔

چنانچہ ایک دفعہ پھر اس شہر کی رکی ہوئی تخلیقی سانسیں بحال کرنے کے لئے سلسلہ ''نقاط'' کا آغاز کیا جارہا ہے۔

ہم اس دریافت کے عمل میں 'مکالمہ' کی دبی فضا کو کھولنے کی بساط بھر کوشش کرنے جارہے ہیں۔جس طرح ''نقاط'' کی تجریدی اہمیت کسی تحریر کے مفہوم کھولنے میں مدد دیتی ہے ہم دعا گو ہیں کہ ادبی سلسلہ ''نقاط'' بھی اس شہر کی ادبی دستاویز کو اشاعتی مفہوم دینے میں کامیاب ہو۔آمین

قاسم یعقوب

مضامین

چین

(نوبل انعام یافتہ تقریر سے اقتباس)

ادیب بطورِ فرد

کاؤشنگ چیان

ترجمہ: ارشد محمود ہاشمی

خدا کی موجودگی اور غیر موجودگی کی بحث سے احتراز برتتے ہوئے میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ملحد ہونے کے باوجود میں نے ہمیشہ اس نامعلوم کو محترم تصور کیا ہے۔ کوئی خدا انسان نہیں ہوسکتا' نہ ہی خدا کی جگہ لے سکتا ہے' نہ ہی فوق البشر بن کر دنیا کا نظام سنبھال سکتا ہے۔ اس کی ایسی تمام تر سعی کا اختتام ابتری اور بدنظمی پر ہوگا۔ نطشے کے بعد کی صدی میں انسان کی ایجاد کردہ تباہیاں انسانیت کی تاریخ کا بدترین باب ہیں، عوام کے نمائندہ یا قوموں کے صدر اور نسلوں کے نمائندوں' گویا ہر طرح کے فوق البشر کہلانے والوں نے سنگین جرائم کے اطلاق میں بے پناہ تشدد کا بے دریغ استعمال کیا ہے جو کسی بھی صورت میں انسانیت پسند فلسفی کی شوریدہ سری سے مشابہ نہیں ہے

ادیب ایک عام سا انسان ہوتا ہے' شاید وہ نسبتاً زیادہ حساس بھی ہوتا ہے لیکن جو لوگ زیادہ حساس ہوتے ہیں، عموماً بڑے ہی کمزور بھی ہوتے ہیں کوئی بھی ادیب نہ تو عوام کا نمائندہ بن کر لکھتا ہے اور نہ اخلاقیات کا علمبردار بن کر۔ اس کی آواز تو بڑی کمزور ہوتی ہے لیکن فرد کی وہ آواز ہے جو زیادہ قابل اعتماد بھی ہے لہٰذا ادیب فقط فرد کی آواز ہی ہوسکتا ہے اور ہمیشہ ایسا ہی ہوا بھی ہے' جب بھی ادب کو قومی گیت' نسل مخصوص کا علم کسی سیاسی پارٹی کا نمائندہ یا کسی طبقے یا گروہ کی آواز بنایا گیا ہے اس نے پروپیگنڈے کی شکل اختیار کر لی ہے۔ ایسا ادب' ادب کی چاشنی سے محروم رہ گیا ہے اس کی ادبیت ختم ہوگئی ہے اور یہ قوت اور منافع کا نعم البدل

بن گیا ہے۔

ابھی ابھی ختم ہونے والی صدی میں ادب کا سابقہ اسی بدنصیبی سے پڑا اور جتنی اجارہ داری سیاست اور قوت نے اس پر حاصل کر لی وہ اس سے قبل ناپید تھی۔ ادیب بھی شدید مظالم کا شکار بنے تاکہ ادب اپنا وجود قائم رکھ سکے اور سیاست کا آلہ کار نہ بننے پائے اس کے لئے ضروری ہے کہ یہ فرد کی طرف پلٹ آئے کیونکہ ادب کا نمود ہی فرد کی محسوسات سے ہے اس کا مطلب یہ قطعی نہیں کہ ادب خود کو سیاست سے بالکل بے تعلق کر لے یا یہ کہ اس کا سیاست سے متعلق ہونا لازمی ہے، پچھلی صدی میں ادبی رجحانات یا کسی ادیب کے سیاسی رجحان کے تنازعے نے ادب کو کافی نقصان پہنچایا ہے' نظریات نے بھی متعلقہ تنازعات کو روایت پر فوقیت دے کر اور تنازعات کی اصلاح کو انقلاب کا نام دے کر ادبی معاملات کو کاری ضرب پہنچائی ہے۔ اگر کوئی نظریہ قوت سے مل جائے اور نئی طاقت بن کر ابھر جائے تب ادب اور فرد دونوں ہی نیست و نابود ہو جائیں گے۔

بیسویں صدی کا چینی ادب بار ہا زخم خوردہ ہوا اور حق تو یہ ہے کہ ادب پر سیاست کی عملداری کی وجہ سے یہ جان کنی کے عالم میں تھا ادبی انقلاب اور انقلابی ادب دونوں ہی نے ادب اور فرد کو سزائے موت عطا کر دی تھی۔ انقلاب کی آڑ میں چین کی روایتی ثقافت پر حملوں نے ادب کو ممنوع قرار دے دیا اور کتب سوزی کے واقعات رونما ہوئے۔ پچھلے سو برسوں میں بے شمار ادیب گولیوں کا نشانہ بنائے گئے۔ نذر زنداں ہوئے' ملک بدر کئے گئے یا سخت آزمائشوں کا شکار بنے' چین کی مختلف سلطنتوں کے مقابلے میں یہ انتہائی جبر و تشدد اور آمریت کا دور تھا کہ جس نے چینی زبان میں ادبی تخلیق کو بے پناہ سختیوں سے دوچار کیا اور حتیٰ کہ تخلیقی آزادی کی حمایت کرنی ہوتی تو اس کے پاس دو ہی راستے تھے یا تو وہ خاموش ہو جاتا یا ملک چھوڑ دیتا' ادیب بہر حال زبان کے بھروسے سے ہی زندہ رہتا ہے اور اتنے لمبے عرصے تک خاموش رہنا تو خودکشی کے مترادف تھا۔ جسے یہ خاموشی پسند نہ تھی' خودکشی منظور نہ تھی' جس ادیب کو باطن کے اظہار کی بے تابی تھی اس کے پاس ملک چھوڑنے کے علاوہ اور کوئی راستہ نہ تھا' مشرق و مغرب کے ادب پر نظر ڈالئے تو ہمیشہ ایسا ہوا ہے۔ چھویوآن سے دانتے' جوائس 'تھامس مان' شالفسٹین تک' اور 1989ء میں تھئن آن من قتل عام کے بعد لاتعداد چینی

دانشوروں تک یہی ہوتا آیا ہے یہ تقدیر ہے ان شاعروں اور ادیبوں کی جو اپنی آواز کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔

چینی معاشرے پر مسلط ماؤ کی آمریت کے زمانے میں اپنی زمین کو خیر باد کہنا بھی ممکن نہ تھا۔ملوکیت کے زمانوں میں جو عبادت گاہیں ادیبوں کو پناہ دیا کرتی تھیں انہیں بھی برباد کردیا گیا' خفیہ طور پر لکھنا بھی موت کے مترادف تھا اپنی دانشورانہ شناخت کو قائم رکھنے کے لئے ایک ہی راستہ تھا، خود کلامی کا اور وہ بھی نہایت ہی پوشیدگی کے ساتھ، یہ کہا جاسکتا ہے کہ خود کلامی ادب کا نقطۂ آغاز ہے اور اس کی ترسیل کے لئے زبان کا استعمال ثانوی ہے ادیب افکار و محسوسات کو زبان کی شکل عطا کرتا ہے جو لفظوں کے روپ میں ادب کا حصہ بن جاتی ہیں اس وقت اس کی اہمیت یا افادیت کا کوئی خیال نہیں ہوتا اور نہ ہی اس کے شائع ہونے کا خیال۔یعنی افادیت یا اشاعت کی غرض سے ادب کی تخلیق نہیں ہوتی ہم صرف اس لئے لکھتے ہیں کہ اس عمل سے ہمیں سرور حاصل ہوتا ہے، تسکین ملتی ہے اور ہم اس کے بغیر جی بھی نہیں سکتے۔

میں اپنے تجربوں کی بنیاد پر کہہ سکتا ہوں کہ ادب انسان کی ذاتی اقدار کی تصدیق ہے ادب کا جنم ادیب کی ذاتی ضروریات کا نتیجہ ہے اس کا معاشرے پر کوئی اثر ہوتا ہے یا نہیں اس کا فیصلہ متعلقہ تخلیق کی تکمیل کے بعد ہی کیا جاسکتا ہے اور یہ بھی مسلمہ حقیقت ہے کہ معاشرے پر یہ اثر ادیب کی خواہشوں سے طے نہیں پاتا۔

میرا خیال ہے کہ موجودہ زمانے کے ادیب کے لئے کسی مخصوص قومی ثقافت کی پیشکش کی سعی بے بنیاد ہے ایک لسانی فن کا خالق ہونے کے ناطے یہ قطعی غیر ضروری ہے کہ ایسی کسی قومی شناخت کو سینے پہ چسپاں رکھا جائے جس کی بظاہر یوں بھی پہچان ہوسکتی ہے۔متعلقہ زبان میں جو کچھ پیش کیا جاچکا ہے' ادیب کی خلاقی واقعتاً وہیں سے شروع ہوتی ہے جو کچھ اس کی زبان میں معرض اظہار میں نہیں آسکا ہے۔وہ محض اس کی ہی ترسیل کرتا ہے ۔ادب قومی سرحدوں میں مقید اور محصور نہیں رہ سکتا۔آج کے ادیب پر اس کی اپنی نسل کی ثقافت کے ساتھ ذوثقافتی اثرات بھی ہیں ۔قومی سرحدوں کی طرح ہی نظریات اور نسلی شعور سے بھی ادب سوا ہے۔ایسا اس لئے ہے کہ انسان کا وجود زندگی کے متعلق نظریات سے پرے ہے ادب انسانی وجود کے پس و پیش کا کائناتی مشاہدہ ہے اور کچھ بھی منہیات میں شامل نہیں،

ادب پر عائد پابندیاں ہمیشہ ظاہری ہی رہی ہیں۔ سیاست، معاشرہ، اخلاقیات اور روایات نے اپنے لئے ادب کو اپنے مختلف سانچوں میں ڈھالتے رہنے کی کوششیں کی ہیں۔ حالانکہ ادب نہ تو اقتدار کا کھلونا ہے اور نہ معاشرے کی عیش کوشی کے لئے شئے، اس کی جمالیاتی خصوصیت ہی اس کا اپنا میزان ہے انسانی جذبات سے داخلی طور پر وابستہ جمالیات ادبی کارناموں کی نا قابل تنسیخ میزان ہے۔ اس طرح کے معروضی جمالیاتی فیصلوں کے مستحکم کائناتی پیمانے بھی ہیں۔

شاعرانہ محسوسات محض جذبات کے اظہار سے ہی حاصل نہیں ہوتے اس کے اظہار کی کئی سطحیں ہیں اور بلند سطحوں پر پہنچنے کے لئے سردعلاحدگی کی ناگزیر ہے' انسانی جذبات کی بنیادوں پر قائم جمالیات کبھی قدیم اور نا قابل عمل نہیں ہوتی جبکہ برعکس معاملہ برحق ہے وہ ادبی کارگزاریاں جو فیشن کی مانند ابھرتی' ڈوبتی رہتی ہیں ان کا تعلق صرف جدید تر سے ہوتا ہے یعنی جو کہ نیا ہے' اچھا ہے عام طور پر بازاری تحریک کا فلسفہ یہی ہوتا ہے جس سے کتابوں کا بازار بھی بری نہیں ہے لیکن اگر ادیب کا جمالیاتی فیصلہ بازاری مانگوں کو اپنانے لگا تو یہ یقیناً ادب کی خودکشی ہوگی۔ میرا خیال ہے خاص طور پر آج کے بازاری معاشرے میں سر دادب کا ہی سہارا لینا چاہئے۔

ادب سیاست کا نہیں بلکہ براہ راست فرد کا معاملہ ہے یہ مشاہدہ اور دانش کا خوبصورت امتزاج ہے جو دائرۂ تجربے میں آچکا ہے اس کا تبصرہ ہے' ذہن کی کسی مخصوص حالت کی محسوسات کی پیش کش ہے اس کی یادگار ہے، ہم جسے ادیب کہتے ہیں وہ کوئی اور تو نہیں بجز ایک لکھنے اور بولنے والے کے، آیا اسے پڑھا جارہا ہے یا سنا جارہا ہے یہ دوسروں کے انتخاب کا معاملہ ہے۔ ادیب عوام کے احکام پر عمل کرنے والا کوئی جانباز نہیں اور نہ وہ مجسموں کی مانند پرستش کئے جانے کے قابل ہے اور یقیناً وہ کوئی مجرم یا عوام دشمن بھی نہیں ہے بسا اوقات خود وہ اور اس کی تحریریں نشانہء ستم بن جاتی ہیں وہ بھی دوسروں کی تکمیل کے لئے۔ جب حکام عوام الناس کی توجہ مبذول کرنے کے لئے کچھ دشمنوں کی ضرورت محسوس کرتے ہیں تو ادیبوں کی ہی قربانیاں دی جاتی ہیں اور اس سے بھی افسوس ناک واقعہ تو یہ ہے کہ جو ادیب ان فریبوں کا شکار بنتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ قربان ہوجانا ان کے لئے عظمت کی بات ہے۔

ادیب اور قاری کا رشتہ ہمیشہ روحانی ابلاغ کا معاملہ رہا ہے جس کا وسیلہ ادب

ہے۔ادب ہمیشہ انسانی اعمال کی لازمی صورت رہا ہے جس میں ادب اور قاری دونوں ہی اپنی قوت کا فیصلہ کی وجہ سے مصروف ہیں۔لہٰذا ادب عوام کے تئیں ذمہ دار نہیں ہے ایسا ادب جس نے اپنی ناقابل اعتنا شناخت کو بحال رکھا ہے' اسے سردادب کہا جاسکتا ہے' اس کا وجود فقط اس لئے ہے کہ انسان کو مادی مسرتوں کے سوا ایک خالص روحانی مسرت کی تلاش بھی ہے اس قسم کا ادب ایسا نہیں ہے کہ آج ہی تخلیق ہورہا ہے' ادوار رفتہ میں اس کا مقابلہ جہاں جابر سیاسی قوتوں اور معاشرتی روایات سے تھا وہیں آج اس کی جنگ بازاری معاشرے کی نقصان دہ معاشی اقدار سے ہے اس کے وجود کی ضمانت تنہائی کو برداشت کرنے کی خواہش پر قائم ہے اگر کوئی ادیب خود کو اس قسم کی تحقیقات کے لئے وقف کردے تو اس کے لئے کاروبار حیات مشکل ہوجائے گا اس لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ ایسی تخلیقات کو بیش قیمت' نفیس تصور کیا جائے' خالص روحانی تسکین کی ایک صورت اگر ایسے ادب کا مستقبل خوش آئند ہوسکا یا شائع اور فروخت ہوسکا تو یہ صرف ادیب اور اس کے کرم فرماؤں کی کوششوں کا ہی نتیجہ ہوگا' شاؤشوے چھن اور کافکا کی مثالیں پیش نظر ہیں۔ان کی تخلیقات ان کی زندگی میں غیر مطبوعہ رہیں اس لئے وہ نہ تو کسی قسم کے ادبی تحریک کے روح روان بن سکے اور نہ ہی مشاہیر' ان ادیبوں نے معاشرے کے حاشیوں اور جوڑوں پر ٹکے رہ کر خود کو اس قسم کے روحانی عمل میں مصروف رکھا جس کے بدل کی صورت انہیں کسی شئے کی جستجو نہ تھی انہوں نے معاشرتی سند کی جستجو نہیں کی۔انہیں فقط تخلیق سے ہی مسرت' حظ اور تسکین حاصل ہوتی تھی۔سردار ادب بھی اپنی بقاء کے لئے غریب الوطنی کو برداشت کرلے گا کیونکہ یہ وہ ادب ہے جس نے اپنی روحانی آزادی کے لئے معاشرے کے ذریعہ حبس بے جایا معاشرے کے محبس کو قبول نہیں کیا اگر کوئی نسل اس قسم کے غیر مطلب پرست ادب کو جگہ نہ دے سکی تو یہ محض ادیب کی بدنصیبی ہی نہیں اس نسل کا المیہ بھی ہے۔

میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ زندگی جشن سے عبارت نہیں ہے اور نہ ہی ایسا ہے کہ سویڈن' جہاں پچھلے ایک سو اسی برسوں میں کوئی جنگ نہیں ہوئی' کی طرح دنیا کے بقیہ حصوں میں امن وسکون ہے' یہ نئی صدی انسان کے تخریب کاروں اور تباہ کاریوں سے محض اس بناء پر محفوظ نہیں رہ سکتی کہ پچھلی صدی میں ان کی انتہا تھی' انسان کے پاس دماغ تو ہے مگر وہ اتنا

ذہین نہیں کہ ماضی سے یہ سبق حاصل کر سکے کہ جب اس کے دماغ میں تخریب کے کیڑے کلبلائیں گے' انسان کی بقا ہی خطرے میں پڑ جائے گی انسان کے لئے یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ ترقی کے زینے طے کرنے لئے مختلف مراحل سے گزرے اور اس مقام پر میں انسانی تہذیب کا حوالہ پیش کرنا چاہوں گا تاریخ اور تہذیب بلا اشتراک آگے نہیں بڑھیں عہد وسطیٰ کے یورپ کے انجماد سے عہد حاضر میں ایشیا کی سرزمین پر منڈلاتے خطرات تک اور بیسویں صدی کی دو عالمی جنگوں کی تباہ کاریوں تک مردم کشی کے وسائل سہل تر ہوتے گئے ہیں سائنسی اور تکنیکی ترقیات کا یقیناً یہ مطلب نہیں کہ ان کی وجہ سے انسان مزید مہذب ہو گیا ہے۔

تاریخ کی وضاحت کے لئے کسی سائنسی نظریے یا کسی مجہول جدلیاتی بنیاد پر تاریخی تناظر کی توضیح بھی انسانی اعمال کی تشریح سے قاصر رہی ہے اب جبکہ پچھلی صدی کا مثالیت پسند اعتقاد متزلزل ہو چکا ہے اور انقلابات کا سلسلہ بھی سرد ہے' تلخیوں کا احسان ہنوز قائم ہے' نفی کی نفی سے ثبات کا جنم نہیں ہوتا اور ایسا بھی نہیں ہے کہ انقلاب نے محض نئی چیزوں کی نوید دی ہے کیونکہ مثالیت پسند خوش کن دنیا کی بنیاد ہی قدامت کی تخریب پر قائم تھی۔معاشرتی انقلاب کے اس اصول کا اطلاق ادب پر بھی ہوا جس نے تخلیق کی کائنات کو میدان جنگ بنا دیا جہاں پر پہلے عوام کو نیست و نابود کیا گیا اور پھر ثقافتی روایات کچلی گئیں ۔ان تمام معاملات کی ابتداء صفر سے ہوگی' جدید کاری اچھی بات تھی اور ادب کی تاریخ کو بھی مستقبل زیر و زبر کے تناظر میں پیش کیا گیا۔ادیب خدا کی جگہ نہیں لے سکتا اس لئے اس کے لئے یہ قطعی نامناسب ہے کہ وہ اپنی انا کو اس قدر ابھار دے کہ خود کو خدا سمجھنے لگے اس سے نہ صرف یہ نفسیاتی پیچیدگیاں ابھریں گی اور اسے مجنوں بنا دیں گی بلکہ پوری دنیا سراب بن جائے گی جس میں اس کے وجود سے باہر قائم ہر شئے انتہائی تکلیف دہ ہوگی جس کی وجہ سے اس کا زندہ رہنا مشکل ہو جائے گا' دوسرے جہنمی ہیں' یہی وہ فکر ہے جو اسے اپنی ذات کے بے قابو ہونے پر ستاتی رہے گی۔ایسی صورت میں وہ مستقبل کے لئے خود کو قربان کر دینا چاہے گا اور دوسروں سے بھی ایسی ہی توقع کرے گا۔

بیسویں صدی کی تاریخ کو مکمل کرنے کی کوئی عجلت نہیں ہے اگر دنیا پھر کسی نظریاتی سانچے کے خرابے میں دھنسنے لگے تو پھر اس تاریخ کا کیا فائدہ' لوگ اسے اپنے مفاد کی خاطر

ازسرنو ترتیب دے لیں گے، ادیب کوئی پیغمبر بھی نہیں ہے اہم یہ ہے کہ عصر حاضر یعنی حال کے ساتھ زندگی گزاری جائے، سراب سے نجات حاصل کی جائے، وقت کے موجودہ لمحے پر واضح نظر ڈالی جائے اور س کے پہلو بہ پہلو ذات کا محاسبہ بھی کیا جائے، ذات بھی مکمل انتشار وابتری سے عبارت ہے اور کائنات سے سوال کرنے کے ساتھ ہی اپنی ذات پر بھی نظر ڈالنی چاہئے۔ یہ بربادیاں اور مظالم کسی انسان کی ہی دین ہیں لیکن انسان کی پست ہمتی اور اس کا اضطراب بھی اکثر دکھ کے احساس کو شدید کر دیتا ہے جو دوسروں کے لئے بھی بدنصیبی بن جاتی ہے یہی تو ہے انسان کے برتاؤ کی لاتشریحی فطرت، اپنی ذات سے متعلق انسان کے علم کی تفہیم تو اور بھی مشکل ہے ادیب فقط اپنی ذات پر نظر مرکوز رکھنے والا ایک فرد ہے اور جب وہ ایسا کرتا ہے تو اس ذات پر روشنی ڈالنے والا شعور کا ایک تار نمو پانے لگتا ہے۔ ادب کا مقصد پامالی نہیں ہے اس کی اہمیت انسان کی دنیا کے نامعلوم، کم معلوم حقائق اور ان حقائق کی تلاش وجستجو اور انہیں آشکار کرنے میں مضمر ہے جن کے متعلق یہ واہمہ ہے کہ وہ معلوم کی صف میں شامل ہے لیکن واقعتاً جن کا علم نہیں ہے، نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ حق ادب کی نہایت ہی بنیادی اور لائیفک خصوصیت ہے۔

نئی صدی آ پہنچی ہے مجھے اس سے بحث نہیں کہ یہ درحقیقت نئی ہے یا نہیں لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ادب میں انقلاب اور انقلابی ادب حتیٰ کہ نظریات کا بھی خاتمہ ہونا طے ہے وہ معاشرتی مثالیت پسندی جس نے ایک صدی سے زیادہ عرصے کو مکفون رکھا، زوال پذیر ہوچکی ہے اور جب ادب این وآں نظریے کے شکنجوں کو توڑ دے گا تب بھی اسے انسانی وجود کے پس وپیش کی جانب واپس آنا پڑے گا کہ جس میں ہنوز کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی ہے اور اس لئے یہ ادب کا لافانی موضوع بنا رہے گا یہ پیش گوئیوں کا زمانہ نہیں ہے اور میرا خیال ہے کہ یہ اچھی بات ہے۔ پیغمبر اور مصنف کا کردار ادا کرنے والے ادیب بھی ختم ہو جائیں گے کیونکہ پچھلی صدی کی بہت سی پیش گوئیاں فریب ثابت ہوچکی ہیں اور اب مستقبل کے متعلق کسی پیش گوئی کی تشکیل کی ضرورت نہیں کہ ادب کوئی دستاویز ہے، واقعہ ہے کہ دستاویز میں کچھ سچائیاں ہوتی ہیں اور متعلقہ واقعات کے پس پردہ کارفرما عوامل کی اکثر پردہ پوشی کی جاتی ہے جب ادب سچائی کے مقابل آتا ہے تو شخص کے باطن سے لے کر اس واقعے تک کے تمام

مرحلے بے پردہ ہوجاتے ہیں ادب میں یہ داخلی قوت تب تک برقرار رہے گی جب تک کہ ادیب انسانی وجود کے سچے تناظر کی تصویر کشی پر آمادہ رہے گا اور خود کو لایعنی باتوں سے محفوظ رکھے گا۔

ادیب کی داخلی حیثیت اور اس کی بصیرت ہی سچائی کو اخذ کرنے میں، اس کا ادراک کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے اور ان کی ہی وجہ سے ادب کا متعین ہوتا ہے لفظوں کے کھیل اور تکنیک اس کا بدل نہیں ہوسکتے حق کی بہت سی تعریفیں ہیں اور اسے کس طرح پیش کیا جائے، اس کے بھی مختلف ادیبوں کے پاس مختلف زاویے ہیں لیکن فقط ایک نگاہ بتاسکتی ہے کہ آیا ادیب انسانی عوامل اور برتاؤ کی مصنوعی آرائش کررہا ہے ایک مکمل اور ایماندار تصویر کشی، کسی مخصوص نظریے کے ادبی تنقید حق اور غیر حق کو معیادی تجزیئے میں تبدیل کردیتی ہے لیکن اسے اصول وقوانین کا ادبی تخلیق سے کوئی تعلق نہیں کوئی ادیب کے روبرو ہے یا نہیں، یہ محض تخلیقی طریقہ کار کا مسئلہ نہیں ہے، اس کا تعلق تخلیق کے تئیں اس کے رویے سے بھی ہے حق محض تجزیہ نہیں ہے اس کے اخلاقی لاحقے بھی ہیں اخلاق کی تعلیم ادیب کا فرض نہیں ہے اور مختلف لوگوں کی تصویر کشی کے دوران وہ اپنی ذات کے بخیئے بھی ادھیڑتا ہے حتیٰ کہ اپنے باطنی رموز بھی۔ادیب کے لئے ادب میں حق کی پیشکش اخلاقیات کا احتمال پیش کرتی ہے یہ ادب کی اخلاقیات ہے ایسا نہیں کہ ادب صرف حقیقت کا چربہ ہے یہ اس حقیقت کی سطح پرتوں کو ادھیڑ کر اس کے داخلی عوامل کی شناخت کے لئے گہرائیوں تک جاتا ہے یہ بے بنیاد سرابوں کو ختم کرتا ہے، نہایت بلندی سے معمولی واقعات پر نظر ڈالتا ہے اور انہیں ان کے مکمل آہنگ کے ساتھ وسیع تناظر میں پیش کرتا ہے۔

ادب تخیل پر بھی منحصر کرتا ہے لیکن اس طرح کا ذہنی سفر فقط واہیات اور لغویات کی پیش کش نہیں ہے حقیقی احساسات سے عاری تخیل اور زندگی کے تجربوں کی بنیادوں سے غافل ملمع نہایت قبیح اور ناقابل اعتماد ہیں۔ جو ادب خود ادیب کو متاثر نہیں کرپائے گا وہ قاری بھی کوئی تاثر قائم کرنے سے قاصر ہوگا۔ سچ تو یہ ہے کہ زندگی کے معمولی تجربات پر ادب کا انحصار نہیں ہوتا اور نہ ہی صرف اس کے ذاتی تجربات ہی ادب کی تخلیق کرسکتے ہیں۔

اسے نعمت یا لغت جو کہہ لیں زبان کے اندر یہ قوت ہے کہ وہ ذہن وجسم کو دہلا دے،

زبان کا فن اس امر پر منحصر ہے کہ اسے برتنے والا کتنی چابکدستی کے ساتھ اپنے احساسات کو دوسروں تک پہنچا سکتا ہے۔ یہ کسی اشاریاتی نظام یا معنیاتی ساخت کا معاملہ نہیں ہے کہ جنہیں صرف قواعدی ساخت سے سروکار ہے۔ زبان نہ تو کوئی مجرد تصور ہے اور نہ اس کا سالمہ، یہ حس محسوس کو تحریک عطا کرتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اشارے زندہ قوم کی زبان کی جگہ نہیں لے سکتے۔ صرف۔۔۔۔ اور خطابت کے سہارے ہی کسی بات کے پس پردہ پوشیدہ خواہش، ارادہ، جذبہ اور لہجے کا پوری طرح اظہار نہیں کیا جا سکتا ادب کی زبان کا با آواز ہونا اور زندہ قوم کے ذریعہ بولا جانا ضروری ہے تا کہ فکر کی ترسیل کے سالمہ کے ساتھ ہی یہ سبھی حس کو بھی قابل قبول ہو، زبان کی انسانی ضرورت معنی کی ترسیل کے لئے نہیں، دوسرے شخص کو سننے اور اس کے وجود کی تصدیق کے لئے بھی ہے۔

ڈیکارڈ کا خیال مستعار لے کر ادیب کے لئے کہا جا سکتا ہے کہ "میں کہتا ہوں اس لئے میں ہوں" ادیب کا "میں" ادیب خود بھی ہو سکتا ہے، راوی یا متعلقہ تخلیق کا کوئی کردار بھی راوی کی شکل میں یہ، وہ اور تم بھی ہو سکتا ہے۔ اپنی تخلیقات میں میں نے کرداروں کے نام کی جگہ اسم ضمیر کا استعمال کیا اور اسم ضمیر میں "تم" وہ استعمال میں نے مثالی کرداروں کی جانب اشارہ کرنے کے لئے بھی کیا ہے کسی ایک کردار کی مختلف اسم ضمیر کے ذریعہ تصویر کشی دوری کا ایک احساس پیدا کرتی ہے اس کی وجہ سے اسٹیج پر اداکاروں کو ایک وسیع نفسیاتی عرض بھی ملتا ہے میں نے اپنے ڈراموں میں بھی اسم ضمیر کی تبدیلی کے تجربے کئے ہیں۔

ناول یا ڈرامے کی تخلیق نہ تو ختم ہوگی اور بعض اصناف کے مردہ ہو جانے کا اعلان کرنے کا بھی کوئی جواز نہیں ہے۔

زندگی اور انسانی تہذیب کی ابتداء میں ہی جنم لینے والی زبان بھی عجائبات سے پرے ہے اور اس کی بیان کی قوت کی حدود بے پناہ ہیں یہ ادیب کی ذمہ داری ہے کہ وہ زبان میں پوشیدہ اس قوت کو تلاش کرے اور اسے ترقیاں عطا کرے، ادیب خالق کائنات نہیں ہے اس لئے وہ خواہ یہ دنیا کتنی بھی پرانی کیوں نہ ہوگئی ہو اسے یکسر ختم نہیں کر سکتا، وہ کسی نئی مثالی دنیا کی تعمیر بھی نہیں کر سکتا خواہ موجودہ دنیا نہایت مبہم اور انسانی تفہیم سے بالاتر ہی کیوں نہ ہو وہ صرف پیش رووں کی باتوں کا سلسلہ آگے بڑھاتے ہوئے کوئی نئی بات کہہ سکتا ہے یا جہاں

پیش روؤں نے اپنی باتیں ختم کیں، وہیں سے از سرنو ابتداء کر سکتا ہے۔

ثقافتی انقلاب کی چیرہ دستیوں سے بھی ادب کی موت واقع نہیں ہوتی اور نہ ہی ادیب کا نام ونشان مٹا۔ کتاب کی طاقوں پر ہر ادیب کے لئے جگہ محفوظ ہے اور جب تک قاری موجود ہے اس میں زندگی موجود رہے گی، وہ زندہ رہے گا کسی ادیب کے لئے اس سے بڑا انعام اور کیا ہوسکتا ہے کہ وہ انسانیت کے وسیع ذخیرۂ ادب میں ایک کتاب چھوڑ جائے جسے مستقبل میں پڑھا جاتا رہے۔ادب واقعتا اس لمحہ دلچسپی کا باعث اور محرک بنتا ہے کہ جب ادیب اس کی تخلیق کرتا ہے اور قاری اس کا مطالعہ، اگر مستقبل کے لئے تخلیق کی جائے تو یہ خود کو ہی نہیں دوسروں کو بھی فریب میں مبتلا کرتا ہے۔ادب زندوں کے لئے ہے اور درحقیقت زندگی کے عصر حاضر کی تصدیق ہے یہی وہ لافانی عصر حاضر (حال) اور انفرادی زندگی کی تصدیق ہے جس کی وجہ سے ادب، ادب ہے۔

جب تخلیق ذریعہ معاش کا وسیلہ نہ ہو اور جب کوئی اس میں اس طرح غرق ہو جائے کہ کوئی یہ بات فراموش کر بیٹھے کہ کوئی کیوں لکھ رہا ہے، اور کوئی کس کے لئے لکھ رہا ہے تو لکھنا ایک اہم ضرورت بن جاتا ہے اور لکھی جانے والی تحریر ادب بن جاتی ہے ادب کا یہ غیر افادی پہلو ہی ادب کی اساس ہے جدید معاشرے میں ادب کی تخلیق کا ذریعہ معاش بن جانا محنت کی تقسیم کا کریہہ پھل ہے آج یہی صورت حال ہے کہ جب بازار کی معیشت اس قدر حاوی ہوگئی ہے کہ کتاب بھی ایک مصنوع بن گئی ہے۔ادب کسی سب سے زیادہ فروخت ہونے والی کتاب یا بہترین کتابوں کی فہرست میں مندرج کتابوں کا نام نہیں ہے اور ٹیلی ویژن پر مشتہر ہونے والے ادیب، ادب کی بجائے اشتہاری بازی میں زیادہ مصروف ہیں۔لکھنے کی آزادی ادیب کی داخلی ضرورت سے پیدا ہوتی ہے جس کا انحصار بازار کے معاملات پر نہیں ہے ادیب جو چاہتا ہے اس کی تخلیق کرتا ہے اس کے تعلق اس کی ذات کے ثبات سے بھی نہیں ہوتا اور یہ معاشرے کے لئے ایک دعویٰ فریب دہی نہیں ہے اس لئے ادیب کو جانباز یا مجاہد کسی بڑے کام یا مشن کے لئے جدوجہد کرتا ہے جو ادبی کارناموں کے دائرہ کار سے باہر کا معاملہ ہے اگر ادیب معاشرے کو دعویٰ دینا چاہتا ہے تو ایسا زبان کے ذریعہ ممکن ہوگا۔اسے اپنے کرداروں، کہانی کے واقعات پر انحصار کرنا ہوگا۔ادب طیش میں بھری چیخ کا نام نہیں نہ ہی

یہ فرد کی حقارت اور غصے کو الزام میں تبدیل کرسکتا ہے' جب فرد کی شکل میں ادیب کے احساسات اس کے ادبی کارناموں میں بکھریں گے تبھی وہ زبان ومکان کی چوٹیں برداشت کرتے ہوئے مدت درازتک زندہ پائیں گے۔

ایسا کوئی دعوٰی معاشرے کی تشکیل تونہیں کرسکتا اور درحقیقت ایسا کوئی دعوٰی ادیب معاشرے سے نہیں کرتا بلکہ اس کی تصنیف کرتی ہے یہ بے پناہ قوتوں کا منبع بھی ہوتی ہے۔جب تک قاری موجود ہیں اس تصنیف کے ذریعہ ادیب کی آواز بھی گونج اٹھتی رہے گی۔یہ دعوٰی معاشرے کی مخصوص آب وہوا کی حدود سے باہر آنے کی صرف ایک انفرادی خواہش ہے لیکن یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں کیونکہ اس کی وجہ سے انسان ہونے پر فخر کا احساس جاگزیں ہوتا ہے جب بھی تاریخ کے قوانین انسان اور انسانیت کی واقعی تشریح سے قاصر رہیں گے' ادب اس کمی کو دور کرتا رہے گا اور اس میں عوام کی اپنی آواز محفوظ رہے گی۔انسان کی تحویل میں صرف تاریخ ہی نہیں' ادب کی شاندار روائتیں بھیہیں جن میں فرد کی مختلف آوازیں سنی اور محسوس کی جاتی ہیں۔

پریم چند اور سینما

نند کشور وکرم

پریم چند ہمارے ملک کے وہ عظیم المرتبت ادیب ہیں جن پر اہلِ اُردو ہی ہندی والے بھی ناز کرتے ہیں اور جنہوں نے ہندی اور اُردو ادب کو اپنے ناولوں اور افسانوں کی صورت میں ایسے بیش بہا سرمائے سے مالا مال کیا ہے جس کے ذکر کے بغیر اُردو یا ہندی فکشن کی تاریخ مکمل ہی نہیں ہوسکتی۔

سینما جسے دنیا کا آٹھواں عجوبہ کہا گیا ہے، پریم چند کے دور میں نیا نیا منظر عام پر آیا تھا اور بتدریج مقبولیت کی منزلیں طے کر رہا تھا حتا کہ ادباء وشعراء بھی اُس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے یہی وجہ ہے کہ جب کچھ فلمسازوں نے پریم چند کی کہانیوں کو فلمانے کے لئے انہیں بمبئی آنے کی دعوت دی تو وہ انکار نہ کرسکے اور اس ذریعہ ابلاغ کے کینوس کی وسعت اور اپنی مالی مشکلات کے پیش نظر انہوں نے اس پیش کش کو قبول کر لیا لیکن انہیں وہاں جو تلخ تجربے ہوئے اُن کی بنا پر وہ ایک سال کے اندر ہی واپس بنارس آ گئے اور پھر اپنے ادبی مشغولات میں منہمک ہو گئے۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں پریم چند کا عہد لگ بھگ وہی ہے جو سینما کے ابتدائی دور کا زمانہ ہے۔ پریم چند کی پیدائش ۱۸۸۰ میں ہوئی تھی اور اسی برس ایڈورڈ مائی برج کے دوڑتے گھوڑے کی تصاویر کو سان فرانسکو میں شیشے کی طشتری کے ذریعے متحرک حالت میں دکھایا گیا ہے اور پھر جب سولہ برس کے تھے تو ہندوستان میں پہلی بار بمبئی کے واٹسن ہوٹل میں لومیر برادران نے چلتی پھرتی تصاویر یعنی خاموش فلموں کی نمائش کی اور یہ پروگرام اتنا کامیاب ہوا

کہ جگہ جگہ ایسی فلموں کی نمائش منعقد کی جانے لگیں۔عوام کے لئے یہ فلمیں معجزے سے کم نہیں تھیں اور وہ ان میں غیر معمولی دلچسپی لینے لگے نتیجہ یہ ہوا کہ جلد ہی ملک میں خاموش فلموں کی تیاری شروع ہو گئی اور بڑے بڑے شہروں میں ان کی نمائش کے لیے سینما گھروں میں بتدریج اضافہ ہونے لگا اور اُن کی وفات سے پانچ سال پیشتر تو ملک میں ''عالم آرا'' کی نمائش کے ساتھ ہی متکلم فلموں کا دور دورہ بھی شروع ہو گیا اور اسے ایک اہم اور موثر ذریعہ ابلاغ کی حیثیت سے قبول کرلیا گیا تھا۔

خود پریم چند بھی بیسویں صدی کے اس عجوبے سے بے حد متاثر تھے اور وہ اسے بہت ہی موثر ذریعہ ابلاغ سمجھتے تھے ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ ہندوستان ایسے ملک میں جہاں اسی فی صد لوگ پڑھنے لکھنے سے معذور ہیں وہاں کتابوں کے ذریعے عوام تک پیغام پہنچنا ممکن نہیں اُن کا خیال تھا کہ ناولوں اور کہانیوں کے فلمیں بنا کر انہیں گاؤں میں دکھایا جائے تا کہ کتابیں نہ پڑھ سکنے والے لوگوں کی اکثریت بھی اس سے مستفید ہو سکے لہذا ۱۹۳۴ میں جب بمبئ کی مشہور فلم کمپنی ''اجنتا سینے ٹون'' کی جانب سے انہیں بمبئ آ کر فلموں کی کہانیاں اور منظر نامے لکھنے کی دعوت دی گئی تو اپنی رفیقہ حیات شورانی کی مخالفت کے باوجود بمبئ جانے کے لئے تیار ہو گئے اور انہوں نے اپنے فیصلے کے حق میں اپنی بیوی کو دلیل دی تھی کہ وہاں جانے میں خاص فائدہ ہوگا وہ یہ کہ ناول اور کہانیاں لکھ کر جو نہیں ہو رہا اس سے کہیں زیادہ فلموں میں دکھا کر ہو سکے گا کہانیوں اور ناولوں سے تو جو لوگ پڑھتے ہیں وہی فائدہ اُٹھا سکتے ہیں فلم سے تو ہر جگہ کے افراد مستفید ہو سکیں گے۔

یہ اُس زمانے کی بات ہے جب اُن کی نول کشور پریس لکھنؤ کی ملازمت چھوٹ چکی تھی اور ''ہنس'' اور ''جاگرن'' کی اشاعت کے سلسلے میں انہیں کافی مالی خسارہ برداشت کرنا پڑ رہا تھا نیز بچوں کی تعلیم اور دیگر گھریلو مصارف کی وجہ سے بھی وہ مالی بحران کا شکار تھے۔

بمبئ جانے سے کچھ دن پہلے انہوں نے ہندی کے مشہور ادیب جینندر کمار کو ایک خط میں تحریر کیا تھا۔

''بمبئ کی ایک فلم کمپنی مجھے بلا رہی ہے تنخواہ کی بات نہیں ٹھیکے کی بات ہے دو ہزار روپے سالانہ پر میں اُس حالت میں پہنچ چکا ہوں جب مجھے اس کے سوا کوئی

چارہ نہیں رہ گیا ہے کہ یا تو وہاں چلا جاؤں یا اپنے ناول بازار میں بیچوں...... کمپنی والے حاضری کی قید نہیں رکھتے میں جو چاہوں لکھوں اور جہاں چاہے چلا جاؤں۔ وہاں سال بھر رہنے کے بعد ایسا کانٹریکٹ کرلوں گا کہ یہیں (بنارس) بیٹھے بیٹھے میں چار کہانیاں لکھ کر دیا کروں گا اور چار پانچ ہزار روپے مل جایا کریں گے جن سے ''جاگرن'' اور ''ہنس'' دونوں بڑے مزے سے چلیں گے۔''

پریم چند جون ۱۹۳۴ میں بمبئی پہنچے اور اجنتا سینے ٹون کے لئے ''مل'' نامی کہانی کی تیاریاں کرنے لگے اور چونکہ کمپنی کے مینیجنگ ڈائرکٹر اور فلم ڈائرکٹر مسٹر بھونانی اور اُن کے ساتھ خلیل آفتاب ہندی نہیں جانتے تھے اس لئے ان کے لئے انہوں نے کہانی کا اُردو کے ساتھ انگریزی میں بھی اسکرپٹ پیش کیا پھر سینیر یو کی آسانی اور بھونانی صاحب کی ایما پر انہوں نے کہانی میں حذف و ااضافہ کیا جس نے نہ صرف پلاٹ میں تبدیلیاں رونما ہوگئیں بلکہ کئی جگہ اصل مطلب اور زبان کا لطف جاتا رہا۔ اس کے بعد فلم کی تیاری کے موقع پر بھی کئی تبدیلیاں کی گئیں اور بالآخر تین مہینے کی محنت و کاوش کے بعد تقریباً ستر ہزار روپے کی لاگت سے فلم مکمل ہو کر نمائش کے لئے تیار ہوگئی۔ اس فلم کے اہم اداکار جے راج بوبدھوا ایڈوانی، خلیل آفتاب، امینہ، نوین، یاگنک، ابوبکر، نیام پلی، اور تارا بائی تھے۔ نیز اس میں خود پریم چند نے بھی فلم میں مزدور یونین کے صدر کا مختصر رول ادا کیا تھا جو مزدوروں اور مل مالکوں کے درمیان سمجھوتا کراتا ہے۔

فلم کمپنی کے اراکین کا خیال تھا کہ یہ فلم بے حد مقبول ہوگی کیونکہ اس میں مزدوروں اور مل مالکوں کی کشمکش، سرمایہ دارانہ استحصال، مزدوروں کی ناگفتہ بہ حالت اور اُن کے پیشوں کی غیر محفوظ حالت اور اس کے نتائج ایسے مسائل کی موثر ڈھنگ سے تصویر کشی کی گئی تھی نیز ابھی تک اس طرح کی کوئی فلم ہندوستانی اسکرین پر پیش نہیں کی گئی تھی۔

فلم کمپنی کے منتظمین کا ارادہ تھا کہ اس فلم کا افتتاح کانگریس کے اجلاس کے موقع پر کسی بڑے قومی رہنما سے کرایا جائے مگر سنسر بورڈ نے اُن کی ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا کیونکہ ایک تو اس کے سنسر ہونے میں اتنی تاخیر ہوگئی کہ اجلاس تک فلم کی نمائش ممکن ہی نہ ہو سکی دوسرے سنسر نے اس پر اس بے رحمی سے قینچی چلائی کہ فلم کے کئی موثر منظر کاٹ دیئے گئے

اور کئی مناظر کو اتنا مختصر کر دیا گیا کہ اُن کی اہمیت اور افادیت ختم ہو کر رہ گئی علاوہ ازیں کہانی کے واقعات اور مکالموں کا تسلسل ٹوٹ کے رہ گیا نتیجتاً کمپنی کو از سر نو فلم کے کئی مناظر کی تصویر کشی کرنی پڑی مگر اس سے بھی سنسر بورڈ کی تسلّی نہ ہوئی آخر بڑی تگ دو کے بعد سنسر بورڈ نے ''مل'' نام کے بجائے ''غریب مزدور'' کے نام سے فلم کو اُن علاقوں میں دکھانے کی اجازت دی جہاں کارخانے نہ ہوں اس طرح یہ فلم بمبئی میں تو نہیں البتہ پنجاب، اُتر پردیش وغیرہ میں ریلیز ہوئی مگر وہاں بھی چند مقامات پر نمائش کے لئے پیش کرنے بعد سنسر نے ایک بار پھر کئی مناظر کو قینچی کی نظر کر کے فلم کے جاندار حصوں کو حذف کر دیا اور وہ فلم جسے گاندھی جی کے آدرشوں کا ترجمان کہا گیا تھا۔ مل مالکوں کی مخالفت کے کارن سرکار نے کانٹ چھانٹ کر کے بے ربط اور بے جان فلم میں تبدیل کر دیا تھا جسے دیکھ کر فلم بینوں کو بے حد مایوسی ہوئی خود پریم چند نے بھی جب فلم کی ریلیز کے کوئی ڈیڑھ برس بعد اسے بنارس میں دیکھا تو انہیں اتنی مایوسی اور دکھ ہوا کہ انہوں نے اپنے قتل سے تعبیر کرتے ہوئے ''ہنس'' کے ایک قلمکار بھنور لال سنگھوی کو ایک خط میں لکھا ''یہ ہے پریم چند کی ہتیا۔ یہ پریم چند کی نہیں فلم کے ڈائرکٹر اور مالک کی کہانی ہے''۔

اس سے پیشتر ۲۸ نومبر ۱۹۳۴ کو انہوں نے جینندر کمار کو بھی تحریر کیا تھا:

''فلمی حال کیا لکھوں ''مل یہاں پاس نہیں ہوا۔ لاہور میں پاس ہو گیا دکھایا جا رہا ہے۔ پروڈیوسر جس طرح کی کہانیاں بناتے آئے ہیں اُس لکیر سے وہ کبھی ہٹ نہیں سکتے۔ ولگریٹی (Vulgarity) کو یہ لوگ انٹرٹین منٹ ویلیوز (Entertainment Values) کہتے ہیں۔ راجا رانی اور اُن کے منتریوں کی سازش، نقلی لڑائی اور بوسے بازی ان کے اہم وسیلے ہیں میں نے ایسی سماجی کہانیاں لکھی ہیں جو پڑھا لکھا طبقہ بھی دیکھنا چاہتے ہیں لیکن اس فلم کو پیش کرتے ان لوگوں کو شک وشبہ ہوتا ہے کہ چلے یا نہ چلے''

خط ملنے کے کچھ عرصہ بعد جب جینندر نے یہ فلم دیکھی تو انہیں بھی مایوسی ہوئی ہے اور انہوں نے اس کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے پریم چند کو ایک خط بھی لکھا تھا جس کے جواب میں ۷ فروری ۱۹۳۵ کو پریم چند نے یوں لکھا۔

''مزدور تمہیں پسند نہیں آیا۔ یہ میں جانتا تھا میں اسے اپنا کہہ بھی سکتا ہوں اور نہیں بھی کہہ سکتا اس کے بعد ایک رومانس جا رہا ہے وہ بھی میرا نہیں ہے میں اس میں بہت تھوڑا سا ہوں ۔مزدور میں بھی اتنا تھوڑا سا ہوں کہ نہیں کے برابر۔ فلم کے ڈائرکٹر ہی سب کچھ ہیں لیکھک فلم کا بادشاہ کیوں نہ ہو یہاں ڈائرکٹر کی عملداری ہے وہ بڑے طمطراق سے کہتا ہے ''میں جانتا ہوں عوام کیا چاہتے ہیں اور ہم عوام کی اصلاح کرنے نہیں آئے ہیں ہم نے کاروبار کھولا ہے دولت کمانا ہمارا مقصد ہے جو چیز عوام مانگیں گے ہم دیں گے ۔

اس طرح کی بات انہوں نے ۱۲ نومبر ۱۹۳۴ء کو حسام الدین غوری کو بھی لکھی تھی کہ۔

''......سینما سے کسی اصلاح کی امید کرنا بے کار ہے یہ پیشہ بھی اسی طرح سرمایہ داروں کے ہاتھ میں ہے جیسے شراب فروشی ۔انہیں اس سے کوئی مطلب نہیں کہ اس کا عوام کے مذاق پر کیا اثر پڑتا ہے ---- یہاں انسان کے مقدس ترین جذبات کو ایکسپلائٹ کیا جاتا ہے ، برہنہ اور نیم برہنہ تصاویر ، قتل و خون ، جبر کی وارداتیں ، مار پیٹ ، غم و غصہ اور نفسیات ہی اس انڈسٹری کے اوزار ہیں اور اس سے وہ انسانیت کا خون کر رہے ہیں''

یہی بات انہوں نے ہندی کے معروف ادیب ڈاکٹر اندر ناتھ مدان کو بھی ایک خط میں تحریر کی تھی۔

''ایک ادیب کے لئے سینما موزوں جگہ نہیں میں اس لائن میں اس لئے آیا تھا کہ شاید مالی اعتبار سے کچھ مطمئن ہوسکوں مگر اب اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ میری خام خیالی تھی اس لئے اب میں پھر ادبی خدمت پر لگ رہا ہوں''

''غریب مزدور'' کے علاوہ انہوں نے اجنتا سینے ٹون کیلئے نوجیون نامی کہانی بھی لکھی تھی جو ۱۹۳۵ء میں ریلیز ہوئی اور اس کے اہم کردار تھے ۔نرگس، امینہ خاتون، گیانی ، بدھو ایڈوانی، ڈبلیو ایم خان اور منی بائی ۔مگر اس بھی اُن کی تسلی نہ ہوئی بلکہ وہ مزید دل برداشتہ ہو گئے ۔کیونکہ اس میں اُن کی کہانی کا پلاٹ یکسر بدل دیا گیا اب انہیں پوری طرح یقین ہو گیا تھا کہ فلمی دنیا میں ادیب کی کوئی اہمیت و وقعت نہیں ، سب کچھ پروڈیوسر اور ڈائرکٹر ہیں جن کا مقصد فلمیں بنا کر صرف روپیہ کمانا ہے۔

متذکرہ بالا فلموں کے علاوہ اُسی زمانے میں اُن کے ناول ''بازارِ حسن'' پر ''سیوا سدن'' نام سے فلم منظر عام پر آئی اس فلم کی کہانی وہ بمبئی آنے سے پیشتر ہی مہالکشمی سینے ٹون کے ہاتھ ڈیڑھ دو ہزار روپے معاوضہ میں فروخت کر چکے تھے اس فلم کی رسم مہورت کی تقریب اُس دور کی ممتاز ادیب شریمتی لیلاوتی منشی کی صدارت میں ہوئی تھی تب تک پریم چند فلمی دنیا کے طور طریقوں سے ناواقف تھے اور انہیں فلموں سے بڑی اُمیدیں تھیں لہذا انہوں نے بڑے پُر امید انداز میں کہا تھا کہ اگر اس ناول سے سماج کی کوئی بھلائی ہو سکے تو میں اپنے آپ کو کامران و کامیاب سمجھوں گا۔

اس فلم کی نمائش بھی ۱۹۳۴ء میں ہوئی تھی اور اس میں مشہور مغنیہ سبالکشمی کے علاوہ جدن بائی، زبیدہ، فاطمہ اور شاہو مودک نے کام کیا تھا یہ فلم دیکھ کر بھی انہیں بے حد مایوسی اور دکھ ہوا کیونکہ اس میں نہ ہدایت کاری میں جان تھی اور اداکاری میں اور کہانی میں بے جا تبدیلیاں کی گئی تھیں اس فلم کو دیکھ کر حسام الدین غوری کو بھی بڑی مایوسی ہوئی تھی جیسا کہ انہوں نے اپنی کتاب ''پریم سوگ'' میں لکھا ہے۔

> ''خیال تھا کہ یہ فلم تاریخ فلمسازی میں ایک نئے دور کا آغاز کرے گی لیکن فلم دیکھ کر ساری امیدوں پر پانی پھر گیا کیونکہ ڈائرکٹر کی ترمیم و تنسیخ کے باعث کہانی کی مٹی پلید ہو گئی ہے اور فلم میں وہ بات نہیں رہی تھی کہ جو افسانے میں پائی جاتی تھی۔''

اس فلم کے بارے میں جب اُن کے ایک ساتھ للت کمار نے اُن کی رائے پوچھی تو انہوں نے جواب دیا بھائی مجھ سے کتاب کا کاپی رائٹ مانگا گیا تھا سو میں نے اسے دے دیا اب اگر فلم والے اسے اچھی طرح کامیاب نہ بنا سکیں تو میرا کیا قصور؟

طوائف کی زندگی اور اُس کے سماجی مسائل سے متعلق اس کہانی کو اس طرح بنا کر پیش کیا گیا تھا کہ یہ ایک عمدہ فلم بننے کے بجائے ایک فارمولہ فلم بن کر رہ گئی تھی جس میں پریم چند کا آدرش اور سماجی بہتری و اصلاح کا مقصد فوت ہو کر رہ گیا تھا یہاں تک کے خود پریم چند اس فلم کو دیکھ کر تذبذب میں پڑھ گئے کہ آیا اس کہانی کے مصنف وہ ہیں یا کوئی اور۔

ان فلموں سے پریم چند کا وقار اور آدرش اتنا مجروح ہوا کہ عالم مایوسی میں انہوں

نے واپس بنارس جانے کا فیصلہ کرلیا حالانکہ ان سے کئی فلمساز کہانیاں لینے کو تیار تھے جن میں " لائٹ آف ایشیاء" اور "کرما" ایسی مشہور اور یادگار فلموں کے خالق اور بمبئی ٹاکیز کے مالک ہما نسوائے بھی تھے جو چاہتے تھے کہ پریم چند اُن کے فلمی ادارے وابستہ ہو جائیں اور اُن کے لئے کچھ کہانیاں تخلیق کریں اس سلسلے میں اُن دونوں کی ملاقات بھی ہوئی مگر پریم چند فلمی دنیا سے اتنے مایوس اور دل برداشتہ ہو چکے تھے کہ بمبئی کی خراب آب و ہوا کا بہانہ کر کے انہوں نے معذرت کر لی اس پر ہمانسوائے نے انہیں بنارس سے کہانیاں لکھ کر بھیجنے کی فرمائش کی مگر اس پر بھی وہ رضامند نہ ہوئے اور اجنتا سینے ٹون سے علیحدگی کے بعد وہ ۲۵ مارچ ۱۹۳۵ کو واپس بنارس آ گئے اور پھر زندگی کے بقیہ عرصہ میں انہوں نے فلمی دنیا سے کوئی واسطہ نہ رکھا۔

پریم چند کی وفات، کے ڈیڑھ دو برس بعد ۱۹۳۸ میں "بازارِ حسن" پر مدارس کی چندر بھا سینے ٹون نے تمل زبان میں فلم بنائی جو اُن کی کہانی پر مبنی پہلی علاقائی فلم تھی اس کے بعد ۱۹۷۸ میں اُن کی مشہور زمانہ کہانی "کفن" پر شہرت یافتہ ہدایت کار کار مرنال سین نے تلگو میں "آ گا ہوری" کا تھا (ایک گاؤں کی کہانی) کے عنوان سے فلم بنائی جو اُن کے اقتدار کی حامل تھی اور جسے کئی فلموں میلوں میں پیش کیا گیا اور حکومت ہند نے بھی اسے اعزاز سے نوازا۔

۱۹۴۱ء میں بمبئی کی سرکو فلم کمپنی نے اُن کی مشہور کہانی "عورت کی فطرت" جس کا ہندی عنوان "تریا چرتر" ہے "سوامی" کے نام سے فلمائی گئی۔ گو اس فلم کے اہم اداکار تھے ستارہ ، جے راج یعقوب، ایس نذیر اور بدری پرساد۔

اس کے پانچ برس بعد ۱۹۴۶ء میں موہن بھونانی کی ہدایت میں پریم چند کے مشہور ناول "چوگان" ہستی کو "رنگ بھومی" کے نام سے پردہء اسکرین کی زینت بنایا گیا جس کے اہم کردار جگدیش سیٹھی کے این سنگھ نوین یاگنک ، سلوچینا، لیلا مصرا اور گوپ تھے۔ طبقاتی کشمکش پر مبنی پریم چند کے اس ضخیم ترین ناول کو پردہ سکرین پر پیش کرنا انتہائی دشوار کام تھا کیونکہ اس کے پلاٹ کا کینوس اتنا بڑا تھا کہ اُسے تین گھنٹے میں سمیٹنا انتہائی مشکل کام تھا تاہم ہدایت کار نے اسے متاثر انداز سے پیش کرنے کی کوشش کی اگر اسے تھیٹریکل انداز سے پیش نہ کیا جاتا تو یہ فلم مزید تاثراتی بن سکتی تھی اس فلم میں اندھے سورداس کے رول میں جگدیش سیٹھی نے اپنی فطری اداکاری سے ناظرین کو بے حد متاثر کیا اور ایک نابینا آدمی کے دل میں اُٹھنے والے

جذبات واحساس کو بڑے موثر انداز سے پیش کیا۔

اس کے بعد ایک عرصے تک پریم چند کے کسی ناول یا کہانی کو فلم کے لئے منتخب نہیں کیا گیا پھر ۱۹۵۸ء میں تصویرستان نے منوج کمار، کلدیپ کور، راج کمار، شیاما، جبین، لیلا مصرا، ڈیزی ایرانی، اورنذیرحسین ایسے اداکاروں کو لے کر اُن کی کہانی پنچ پرمیشور کو'' پنچائیت '' کے نام سے فلمایا مگر اس سے بھی عوام کو بڑی مایوسی ہوئی کیونکہ ہدایت کار لیکھ راج بھاکری نے اسے ایک معمولی درجے کی عامیانہ فلم بنا کر رکھ دیا تھا۔

تب ایسا محسوس ہوتا تھا کہ پریم کے ذہن وشعور اور جذبات وخیالات کو صحیح معنوں میں سمجھنے والا اس فلمی دنیا میں کوئی ہے ہی نہیں تب ۱۹۵۹ میں کرشن چوپڑہ نے اُن کی کہانی '' دو بیلوں کی جوڑی'' کو ہیرا موتی'' کے نام سے پردہ ءسکرین پر پیش کر کے سینما بینوں کو چونکا دیا انہوں نے اس فلم کو پیش کر کے صرف اپنی فنکارانہ صلاحیت و ذہانت کا ہی ثبوت نہیں دیا بلکہ پہلی بار اُن کی کہانی کی اصلی روح کو بڑے موثر اندا میں پیش کیا انہوں نے فلم میں بیلوں سے بھی اتنی عمدگی سے کام لیا کہ اُن کی ہدایت کارانہ صلاحیت کا ہر آدمی معترف ہو گیا نیز بیلوں کی اداکاری کا بھی لوہا ماننا پڑا جنہوں نے بے زبان جانور ہوتے ہوئے بھی آزادی کے لئے ظلم ستم کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔انسان اور بے زبان جانوروں کے باہمی رشتے کی دل پذیر عکاسی کرنے والی یہ فلم دراصل ایک بھر پور طنز ہے اُن انسانوں پر جو زبان رکھتے ہوئے بھی اپنے حقوق اور آزادی کے لئے نبرد آزما نہیں ہوتے بلکہ موقع پڑنے پر گونگے جانوروں کی طرح کانجی ہاؤس میں پڑے رہتے ہیں جبکہ جانور بے زبان ہوتے ہوئے بھی آزادی کے لئے ظلم د تشدّد کا مقابلہ کرتے ہیں اس فلم کے اہم اداکار بلراج ساہنی، نروپارائے اور شوبھا کھوٹے تھے اوران کی اداکاری بھی متاثر کن تھی اس فلم کی پیش کش سے کرشن چوپڑا نے ثابت کر دیا کہ وہی پریم چند کے ناولوں اور کہانیوں کی روح کی گہرائیوں تک پہنچے ہیں ان کی اس فلم کو سبھی نے پسند کیا اورانہیں متعدد انعامات اوراعزازات سے بھی نوازا گیا۔

اس فلم کی کامیابی کے بعد کرشن چوپڑا نے پریم چند کے ناول ''غبن'' پر ایک فلم بنانے کے پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی مگر افسوس کہ اس فلم کی تکمیل سے پیشتر ہی وہ راہی عدم ہوئے اور فلم کا بقیہ حصہ نامور ہدائیت کار شی کیش مکر جی نے مکمل کیا اور اپنی ذہانت د

ظانت سے کہانی کو تاثراتی اور حقیقی روپ میں پیش کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ناول کے کچھ واقعات کو حذف کرنے کے باوجود کسی اہم حصہ کو نظر انداز نہیں کیا گیا۔

اور نہ ہی کسی کردار کے ساتھ ناانصافی کی گئی۔یہ الگ بات ہے کہ کسی کردار کو ناول کے مقابلے میں کم اہمیت دی گئی ہو۔مکالمے سادہ اور سہل زبان میں ہونے کے ساتھ ساتھ بامعنی اور تاثراتی تھے۔سنیل دت، سادھنا، کنہیا لال، زیب رحمان، آغا، انور حسین، بدری پرشاد، پریتما دیوی، اور کمل کپور اس کے اہم اداکار تھے۔

۱۹۶۰ میں چلڈرن فلم سوسائٹی نے پریم چند کی کہنای عید پر مبنی فلم ''عید مبارک'' بنائی جس میں ایک کمسن بچے کا اپنی دادی کے ساتھ والہانہ پیار دکھایا گیا تھا عید کے میلے میں جب سبھی بچے مٹھائیاں خریدنے میں منہمک تھے یہ ننھا بچہ مٹھائی یا کھلونا خریدنے کی بجائے اپنی بوڑھی دادی کے لئے چمٹا خریدتا ہے تاکہ کھانا بناتے وقت اس کا ہاتھ نہ جلے اس کے بعد ۱۹۶۳ء میں اسی ادارے نے ایک کتے کی کہانی '' پیش کی جو اُن کی کہانی ''موتی'' پر مبنی تھی اس فلم میں کتے کی اداکاری سے بچے بڑے محفوظ ہوئے۔

۱۹۶۳ میں ہدایت کار ترلوک جیتلی نے پریم چند کے معروف ناول گئودان کو پردہ اسکرین پر پیش کیا مگر اس کے کرداروں اور واقعات کو پیش کرنے کے اُن کے انداز سے فلم بے جان اور غیر تاثراتی بن کر رہ گئی تاہم ہوری کے رول میں راج کمار اور دھنیا کے رول میں کامنی کوشل نے اپنی عمدہ اداکاری سے عوام کو متاثر کیا۔علاوہ ازیں مشہور موسیقار پنڈت روی شنکر نے فلم کے گیتوں کے ذریعے لوک سنگیت کو بڑے دل کش انداز میں پیش کیا تھا۔

۱۹۷۸ء میں شہرہ آفاق ہدایت کار ستیہ جیت رے نے واجد علی شاہ اور اُن کے زوال کے دلپذیر عہد اور معاشرے سے متعلق پریم چند کی مشہور کہانی ''شطرنج کے کھلاڑی'' پیش کی مگر افسوس ستیہ جیت رے سے وابستہ ہماری توقعات پوری نہ ہو سکیں۔اس کا ایک کارن یہ تھا کہ اودھ کے کلچر سے پوری طرح واقف نہ ہونے کے کارن فلم میں وہ تاثر پیدا نہ کر سکے جو انہوں نے اپنی بنگلہ فلموں ''اُپرسنسار'' اور پاتھر پانچالی میں پیدا کیا فلم میں سعید جعفری نے اپنی اداکارانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے ناظرین کو بڑا متاثر کیا حالانکہ اُن کے علاوہ اس فلم میں شبانہ اعظمی اور امجد خان ایسے منجے ہوئے اداکاروں نے بھی کام کیا تھا۔

آج پریم چند کا انتقال ہوئے زائد از نصف صدی گزر چکی ہے لیکن ہماری فلم
انڈسٹری کی حالت میں کوئی زیادہ تبدیلی رونما ہوئی ۔اور آج بھی عام فلمساز اسی طرح سوچتا
ہے جسے اُس دور میں سوچتا تھا اس سلسلے میں پریم چند کے مضمون کا درج ذیل اقتباس ہماری
فلمی صنعت کی صحیح تصویر پیش کرتا ہے۔

''ڈائرکٹر جانتا ہے کہ سینما کے لئے جو فنی صلاحیت درکار ہے وہ ادیبوں میں مشکل سے ملے گی اس وہ ادیبوں سے اُتنا ہی کام لیتا ہے جتنا وہ بنا کسی نقصان کے لے سکتا ہے امریکہ اور دوسرے ممالک میں بھی ادب اور سینما میں ہم آہنگی نہ ہو سکی اور نہ شاید ہو سکتی ہے ادب رجحان کی رہنمائی کرتا ہے پیروی نہیں سینما عوامی رجحان کے پیچھے چلتا ہے عوام جو مانگیں گے وہی دیتا ہے ادب ہمارے لطیف جذبات کو چھو کر ہمیں محفوظ کرتا ہے ابھی وہ زمانہ دور ہے جب سینما اور ادب کا ایک روپ ہو گا اور جب ادبی ذوق اتنا بلند ہو جائے گا کہ وہ تنزل کے جانب مائل کرنے والی چیزوں سے نفرت کرے گا تب ہی سینما میں ادبی ذوق کا ظہور ہوگا''۔

ادب اور صحیح ادب

دیویندر اِسر

''کسی بھی تخلیقی فن پارے میں کئی آوازیں ہوتی ہیں ۔قاری قرأت کے عمل میں مخصوص حالات کے مطابق اُن آوازوں میں انتخاب کرتا ہے مکالمے کی یہ کیفیت الفاظ کے ساتھ ہر انسانی تخلیقی عمل میں جاری رہتی ہے ۔ادب میں مکالمے کے کیفت اس کے بنیادی عوامل میں شامل رہتی ہے۔

''مکالمے کی کیفیت ختم نہیں ہوتی۔۔۔بغیر کسی مکالمے کے کوئی کہانی کہانی نہیں رہتی چاہے وہ مکالمہ خود کا خود اپنے سے ہی کیوں نہ ہو۔ مکالمے کی نوعیت ضرور بدل سکتی ہے۔لیکن مکالمے کی عدم موجودگی۔۔۔یہ ممکن نہیں''

نرمل ورما

ہم بڑے عجیب وغریب دور سے گزر رہے ہیں جب ادب میں مکالمے کو ختم کرنے کی مسلسل کوششیں کی جارہی ہیں ادبی تخلیقات کو دو مخالف خانوں میں ادب اور صحیح ادب میں منقسم کرنے کی کوشش درحقیقت مکالمے کو ختم کرنے کی ہی ایک کوشش ہے ۔ادب کی فیصلہ کون طور پر تعریف ،تشریح یا تحدید کا تعین ممکن نہیں ۔لیکن صحیح ادب کے بارے میں ایسی کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔بس 'صحیح' کی نشاندہی کر کے اس کی فہرست جاری کرنا ناکافی ہے جو ادبی تخلیقات اس فہرست کے نظریاتی دائرے سے باہر ہیں انہیں ادب سے بھی خارج کر دینے کی تلقین کی جاتی ہے مابعد جدیدیت کے پرچم تلے سماجی سروکاروں کی بحالی کا جشن جوش و خروش سے منانے کے باوجود اردو ادب میں یہ نئی مہم (ا) زیادہ کامیاب ہوتی نظر نہیں آتی جیسا

کہ کئی دوسری زبانوں میں دکھائی دیتا ہے۔ترقی پسند ادب کے دور کے بعد اب ایک بار
پھراسی نوعیت کی طرزفکرکوفوکس میں لانے کی مہم شروع ہو چکی ہے لہٰذااس مسئلے پرازسرنوغور
کرنے کی ضرورت ہے۔
کبھی ریاست اور سیاست کے نام پر، کبھی مذہب اور معاشرے کے نام پر، کبھی
نظریے، کمٹمنٹ اور سماجی سروکاروں کے نام پر، کبھی طبقاتی جدوجہد اور کلچرل قوم پرستی کے نام
پر اور کبھی رنگ، نسل اور جنس کے تفریقات کے نام پر۔ صحیح ادب کے اعلان نامے وقتاً فوقتاً
جاری ہوتے رہتے ہیں۔اور اب تو نئی ادبی فکر کے پیروکار یہ بھی کہنے لگے ہیں کہ Text
are Interrogated۔یعنی اب ادبی تخلیقات کی اس طرح تفتیش کی جاتی ہے کہ جس
طرح کے حوالات میں مشتبہ لوگوں سے پوچھ تاچھ کرتی ہے تاکہ یہ ثابت کیا جا سکے کہ سطح پر
معصوم سے دکھائی دینے والے متن کے پیچھے کتنے مجرم ذیلی متن میں چھپے ہیں۔ پرانے
مسیحاؤں کے الفاظ کو ہی کیوں نہ دہرایا جائے 'نیا جال لائے ہیں پرانی شکاری۔
ادب کو ہمیشہ سے ہی کسی نہ کسی باعث شک وشبہ کی نظر سے دیکھا جاتا رہا ہے۔کبھی
معاشرے میں ادب کی اہمیت، مناسبت، افادیت کا سوال اُٹھایا جاتا رہا ہے اور کبھی ادیب کی
نظریاتی وابستگی کا۔ کتابوں پر پابندی بھی عائد کی جاتی رہی ہے اور انہیں نذرآتش بھی کیا جاتا
رہا ہے لیکن آج ادب کو ایسے حالات سے بنرآزما ہونا پڑ رہا ہے کہ نہ صرف کسی ایک نوعیت
کے متن کو ہی صحیح ادب کا درجہ دیا جا رہا ہے اور دوسرے متون کو ملزم قرار دیا جا رہا ہے بلکہ حکم
نامے بھی جاری کیے جار ہے ہیں کہ کیا اور کیسے لکھا جائے اور کیا اور کیسے نہ لکھا یا پڑھا جائے
انہیں حالات کے پیش نظر نارمن میلر نے کہا تھا کہ ہم تہذیب کے اس مقام سے گزر چکے ہیں
جب کسی چیز کو فن پارہ کہا جا سکتا ہے سوال یہ ہے کہ کیا ادب کی خودمختاری اور صحیح ادب کی سماجی
وابستگی کے مابین کوئی مکالمہ ممکن نہیں؟ کیا ان دو قطبین کے بیچ کوئی پل استوار نہیں کیا جا سکتا؟
اس نزاعی صورت حال کے پس پردہ جو فکر کارفرما ہے اس کے کئی اسباب ہیں ان
میں سے زیادہ تر کا تعلق، نئی (ادبی) تھیوری ''مزاحمت کی مہم سازی، اور پولیٹیکل کرکٹ لٹریچر
سے ہے۔

ا۔ صدیوں سے ادب کے لکھے جانے اور اس کے پڑھے جانے کے باوجود یہ مسئلہ

تسلی بخش طور پر حل نہیں ہو سکا کہ ادب کیا ہے کیا ادب کی کوئی زمان و مکاں سے مبرا آفاقی اور ابدی تعریف کی جاسکتی ہے اگر ایسا ہو بھی جائے یا کر لیا جائے تو اسے قبول عامہ حاصل ہو گا اور کیا دنیا کے ہر ادب پر ہر ملک میں اس کا اطلاق کیا جاسکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ نہ ہی یہ ممکن ہے اور نہ ہی مرغوب۔

۲۔ ہم صرف صحیح ادب کی ہی بات کر سکتے ہیں جسے صحت مند ادب بھی کہا جاسکتا ہے صحیح اور صحت مندی کی نشاندہی اور وضاحت کی جاسکتی ہے ادب کی ادبیت مفروضہ اور موہوم ہی رہے گی۔

۳۔ خالص ادب نام کی کوئی شے نہیں ہوتی۔ وہ دوسرے متون کی طرح ہی ایک متن محض ہے چاہے ہو واتیسائن کا کام سوتر ہو یا مارکس کا کیپیٹل یا کالی داس کا کمار سنبھو یا کوئی کومکس سب متن ہیں اور سب مساوی ہیں کسی متن کو کسی دوسرے متن پر فوقیت حاصل نہیں۔

۴۔ کوئی بھی متن طبع زاد یا اولین نہیں اور نہ ہی اپنی ازلی شکل میں موجود رہ سکتا ہے۔

۵۔ ادب کے کوئی مخصوص بنیادی عناصر نہیں ہوتے ہر متن بین العلومی اور بین المتونی ہے۔

۶۔ جنہیں ادب کے بنیادی عناصر کہا جاتا ہے وہ اشرافیہ، اعلیٰ ذات اور مرد غالب معاشرے کے متعین کیے ہوئے ہیں جنہیں اقتدار کے حصول اور اس کے استحکام کے لیے، خالص ادبی اقدار کا نام دیا گیا ہے

۷۔ ادب کا کوئی بلا شرکت غیرے واحد شاستر یا اس کی کوئی آفاقی شعریات نہیں' ادب تفرقات اور اختلافات پر ہی مبنی ہوتا ہے' جسے شعریات، جمالیات یا کے نن یا سوندریہ شاستر کہا جاتا ہے وہ حصول اقتدار اور ثقافتی غلبے کا اشرافیائی نظریہ تنقید ہے۔

۸۔ اب صدیوں سے دبے، پسماندہ دولت اور جبر کے شکار لوگ (جس میں عورتیں بھی شامل ہیں) اپنا نیا نظریہ تنقید مرتب کر رہے ہیں جو نئی شعری شعریات کا پیش خیمہ ثابت ہو گا۔ جو ادب یا نظریہ تنقید قدیم کلاسیکی کے نن کی تقلید کرتا ہے اب موجودہ دور میں وہ بے معنی ہی نہیں بلکہ معاشرے کے لئے مضر بھی ہے اور اشرافیائی اقتدار کا حربہ بھی ہے۔

۹۔ صحیح ادب وہی ہے جو پسماندہ اور دبے ہوئے لوگوں کے لیے مفید ہے ان میں اور ان کے بارے میں صحت مند نظریے کی اشاعت کرتا ہے۔

۱۰۔ یعنی اب نہ کوئی مہابیانہ ہے اور نہ ہی کوئی میٹا تھیوری ہے۔

۱۱۔ ادبی تخلیق کی قدر و قیمت اس کی ہم عصر ضرورتوں اور اس کے استعمال اور اس کے سماجی شعور کے حوالے کے تحت ہی متعین کی جاسکتی ہے۔

۱۲۔ جو ادبی تخلیقات اس اجتماعی شعور کے دائرے میں شامل نہیں یعنی سیاسی طور پر صحیح نہیں، وہ صحیح ادب نہیں۔

۱۳۔ ہر متن بنیادی طور پر سیاسی متن ہے (پرسنل از پولیٹیکل)

۱۴ ہر متن میں کئی پوشیدہ، دبے ہوئے ذیلی متون ہوتے ہیں صحیح ادب کا فیصلہ ان پوشیدہ دبے ہوئے متون کی شاخت شکنی کے ذریعہ ہی کیا جاسکتا ہے۔

۱۵۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ کوئی ادبی متن نہیں ہوتا سب متون بنیادی طور پر کلچرل اور سیاسی نوعیت کے حامل ہوتے ہیں یعنی ادبی متن کی قرأت کلچرل ٹیکسٹ کے طور پر ہی ہوگئی اس فکر کی اشاعت میں کلچرل اسٹڈیز نے اہم رول ادا کیا ہے۔

۱۶۔ ہر معاشرہ دو مخالف گروہوں ہم اور وہ میں منقسم ہوتا ہے اور ان میں مکالمہ نہیں مناقشہ ہی ممکن ہے کیوں خہ ان میں ہم (مغلوب) اور وہ (غالب کے مابین اقتدار کی جنگ جاری ہے لہذا اب مسئلہ محض یہ رہ جاتا ہے کہ کون سی تخلیق صحیح ہے اور کون سی غیر صحیح۔

صحیح ادب کا نظریہ نیا نہیں اسے مثبت اور صحت مند ادب بھی کہا جاتا رہا ہے اس کی رو سے جو ادب افادیت کا حامل نہیں وہ انحطاط پرست اور مریضانہ رجحانات کا حامل ہے ادب کو وقتاً فوقتاً صحیح پرستوں کے طنز و دشنام کا نشانہ بننا پڑتا ہے دورِ ظلمت کے استحصال سے شروع ہو کر اشتمالی، فسطائی اور میکارتھی دور سے ہوتا ہوا کتابوں پر احتساب کا یہ سلسلہ آج تک مذہبی اعتقادات اور سیاسی نظریات کے تحت جاری ہے لیکن شبہات اور سنسر شپ کے باوجود ادب کی تخلیق جاری رہی ہے جب اقتدار کے ذریعے کتابوں پر پابندی عائد کرنا ممکن نہیں ہوتا تو اجتماعی گروہوں کے ذریعے اس کے خلاف مہم جاری کی جاتی ہے۔ پروپیگنڈہ کے تمام تر

طریقہ کار عمل میں لائے جاتے ہیں ڈی بیٹ اور ڈسکورس کا مقام ڈی ناؤننگ اور ڈی بکنگ لے لیتی ہے اور انجام کار مکالمہ ختم ہو جاتا ہے۔

پولٹریچر کی جو روترقی پسند دور میں شروع ہوئی تھی وہ ساٹھ کے دہے میں لبریشن تحریکوں کے متوازی کلچر کی شکل میں رونما ہوئی اور اب مابعد جدیدیت کے دور میں یہ سیاسی طور صحیح (Politically Correct) نظریہ نئے ادبی ڈسکورس کا مرکزی مسئلہ بن گیا ہے اس نئے ڈسکورس کے مطابق ادب، رنگ نسل، جاتی اور جنس کی سیاست کے گرد گردش کرتا ہے ۔لہذا ادب کی پرکھ بھی اس نئے ڈسکورس کے پیرا میٹرز میں ہوگئی۔ ادب میں اقتدار کے دباؤ اور زبان کے جھکاؤ میں پوشیدہ جبر کا پردہ فاش کرنا لازمی ہے اس نئے ڈسکورس کی نظریاتی اساس کو، کے نن، کے زوال کلاسیکی شعریات کی گم شدگی، کلچرل مطالعات، نوتاریخیت، کلچرل مادیت، نشانیات، اور ساخت شکنی اور نئی تنقیدی تھیوری میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔

اب دیکھا یہ جاتا ہے کہ تخلیق کا کون سا تجزیہ اور ذیلی متون کی تلاش سیاسی طور پر صحیح ہے ۔اگر چہ ساخت شکن نظریہ اپنے آغاز میں غیر سیاسی عمل میں اور نئی تنقید کے قریب سمجھا جاتا ہے لیکن بعد میں یہ صحیح ادب کے تجزیے کا سب سے زیادہ کارآمد حربہ بن گیا ہے اب یہ زبان اور ادبی ساخت سے لے کر معاشرے کی تنظیم اور اقتدار کے مراکز تک سب کے لئے مستعمل ہے نظریاتی قطعیت چاہے وہ کسی طبقے ذات پات، فرقے، قوم، مذہب، نسل یا جنس کی بنیاد پر ہو یا مختلف اعتقادات پر مبنی انجام کار معاشرے اور نوع انسانی کو دو یا زائد مخالف گروہوں میں تقسیم کر دیتی ہے جو جدوجہد، جبر استحصال اور آمریت پرستانہ رجحانات اور کٹر پرستی کے خلاف جاری رہتی ہے وہ بار ہا باہمی پیکار اور تشدد میں بدل جاتی ہے اور اکثر یہ تشدد آمیز رویہ اپنے ہی گروہ کے دوسرے کمزور افراد کے خلاف معاندانہ کاروائی کا سبب بن جاتا ہے۔ ییٹس کی ایک نظم کا اقتباس:

''مرحبا انقلاب، گولہ باری اور تیزی سے شروع ہو جاتی ہے۔ گھڑ سوار گداگر پیدل گداگروں پر کوڑے برساتے ہیں۔

مرحبا انقلاب اور گولہ باری پھر شروع ہو جاتی ہے۔

گداگروں کا مقام بدل جاتا ہے۔ لیکن کوڑوں کی مار جاری رہتی ہے''

آخر اس نئے صحیح ادب کے بنیادی نکتے کیا ہیں؟

۱۔ جیسا کہ سیاسات میں ہوتا ہے۔ صحیح ادب بھی حلقہ انتخاب کے ماڈل پر مبنی ہے۔ یعنی مخصوص گروہوں کی شناخت پر اور ان کے بارے میں ان کے گروہی نقطہ نظر سے لکھنا۔

۲۔ صحیح ادب ان تنظیموں اور تحریکوں کی حمایت کرتا ہے جو اس کی نظر میں ان حلقوں یا گروہوں کی نمائندگی کرتی ہیں۔

۳۔ صحیح ادب ان تمام بے آواز اور پسماندہ لوگوں اور گروہوں کو جنہیں صدیوں سے جبر و تشدد کا شکار بنایا گیا ہے اور مہذب سماج کے دائرے سے باہر حاشیے پر دھکیل دیا گیا ہے۔ دائرہ اقتدار میں لانے کا پرچار کرتا ہے۔

۴۔ وہ ان کے شعور اور ان کی شناخت کو بحال کرتا ہے۔

۵۔ اب کا موزوں موضوع نہ صرف ان مخصوص گروہوں کے مسائل کی ترجمانی کرنا ہے بلکہ ان کو صحیح نقطہ نظر سے پیش کرنا بھی ہے موزوں موضوعات اور صحیح نقطہ نظر کا فیصلہ اور حکم نامہ ان گروہوں کے مسیحا ہی جاری کر سکتے ہیں۔

۶۔ کوئی متن اور فلسفہ ادب (جس میں شعریات بھی شامل ہے) نظریہ سے آزاد نہیں ہوتا چاہے اسے کتنا ہی داخلی کیوں نہ کہا جائے۔ لہذا سوال صحیح نظریے کا ہے۔

۷۔ ادب کا سروکاران سماجی مسائل کے علاوہ تاریخ کو بھی دُرست کرنا ہے۔

۸۔ ادب ایک سماجی ادارہ ہے اور اقتدار کے مراکز کو بدلنے کا ذریعہ بھی ادب کی کوئی خودمختار سلطنت نہیں ۔

ادب سے صحیح ادب کی جانب بدلتے منظر نامہ کو **Paradigm Shift** کہا گیا ہے اگر ان تمام صحیح ادبوں کو کسی ایک رویے کے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے تو وہ ہے مزاحمتی ادب جو اب سیاسی جبر اور آمریت کے خلاف جہد و جہد تک ہی محدود نہیں بلکہ، زندگی اور فکر کے ہر شعبے کو اپنے دائرہ عمل میں لے چکا ہے صحیح ادب کا سروکار قارئین کے داخلی ردعمل سے زیادہ اجتماعی شعور کو متحرک کرنا اور اسے کوڈی فائیڈ گروہی نشانیاتی نظام میں پیش کرنا ہے۔

مشہور کنٹرڈرامہ نگار مہیش الکنچوار نے اس ضمن میں کہا ہے:

''میں جس معاشرے میں رہتا ہوں اس سے اپنے رشتوں کے بارے میں اپنے آپ کو میں نے سمجھنے کی کوشش کی ہے میرے رفقا اس سماج کو بدلنا چاہتے تھے اس اُمید کے ساتھ کے اسے بہتر بنایا جا سکے لیکن سوال یہ ہے کہ کوئی ایک رویہ یا کوئی سرد کار ہی دوسرے رویوں اور سرد کاروں سے کیوں زیادہ صحیح سچا اور اقتدار پر مبنی سمجھا جاتا ہے یہ میری سمجھ سے اس وقت بھی باہر تھا اور اب بھی باہر ہے ادب الگ الگ لوگوں کے لئے الگ الگ معنی رکھتا ہے اس کے رویے اتنے ہی مختلف ہیں جتنا کہ لوگوں کے نقطہ ہائے نظر ادبی تخلیقات کی یہ رنگا رنگی ہی الگ الگ پسند کے قارئین کی امیدوں کو پورا کر سکتی ہے''

اکثر ہم یہ بات فراموش کر دیتے ہیں کہ تبدیلی کا عمل مختلف ادبی تخلیقات میں ہمیشہ حرکت پذیر رہتا ہے اس تغیر کے عمل کو کسی ایک نظریاتی نظام میں بند کر کے سمجھنا مشکل ہے ایسی کوششیں تنوع اور تکثیریت کو ختم کر کے ایک جامع مضبط اوت منظم وحدت میں بدل دینا چاہتی ہے ادب ایک جدلیاتی عمل ہے آویزش اور آمیزش کا مسلسل سلسلہ جو کبھی ختم نہیں ہوتا ادب مکالمہ کی ایسی صورت حال ہے جو تضادات کے مابین پیدا ہوتی ہے بغیر کسی مکالمے کے ادب ادب نہیں رہتا نظریاتی ادب مکالمے کی بجائے یک خیالی اور اعتقاد رکھتا ہے اور ستم ظریفی یہ کہ نعرہ بکثریت کا بلند کیا جاتا ہے متن میں جو خالیا سپیس رہ جاتی ہیں قاری قرآت کے عمل میں ان میں داخل ہوتا ہے اور اُن کے اندر سے نئے تجربات کو محسوس کرتا ہے اور ساتھ ہی اسے باہر سے دیکھتا ہے اور سمجھتا ہے سیاست ان خالی اسپیسز سے ادب کو بے دخل کر کے اپنا اقتدار قائم کرنا چاہتی ہے اور یہی صحیح ادب کرتا ہے۔ انجام کار ادب سیاست کی نو آبادی بن جاتا ہے۔

میں اس مضمون میں اس مسئلے پر بحث نہیں کرنا چاہتا کہ صحیح کتنا صحیح ہے کیوں کہ یہ موضوع سماجیات اور سیاست کا ہے اور اس بہت کچھ دارومدار ادیب کی آئیڈیالوجی پر ہے اس کے اعتقادات اور وابستگی پر ہے لیکن اتنا کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ مابعد جدیدیت جب یہ کہتی ہے کہ کوئی ادب بغیر آئیڈیالوجی کے ممکن نہیں تو وہ مارکسی زاویہ فکر کی ہی ترجمانی کرتی ہے لیکن

اپنے کو مارکسی مکتبہ فکر سے ظاہر کرنے کے لیے وہ یہ بھی ساتھ جوڑ دیتی ہے کہ وہ کسی جامد اور منضبط آئیڈیالوجی کے خلاف ہے آئیڈیالوجی ہمیشہ منضبط اور منظم نظام فکر کی غماز ہوتی ہے اگر اپنے آغاز میں وہ تغیر کا پیغام لے کر آتی بھی ہے تو انجام کار وہ اتنی جامد ہو جاتی ہے کہ اپنے اندر کسی تغیر کو قبول نہیں کرتی دوسرُے یہ کہ ادیب کے خیالات کو آئیڈیالوجی سے خلط ملط کرنا صحیح نہیں ایک بات اور بھی واضح کر دینا ضروری ہے کہ بالعموم آئیڈیالوجی سے مراد مارکسی مکتبہ فکر ہی لی جاتی ہے کوئی آئیڈیالوجی مارکیست کے خلاف بھی ہوسکتی ہے مذہبی بنیاد پرستی بھی آئیڈیالوجی ہے اور مختلف مذاہب کے پیروکار اسی باعث برسر پیکار رہتے ہیں اس مضمون میں میرے سامنے جو سوالات ہیں وہ یہ ہیں:

۱۔ کیا ادبی تخلیق کی پرکھ محض اس کے صحیح ہونے کے پیمانے پر ہی منحصر ہے۔

۲۔ کیا صرف ایک مخصوص فکر ہی صحیح ہوتی ہے؟ یا کسی معاشرے میں مختلف النوع فکریات کی ہم موجودگی ہوتی ہے؟ پہلی صورت میں کلی صداقت کو تسلیم کیا جاتا ہے جب کے دوسری صورت میں مختلف فکریات میں جزوی صداقت کی بھی قدر کی جاتی ہے پہلی صورت میں مکالمے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی دوسری صورت میں باہمی مکالمہ مسلسل جاری رہتا ہے۔

۳۔ اگر صحیح ادب بھی ہے تو اسے ادب کیوں کر کہا جاتا ہے یعنی ہم اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ اس میں ادبی اقدار اور ادبیت جیسی خصوصیات موجود ہیں۔

۴۔ اگر یہ کہا جاتا ہے کہ یہ عناصر نئی دلت یا تانیثی شعریات کے ہیں تو دو صحیح ادبی تخلیقات میں صحیح پن کی فکر اور مساوی مقدار ہونے پر ایک صحیح ادبی تخلیق کو دوسری صحیح ادبی تخلیق کے مقابلے میں اس نئی شعریات کے تحت اعلی قرار دینے کا کیا معیار ہے؟

سوال ادبی تخلیق میں سیاسی یا سماجی مواد یا عناصر کے شامل ہونے یا نہ ہونے کا نہیں ادب میں کوئی موضوع یا مواد یا فکر اور نظریہ ممنوع نہیں ۔سوال ادبی پرکھ کے پیمانے کا ہے۔ محض سیاسی یا سماجی طور صحیح ہونے سے ہی کوئی تخلیق اہم ،اعلی یا معیاری نہیں ہو جاتی جس موضوع یا مواد یا فکر اور نظریے کو ہم صحیح اور صحت مند یا ٹھوس حقیقت پر مبنی کہہ کر ادب کے

ذریعے عوام تک پہنچانا چاہتے ہیں اسے ہم بہت ہی سہل سیدھے اور واضح طور پر پراثر طریقے سے اداریوں اور مقالات کے ذریعہ عام لوگوں تک لے جاسکتے ہیں اخباروں کے ذریعے ان کی اشاعت کرسکتے ہیں اور ادب کے قارئین سے ہزاروں گنا زیادہ قارئین تک پہنچا سکتے ہیں ویسے بھی جو لوگ ادب پڑھتے ہیں وہ اخبار بھی ضرور پڑھتے ہوں گے حقیقت تو یہ ہے کہ صحیح ادب کے قارئین اکثر وہی لوگ ہوتے ہیں جو پہلے سے ہی اس طرح کی سوچ پر ایمان لاچکے ہیں سچ تو یہ ہے کہ پڑھنے لکھنے والے لوگ پہلے ہی ان مسائل اور طرز فکر سے بخوبی واقف ہوتے ہیں مسئلہ صرف یہ رہ جاتا ہے کہ ان تمام معاملات کو کس طرح پیش کیا جائے ان کی عکاسی انہیں ادب کے دائرے میں لے آئے۔ گبریل گارسیا مارکیز نے کہا ہے:

''میری خواہش ہے کہ دنیا میں اشتراکی نظام ہو اور مجھے یقین ہے کہ ایک دن ایسا ہی ہوگا لیکن کمیٹڈ ادب۔ جس کا نقطہ عروج اجتماعی مزاحمت کا ناول ہے کے بارے میں میرے ذہن میں کئی طرح کے شبہات ہیں اس کا بنیادی سبب یہی ہے کہ مجھے ایسا لگتا ہے کہ اس کی محدود طرز فکر سے سیاست کو کچھ حاصل نہیں ہوگا یہ شعور کو بلند کرنے کے بجائے اسے نیچے کی طرف لے جاتا ہے لاطینی امریکہ کے لوگ ناانصافی اور جبر سے باخوبی واقف ہیں انہیں ناول سے کچھ اور چاہیے''

جب ادب کو ''اس کچھ اور'' سے علیحدہ کر کے دیکھا جاتا ہے تو اس کی بے دخلی سے جو جگہ خالی ہو جاتی ہے اسے صحیح پن، سماجی سروکار اور نئی شعریات، یا نئے کے نن کے نام پر مخصوص آئیڈیالوجی سے پُر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن اس عمل میں ایک مہابیانیہ کے مقام پر (اور مقابلے میں) ایک دوسرا مہابیانیہ رائج کرنے کی کوشش شروع ہو جاتی ہے اگر پدری نظام Essentialist اور Reductionist ہے تو عورت کی Category بھی Essentialist اور Reductionist ہے ادب کی پرکھ میں یہ Paradigm shift جس میں دلت محض دلت ہے عورت محض عورت ہے مرد محض مرد ہے تو اُن کے اپنے اندونی تضادات اور باہمی میل جول اور مختلف سماجی Roles کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے سماج اور ادب میں یہ حد بندی نہ ہی ممکن ہے اور نہ ہی مرغوب۔ دراصل عورت کی Catogory اتنی پیچیدہ ہو گئی ہے کہ تانیا ماڈلیسکی کو اپنی کتاب کا نام Feminism

without women رکھنا پڑا۔

ادب عورت یا دلت کو Category کی صورت میں پیش نہیں کرتا بلکہ ایک خاص فرد جس کی مخصوص شناخت ہے کو پیش کرتا ہے صحیح ادب انفرادی احساسات ،فکر اور طرز عمل ، محرکات ، رویوں ،شبہات خود ، امیدوں ،تمناؤں ،شکستوں ، مایوسیوں پسند اور ناپسند کے بجائے Stereotypes اور اجتماعی فکر وعمل کو پیش کرنے کی وکالت کرتا ہے یہی باعث ہے کہ دلت یا عورت کے جس امیج کو مابعد جدید صحیح ادب میں پیش کرنے کی ضرورت پر زور دیا جا رہا ہے وہ بھی Steretype بن گیا ہے جو کردار اس Steretype کے مطابق عمل نہیں کرتے وہ صحیح پن کے خلاف ہیں۔

اس طرح تانیثی بیانیہ اپنے اندر افتراقات اور تضادات کو مٹانے اور اقلیتی رویے کو دبانے کی کوشش کرتا ہے اسے پدری نظام کی سازش قرار دیتا ہے۔نسوانی لبریشن کی آفیشل پالیسی کے خلاف بغاوت سمجھتا ہے یعنی مرد غالب معاشرے کے طرز عمل اور نسوانی لبریشن کے طرز عمل میں کوئی فرق نہیں فرق ہے تو صرف اتنا کہ کو سا رویہ Politically Correct ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم ایک ایسے اندھے موڑ پر پہنچ جاتے ہیں جہاں دونوں کے مابین مساوات اور مکالمے کی بجائے اقتدار کی جنگ شروع ہو جاتی ہے صحیح نظریے پر اصرار ادب اور سماج کے بیچ مختلف یا مخالف رویوں کے چلن کی کوئی گنجائش نہیں رہنے دیتا ادبی ادب کے بجائے سماجی ادب کو صحیح ادب قرار دیا جاتا ہے۔جن الگ الگ شناختوں اور مفادات کی ترویج کا دعوی کیا جاتا ہے وہ انجام کار آمریت اور کلیت کی شکل میں رونما ہوتا ہے۔اور ہر مختلف اور مخالف فکر کو سازش کے نام سے موسوم کیا جانے لگتا ہے۔

سازش کے خبط نے ادبی تنقید میں اتنا انتشار پیدا کر دیا ہے کہ کلاسیکی ادب بھی اس کی یلغار سے بچ نہیں سکا کلاسیکی ادب کا تجزیہ اور اقدار کا از سر نو تعین ، ہم عصر صحیح نظریے کی بنیاد پر کیا جاتا ہے ترقی پسند دور میں بھی ہم اس صورت حال سے دو چار ہو چکے ہیں۔کلاسیکی ادب اور شعریات کو اشرافیہ کے اقتدار کے استحکام سے جوڑ دیا جاتا ہے کلاسیکی ادب کی از سر نو تفہیم اور عہد حاضر کے حالات کے مطابق اس کو پیش کرنا ایک جائز عمل ہے تازہ کاری کا یہ عمل مسلسل جاری رہتا ہے لیکن عہد حاضر کے صحیح نظریے کے مطابق اسے condemn کرنا

دیگر بات ہے صحیح ادب کا نظریہ اس ادب کو بھی اپنے نظریے کے تحت دیکھتا ہے۔ جو اس نظریے کو Resist کرتا ہے۔

موجودہ دور میں مابعد جدیدیت اور کلچرل مطالعات اور نو تاریخیت کی مقبولیت کے باعث ادبی متن سماجیاتی ریسرچ کا موضوع بن گیا ہے۔ ادبی اقتدار کے پیمانے بدل گئے ہیں۔ تخلیقیت کے بجائے حقائق کی عکاسی پر تنقید کی عمارت تعمیر کی جاسکتی ہے نظریے کے سامنے تخلیق کی قوت کی سپردگی کا مطلب یہ ہے کہ ادب اپنی قوت اور خصوصیات سے محروم ہو جائے اور ایک تاریخی یا سماجی دستاویز بن جائے اور اسی بنا پر اس کی افادیت اور نسبت اور قدر و قیمت متعین کی جائے۔ اگر ایسے ڈاگ میٹک (Dogmatic) ایقان پرست ماحول میں نظریاتی اختلافات کو گروہی مفادات کے خلاف وشواس گھات سمجھا جائے تو کوئی تعجب نہیں۔

کے نن کو کھولنے کا نتیجہ تو یہ ہونا چاہیے کہ اس میں پہلے سے زیادہ کھلا پن آئے اور اسے زیادہ وسیع کیا جائے اور زیادہ امکانات سامنے آئیں لیکن ہو رہا ہے اس کے بالکل بر عکس۔ نسل، جاتی اور جنس کے نام پر اسے پہلے سے بھی زیادہ محدود اور جامد بنایا جا سکتا ہے ایک معنی کی تلاش یا اس پر اصرار اتنا ہی دقیانوسی، بنیاد پرست، آمرانہ اور Exclusivist ہے جتنا کہ صاحب اقتدار اور اشرافیہ کی شعریات کا معاملہ ہے صحیح ادب میں سوال اقتدار کو ختم کرنے کا نہیں بلکہ ایک گروہ کے جبر کے خلاف اس پر دوسرے گروہ کے جبر کو جاری کرنا ہے اقتدار کے ایک مرکز کے بجائے اقتدار کے دوسرے مرکز کو قائم کرنا ہے۔

اس امر سے کوئی انکار نہیں کہ ہم معاشرے، کلچر، سیاست اور معاشی نظام میں پرورش پاتے ہیں لیکن ادبی تخلیق معاشرہ نہیں کرتا فرد کرتا ہے جو بہت ہی پیچیدہ اور مختلف النوع عناصر سے ترتیب پاتا ہے اور مخصوص مختلف انداز میں متاثر ہوتا ہے اور اس طرح اپنی ایک منفرد شناخت بنالیتا ہے یہ منفرد شناخت اسے دوسرے تخلیق کار سے الگ کرتی ہے اور ہم ادب میں نت نئے تجربے کرتے ہیں ہر نظریے کی ادعائیت کا بیک لیش ہوتا ہے لیکن بیک لیش کا یہ خطرہ ہمیشہ ہی بنا رہتا ہے کہ وہ اتنا ہی اور کبھی کبھی اس سے زیادہ جارحانہ بن جاتا ہے جتنا کہ وہ نظریہ ہوتا ہے جس کے خلاف اس نے بغاوت کی ہوتی ہے صحیح ادب کے مابین مکالمہ جاری رہنا چاہیے ہر طرح کے ادب میں اعلیٰ اور ادنی ادبی تخلیقات پیش کی گئی ہیں

ہماری نظر ان کی اعلیٰ تخلیقات پر ہونی چاہیے تا کہ ادنی تخلیقات کے نمونے پیش کر کے اس طرز فکر اور نگارش کی نکتہ چینی کریں قریب ترین صدیاں، قبل جوناتھن سوفٹ نے بیٹل آف بکس (۱۷۰۴) میں تحریر کیا۔

''مدعی اور مدعا علیہ نے بڑی خوبی سے بحث کو آپس میں منظم کرلیا ہے اور مکمل طور پر طرفین کے مابین جو کچھ بھی کہا جا سکتا ہے اب کچھ نیا کہنے کو نہیں رہ گیا اب دونوں فریقین کے لیے دلائل کو سمیٹنے اور موجودہ ماحول میں باہمی صلاح مشورہ سے مرتب کرنے کا وقت آ گیا ہے بجائے اس کے ہم مسلسل اپنے اپنے دلائل کو دہراتے چلے جائیں اگر دونوں فریقین کے نتائج پر غور کریں تو ہم پائیں گے کہ اب مزید کسی بامعنی مباحثے کی گنجائش نہیں۔''

لیکن مباحثے جاری رہیں گے اور جاری رہنے چاہیے لیکن اس کا مطلب ادب کو ڈسکورس سے خارج کرنا اور اس کے مقام پر سیاست اور سماجیات یا کسی ایک فرقے یا گروہ کے گرد گھمانا نہیں ہے ادب کو بحال کرنے کی ضرورت ہے موجودہ انتشار اور پُر تشدد دور میں اب یہی ہماری survival kit ہے جب تک ادب کے لفظ کا استعمال ہوگا ادبی اقدار کا ذکر ضرور ہوگا سماجی سروکار اور ادبی اقدار کے مابین پینڈولم گھومتا رہے گا اور توازن بنتا بگڑتا رہے گا ادبی تنقید اس صورت میں اہم رول ادا کرسکتی ہے آخر میں ششی تھرور کے مشہور ناول ڈی گریٹ انڈین ناول میں یدھشٹر کے یہ الفاظ غور طلب ہیں:

''ارتقا کی مختلف منازل کے لیے موزوں دھرم بدلتا رہتا ہے اگر کوئی ایک بات آج سچ ہے تو وہ یہ ہے کہ ایسا کوئی ابدی سچ نہیں جو ہر دور کے لیے صحیح ہو کئی نسلوں سے ہم اس یقین کو تسلیم کرتے آئے ہیں کہ اگر ہم اسے صحیح طور پر عمل میں لائیں تو بھارت کے پاس تمام جوابات ہیں اب مجھے معلوم ہوا کہ اب بھی ہم تمام سوالات کو نہیں جانتے اب اور کوئی قطعی ایقان نہیں ہے شبہات اور تنوع کو تسلیم کرو ہر فرد کو اپنی سوچ کے مطابق زندگی بسر کرنے کے حق کو تسلیم کرو اپنی اقدار کو اپنے گردو پیش کے ماحول سے لوتا کہ اس وراثت سے جسے مسلسل پرکھتے رہنے کی ضرورت ہے اسی طرح بنجر نظریات اور ان لوگوں کے جو شعلے حکم ناموں کو بھی منسوخ کرو جو یہ

مانتے ہیں کہ وہ غلطی نہیں کر سکتے شائستگی پر عمل کرو انسانیت کی تعظیم کرو اپنے لوگوں کو ان اساسی اقدار میں ایمان مضبوط کرو جو بدلتی نہیں اور باقی ماندہ کو تیاگ دو اس بات کو تسلیم کرو کہ سچ ایک سے زیادہ ہے صحیح ایک سے زیادہ ہے دھرم ایک سے زیادہ ہے۔"

تنقید کے نئے پیراڈائم اور امتزاجی تنقید

رفیق سندیلوی

تنقید سوالوں اور قضیّوں سے مبرّا نہیں ہوتی البتہ پرانے زمانے میں قضیوں اور سوالوں کی نوعیت اور سطح بدلتی رہتی ہے۔یوں آ گہی کے اندر نئی آ گہی جنم لیتی ہے اور نمو کا سلسلہ قائم رہتا ہے ایسا نہ ہوتا تو تنقید ایک ہی نقطے پر رُکی رہتی موجودہ اُردو تنقید کا منظر نامہ اگر ماقبل تنقید سے مختلف و متنوع اور وسیع و منقلب نظر آ رہا ہے تو اس کے عقب میں آ گہی اور نمو کی یہی قوت کارفرما ہے اب تنقید سیدھا سادا معاملہ نہیں رہی یہ ایک مشکل ڈسپلن ہے فن پارے کی متن کی معیناتی جڑیں پورے ادب اور پوری ثقافت کے رموزی نظام میں پھیلی ہوئی ہوتی ہیں اس لئے تنقید کو اپنے طریقہ ادراکیت سے متنوع و منظّم ہونے کا احساس دلانا ہوتا ہے اور فن پارے کی جمالیاتی اثر کے راز کو بھی اسی وسیلے سے آشکار کرنا ہوتا ہے میرے خیال میں ساختیات کا یہ داعیہ کہ ادبی تحریر بین المتونیت کے زیر اثر وضع ہوتی ہے اسے اختراعیت اور مطلقیت کا نمونہ نہیں کہا جا سکتا وہ بنیادی قضیہ ہے جس نے موجودہ تنقید اور ماقبل تنقید کے بیچ خطِ امتیاز کھینچ دیا ہے اب متن مصنف کی زمین نہیں ہوتا کہ وہ جس طرح کی فصل اُگانا چاہے ۔اُگا لے اب لکھنے والا متن کو پیدا نہیں کرتا متن کے ہمراہ پیدا ہوتا ہے ۔متن از خود منکشف نہیں ہوسکتا۔متن اور متن ساز دونوں ایک دوسرے کے امکانات کے اندر عمل آرا ہوتے ہیں اسی طرح متن اور متن کا قاری بھی ایک دوسرے کی کیفیات کے اشتراک و تفاعل سے قرأت کے عمل کو انجام دیتے ہیں

ساختیات و پسِ ساختیات سے قبل اُردو تنقید اقداری و نفسیاتی لکیر پر گامزن رہنا پسند کرتی تھی۔فن پارے کی ذہنی، وجودی حیثیت کو اہمیت دیتی تھی لیکن جب تنقید کو سوسیور کے

لسانی ماڈل کے تحت زبان کے افتراقی نظام کا شعور حاصل ہوا تو الفاظ کے ذریعے صداقت کی ترسیل پر سوالیہ نشان لگ گیا۔ زبان کی غیر شفافیت اور ساخت کے گروہ در گروہ تعلق کے نظریے نے ثقافت کو فرد اور تاریخ پر تقدم دے دیا۔ فن پارے کی قرأت کا طریقہ ہی بدل گیا۔ فنکار جو اپنی اکبری تحریر پر ناز کرتا تھا اور اسے کلیم اپنے باطن کی تشکیل گردانتا تھا اسے جب یہ معلوم ہوا کہ لسانی اور ثقافتی قوت کس کس انداز میں متن کو وضع کرتی ہے تو اس کی حیرت دیدنی تھی یہاں مجھے اپنے ہی کچھ اشعار یاد آ رہے ہیں۔

ہر ایک بُعد میں اک اور بُعد شامل ہے
یہاں کوئی نہیں جس کی نگاہ کامل ہے
اے میری اکبری تحریر خود پہ ناز نہ کر
میں تجھ میں ہوں تو کوئی اور مجھ میں شامل ہے
کسی تعلق شے کے سبب ہی ہر شے میں
عجب طرح کی چمک ہے عجب جھلمل ہے
نظر جو درز بدن سے نکل کے مجھ پہ رُکی
کچھ اس میں دھوپ ہے کچھ اس میں گرد شامل ہے

میری نظر میں موجودہ اُردو تنقید کی پہچان اسی قضیے میں ہے یہی وہ قضیہ ہے جس سے Creation اور Production کی بحث چلی۔ روایتی نقاد پریشان ہو جاتا ہے کہ کیا فنکار ثقافتی تشکیل یا لسانی ساخت کے تابع ہوتا ہے یا اس کی قوت کے آگے بے بس ہوتا ہے اصل بات یہ ہے کہ فن کار کا تفاعل لسانی ثقافتی منبع سے جُوا ہوتا ہے جس کے تحت تخلیق کا تقلیبی آہنگ وجود میں آتا ہے فنکار دال اور مدلول کو زبردستی نہیں جوڑتا۔ اپنے ارادے یا ابلاغ کی خواہش کے تحت فن پارے کو اپنی مرضی کا ملبوس معنی فراہم نہیں کرتا یا اسے مصدقہ طور پر بامعنی بنا کر پیش نہیں کرتا۔ بلکہ وجدان و ارتقا، تصور و تمثال اور جمال و اسرار کے سہارے صناعی کا مظاہرہ کرتا ہے اور ذہنی انہماک اور حسی مشغولیت سے اسے ایک منفرد حیثیت دینے میں کامیاب ہو جاتا ہے منفرد ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ فن پارہ بین المتونیت سے کٹ کر کسی خلا میں وضع ہوا بلکہ یہ مطلب ہے کہ وہ بین المتونیت سے کٹ کر کسی خلا میں وضع ہوا بلکہ یہ

مطلب ہے کہ وہ بین المتونیت کے عمیق رموز کی آ گہی کی منزل پر وجود میں آیا یعنی وہ متحرک و
منقلب ہو کر خود کو انوکھی شکل دینے کے قابل ہو گیا۔فن پارے کی انوکھی شکل مصنف کی
شعریات فہمی پر دال ہوتی ہے یا مشریات کی وسعت دینے کی قابلیت کا ثبوت ہوتی ہے جسے
پہلے Originality سے موسوم کر دیا جاتا تھا ورجہ حقیقت یہ ہے کہ فن پارہ مکمل طور پر خود
منفیت کا حامل ہو ہی نہیں سکتا البتہ مصنف کی ذاتی اور مخفی مائتھالوجی کے اندر پیوست ہوتے
ہیں۔آج کا نقاد قرأت کرتے ہوئے تنقید کے یہی قضیوں سے نبرد آزما رہتا ہے وہ معنی کی
اختراعی حیثیت پر بضد نہیں ہوتا،فن کار کے انداز واسلوب ادب کی بین المتونیت اور ثقافتی
نشانات کے اندر مطالعہ کے بساط بچھاتا ہے اور معنی کی سیما بہت کا نظارہ کرتا ہے۔

تنقید کے میں پیراڈائم یعنی مطالعۂ ادب کے طریقے بدلتے اور توسیع پاتے رہتے
ہیں پیراڈائم دراصل ایک پیٹرن ،مثال یا ماڈل ہوتا ہے جو بطور ایک ادبی منہاج کے اپنی
مشابہتوں کی طرف اشارہ کناں رہتا ہے اُردو میں مارکسی تنقید اور ہیتی تنقید کے پیراڈائم بالکل
فنا نہیں ہوئے۔طرز کہن کی سطح پر روایتی مارکسی تنقید اور آئین نو کی سطح پر ہیتی تنقید عمل پیرا نظر
آتی ہے مگر فضا صاف بتا رہی ہے کہ نئی تھیوری کے مباحث نے موجودہ اُردو تنقید کو ادب کی تفہیم
اور تعبیر وتجزیہ کے لئے ایک نئے پیراڈائم کی طرف موڑ دیا ہے ہیتی تنقید نے جو نئی تنقید اور
روسی ہیت پسند تنقید پر مبنی اور جدیدیت سے منسلک ہے توسیع وتفسیر کو قبول کیا ہے مگر افسوس کہ
اُردو کے مارکسی نقادوں اور ان کے حامیوں نے اپنے اندر کوئی خاص تبدیلی پیدا نہیں کی وہ
ابھی تک ہیئت پر مواد کو ترجیح دیتے ہیں متن کو بالائی سطح کی سماجی اور تاریخی تناظر میں قید رکھتے
ہیں اقتصاد اور سیاست کو ثقافتی نظام کے کُل سے کاٹ کر دیکھتے ہیں تاریخ کے سکون وظاہر پر
توازن کی نظر جاتی ہے تاریخ کے تحرک وغیاب پر ان کی نظر نہیں جاتی وہ طے شدہ منطق کے
اسیر ہیں ان کے تخیل کا محدود نظام اس منطق کو عبور نہیں کر پاتا۔جارج لوکاس کی غلط تعبیر کی
تقلید میں مارکس ان پر بند ہو گیا ہے سماجی حقیقت نگاری ان کے لئے ایک بت بن کر رہ گئی
ہے حالانکہ کشادہ مارکسیت کی حدیں ساختیات وپس ساختیات سے آملی ہیں روس سے باہر
کے مارکسی نقادوں نے مارکس کے مکان بصیرت میں متعدد کھڑکیاں کھول دی ہیں رولاں
بارتھ اور دریدا نے کئی مارکسی اصطلاحوں کو نیا تناظر عطا کر دیا ہے اب نو مارکسی نقاد فن پارے کو

نظریے اور منشور کی یا محبوس و محصور قسم کے معاشرتی ماحول کی پیش کش کا ذریعہ نہیں سمجھتے وہ جان گئے ہیں کہ ثقافتی نظام میں نظریے کے خلاف جنگ بھی ہوتی ہے اور یہ کہ نظریہ بذات خود تضادات و اختراقات میں گتھا ہوا ہوتا ہے اور اسی باعث اسے کسی سماجی طبقے کا راست مظہر نہیں کہا جاسکتا یہ ایک اسطورہ کی مثل ہوتا ہے جس میں سماجی عقائد کی حقیقت کے التباس کے طور پر برتا جاتا ہے آئیڈیالوجی خود کو انسانی زندگی کے عکس کا درجہ دے کر فرضی تقسیم اور جعلی تحدیدات میں کس طرح اسیر کر دیتی ہے ہمارے پرانے ترقی پسندوں نے اس پر غور ہی نہیں کی ان کے ہاں نظریے اور آئیڈیالوجی کی بحث کو کبھی گہرائی اور باریک بینی کے ساتھ ثقافت اور ادب کے مشترکہ اور وسیع تر تفاعل کے اندر رکھ کے زیر بحث ہی نہیں لایا گیا اور ایسا نئی تھیوری اور ادب کے بدلتے ہوئے پیراڈائم سے دوری کے سبب ہوا ہے تھیوڈورا ڈورنو اور لوسین گولڈمن نے مارکس کی تشریح نو کرکے ساختیات اور مارکیست کے درمیان جو اشتراک پیدا کیا ہے لوئی التھیو سے نے ژاک لاکان کے مرکز گریز نفیساتی تحلیل اور مارکس کی جدلیات کو ملا کر جو مطالعہ پیش کیا ہے گرامسکی نے Hegmony یعنی جال نما مغالطوں اور مفروضوں کی تھیوری اور مشل فو کوز نے علم اور قوت کی مشترکہ عمل آرائی کی تھیوری سے جو ذہنی ہلچل پیدا کی ہے پیٹر ماشیرے اور ٹیری ایگلٹن نے ادب اور سماج کے منطقوں میں کارفرما آئیڈیالوجی کی متغیرّہ شکلوں کو جس طرح پس ساختیات کی روشنی میں نشان زد کیا ہے اُردو کے ادعائیت پسند مارکسی نقادوں نے اس سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھایا مجھے تو یوں لگتا ہے ان کی رسائی اینگلو امریکی تنقید کے معارف تک بھی ڈھنگ سے نہیں ہوسکی جس کے بنیادی مفروضوں کو تھیوری کے تنوعات نے ہلا کر رکھ دیا ہے ادبی تھیوری کے ناگزیریت مسلّم ہے اس لئے کہ وہ عصری تھیوریاں جو سماجیاتی اور بشریاتی میدانوں میں اپنا اثر ورسوخ بنائے ہوئے ہیں بے حد متنوع اور سوال انگیز ہیں ان کا سامنا کئے بغیر ادب اور زندگی کے باہمی رشتوں کو سمجھا ہی نہیں جاسکتا نارتھ روپ فرائی نے تھیوری کو تنقید کا صحیفہ مانا ہے ٹیری ایگلٹن نے تعبیر ادب کے حوالے سے اسے حیات بخش آگہی کا بدل قرار دیا ہے حتیٰ کہ ادبی تھیوری کے مخالفین بھی اس کی تشکیلی حیثیت کو تسلیم کرتے ہیں اس درسی ضرورت یا مغرب کا ایجنڈا کہہ کر نہیں ٹالا جاسکتا۔ دنیائے انسانی میں علوم جس بحران تضادم اور کایا پلٹ کی زد پر ہیں اور مسلمات کی دیواریں

جس طرح کھوکھلی ہو کر گر رہی ہیں۔ اس تناظر میں تھیوری سے خوف زدہ ہونے کے بجائے
دائرہ تفہیم میں داخل ہو کر اس پر سوالات قائم کرنے ضروری ہیں موجودہ اُردو تنقید کے پیراڈائم
جس امتزاج کا مطالبہ کر رہے ہیں ہمارے عہد کے وسیع النظر ترقی پسند اور جدید ناقدروں کی
بصیرت اس سے زیادہ دیر تک غافل نہیں رہ سکتی اصلاً Sign کے تصور کو سمجھنے کی ضرورت ہے
جو استقرار کے بجائے اضطراب کا حامل ہے منضبط نہیں غیر منضبط ہے یعنی Stable نہیں
Unstable ہے جس طرح ایک اینٹ کے سرکنے سے ساری اینٹیں گرنے لگتی ہیں اسی
طرح Sign کے تصور کے بدلنے سے پورا تناظر ہی بدل گیا ہے اور ادب کے ثقافتی کوڈز اور
کنونشنز کے مطالعے میں ثقافت کی آئیڈیالوجیکل اور سٹریٹیجیکل جہت بھی اُبھر آئی ہے یہی وہ نکتہ
ہے جو ترقی پسندی اور جدیدیت کے حامل نقادوں اور تخلیق کاروں کا مابعد جدیدی منظر نامے
سے جوڑ سکتا ہے۔

ترقی پسندوں وجدید تنقید میں اتنی قوت نہیں رہی کہ وہ خود کو ادبی منظر نامے پر حاوی
رکھ سکے وقت کے ساتھ ساتھ اس کے موثر اور قابل دخیل اجزاء تنقید کے مابعد جدید آگہی میں
تحلیل ہو گئے ہیں جو کچھ بچ رہا ہے اگر بعض حضرات اسے کسی مکتبہ فکر کے طور پر منجمند رکھنے کی
آرزو مند ہیں تو درحقیقت وہ اصول تغیر سے انحراف کر رہے ہیں کسی تنقیدی ڈسپلن یا طریقہ نقد
کے بے دخل یا غیر موثر ہو جانے کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ اس کی آگہی کا زور ٹوٹ گیا یا
اطراف میں آگہی کا میدان وسیع ہو گیا ضروری نہیں کہ جدیدیت کے اکمل یا مضمحل ہو جانے
کے بعد ہی مابعد جدیدیت کی بات کی جائے۔ بات شروع ہی اس وقت ہوتی ہے جب اس
کا جواز پیدا ہو جاتا ہے۔ زمانی سطح پر جدیدیت اور مابعد جدیدیت کی رخصت و آمد کا تعین
دوطرفہ شاہراہ کی صورت میں نہیں ہوسکتا۔ آگہی کے دائرے میں ایک دوسرے میں ضم ہوتے
ہیں۔ یہ کہنے کے بجائے کہ ابھی جدیدیت بھی پوری طرح نہیں آئی یہ کہنا زیادہ صائب ہو گا
کہ ابھی مابعد جدیدیت پوری طرح نہیں آئی جدیدیت کے اثرات بھی موجود ہیں اور مابعد
جدیدیت پوری طرح نہیں آئی جدیدیت کے اثرات بھی موجود رہیں اور مابعد جدیدیت پر
مکالمہ بھی جاری ہے۔ خود اختلافی اور پردہ داری کے وہ عناصر جو جدیدیت کی تہہ میں پوشیدہ
تھے اب سطح پر آ رہے ہیں اور ایک فطری جدلیات کے تحت ان کا تجزیہ بھی ہو رہا ہے یہی تجزیہ

ہماری ادبی حسیّت ، آدرشی تصور اور موضوع کی مرکزیت میں تبدیلی لا رہا ہے اس تبدیلی سے نئے پیراڈائم کا اندازہ ہوتا ہے موجودہ تنقید کا رخ جدیدیت کی اور مابعد جدیدیت کے انقطاع واتصال کی تفہیم کی طرف کھلا ہوا ہے۔

تازہ تنقیدی مباحث میں نظری مسائل کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ نظری مسائل سے مراد ادبی تھیوری ہے جس میں ساختیات بھی شامل ہے اور پس ساختیات بھی اس کا ایک جواز تو اس کے مزاج کا Cognitive یا وقوفی ہونا ہے۔

روایتی تھیوری میں ہر علم کی نظری تجدیدات کو ایک مخصوص منہاج کے طور پر الگ الگ برتا جاتا ہے جبکہ تنقیدی تھیوری ان تجدیدات کو مسمار کر کے وقوف کی کشادگی پر اصرار کرتی ہے سوال یہ ہے کہ تھیوری یا تنقید کے پس ساختیاتی زاویوں کی نظری اور اطلاقی سطح پر اس کی مجموعی آگہی سے بھی فائدہ اُٹھایا جا رہا ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ہماری علمیاتی صورت حال کے پیش نظر ابھی تھیوری کی بحث کو مزید عمق میں جا کر کھولنے کی ضرورت ہے خاص طور پر نو مارکسیت نو تاریخیت ، تانیثیت اور بعدِ نو آبادیت جسے پس ساختیاتی نظریات کو زیادہ مس کیا جانا چاہے تا کہ آئیڈیالوجی ، اقتصاد ، تاریخ ، سماج اور سماج کے اندر رچے بسے ہوئے اشرافی اور مرکز مائل تصورات کی تمام فریب کارانہ شکلیں نمایاں ہو جائیں اور جب ہم اطلاقی طور پر ادب کے تجزیے کی طرف رجوع کریں تو کسی فن پارے کے غیر ادبی اور ادبی ہونے کے ادارک سے غافل نہ رہ سکیں دیکھئے غیر ادبی متن جدیدیوں کے ہاں بھی موجود ہے جو فیشن کے طور پر پروان چڑھا اور ترقی پسندوں کے ہاں بھی موجود ہے جو سیاست کی متابعت میں پھلا پھولا اور صحافت کی روداد نگاری ثابت ہوا دونوں جدت اور حقیقت پسندی کی آڑ میں تخلیقی تجربے سے محروم رہا۔ کلچر مطالعات میں جب ہر قسم کے متون کو تہذیبی یا ثقافتی متون کے زُمرے میں رکھا جا رہا ہو تو نظریاتی اور غیر نظریاتی ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا مگر کیا ہر قسم کا متن بشمول نظریاتی و غیر نظریاتی متن ، ادب ہو سکتا ہے ہرگز نہیں کیونکہ اس میں عقل اور وجدان کی وہ کثیر لاصوتیت اور تہہ نشیں حرکیت نہیں ہوتی جو ادب کو ادب بناتی ہے اور اسے دیگر متون کی Pragmatic سطح سے بلند کرتی ہے ہر چند کہ ادب کی تشکیل پذیری میں وسیع و عمیق ثقافتی ماحول ہی کارفرما ہوتا ہے مگر ساری بات اتصال و آمیزش کے اس درجے کی ہوتی

ہے جہاں ادب تہذیبی یا ثقافتی متون میں شامل ہو کر بھی اور ان کے اجزاء کو استعمال کر کے بھی اُن سے رفیع تر ہو جاتا ہے ہاں حسن نے اسے ادب کی بدمعاش قوت کا نام دیا ہے غور کریں تو غیر ادبی اور ادبی ہونے میں وہی فرق ہوتا جو کھانے اور مظاہرہ کرنے میں ہوتا ہے جو انفرا سٹرکچر اور سٹرکچر میں ہوتا ہے فن پارہ جگہ گھیرنے والا منجمد مواد نہیں ہوتا جہات میں گردش کرنے والا متن نہیں ہوتا ہے متن کی اسی گردش کے باعث تھیوری عام ہو جاتی ہے ترقی پسند مارکسی نقاد ذرا آگے بڑھیں تو تھیوری ارتقائے فہم کا سامان پیدا کر کے ان کو ادب کے اصل منصب سے آشنا کر سکتی ہے سیاسی اور معاشی مسائل یا پانی، بجلی، سوئی گیس، روزگار، انکم ٹیکس، اور بجٹ کے معاملات پر برقی میڈیا اور صحافتی حلقہ بحث کرتا رہتا ہے ادیب بھی اپنی دانشورانہ حیثیت میں اس پر رائے زنی کر سکتا ہے مگر تخلیقی عمل کبھی بھی اس کے تابع نہیں ہوتا متن کی ادبی، آئیڈیالوجی کی صداقت سماج کی سیاسی یا معاشی آئیڈیالوجی کی صداقت سے بلند تر ہوتی ہے اور چونکہ یہ کثیر الجہت ہوتی ہے لہٰذا تھیوری کی طرف متوجہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ قاری ایک معنی پر اکتفا نہیں کرنا چاہتا فعالیت کے ساتھ متن کے پورے میدان کو حیطہ نگاہ میں لانا چاہتا ہے۔

مابعد جدیدیت موجودہ انسانی صورت حال اور ساخت کے لامرکزیت پر ایک زبردست مباحثہ کی حیثیت رکھتی ہے اس کے دائرہ آگہی میں ادب بھی شامل ہے لہٰذا یہ کیسے ممکن ہے کہ ادب کی تنقیدی نظریات پر مابعد جدیدیت نے اپنے اثرات مرتب نہ کئے ہوں البتہ یہ ضرور ہے کہ مغرب میں مابعد جدیدیت لرزہ اندامی پیدا کر کے اپنی مقامیت اور فکری تناظر میں رچ بس گئی ہے ہماری، ادبی عصری اور ثقافتی صورت حال اپنی ایک مقامیت اپنا ایک تناظر بھی رکھتی ہے اور عالمی فضا سے بھی جُڑی ہوئی ہے اب اسے کیا کہیں گے کہ ایک طرف DNA ٹسٹ کی بات ہو رہی ہے تو دوسری طرف بے گناہی ثابت کرنے کے لئے انگاروں پر چلنے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔سیاسی اور قبائلی سردکار کسی طرح راہ میں حائل ہیں ایسے میں عقلیت اور مابعد الطبعیات کے ردوقبول کو کس نظر سے دیکھا جائے دنیا بھر کے نوع بہ نوع انسانوں پر کوئی مطلق یا مستقل نظریہ منطبق نہیں ہو سکتا بلاآخر جہالت اور روشن خیالی دونوں کا پول کھولنا ہے دراصل مابعد جدید نظریات کا رشتہ پس ساختیات سے ہے جو کسی چیز پر قفل نہیں لگاتی ہر چیز کو الٹاتی پلٹاتی رہتی ہے حد بندیوں، اصولوں، مفروضوں اور فارمولوں کو قبول نہیں

کرتی یقین کے بجائے شک کوترجیح دینا مدلول کے بجائے دال کو اُبھارنا ہے اور اسے ثقافتی ہالے میں لے جانا ہے فطری حقیقت اور سماجی ساخت کے مابین فرق کرنا اس کا شیوہ ہے مابعد جدیدیت اپنی نہاد ہی میں Highاور Low کی قائل نہیں ہے اور اتھارٹی اور تھیوری کے خلاف ہے اس کا سرسری مطالعہ گمراہ کن ہوسکتا ہے۔ عام قاری اس کے انحرافی اور اثباتی دونوں رُخوں کو خلط ملط کر کے یہ کہہ سکتا ہے کہ اگر یہ اپنی نہاد ہی میں اینٹی تھیوری ہے تو تھیوری کی وکالت کیوں؟ تھیوری سے مراد وہ تمام تر تھیوریاں ہیں جن کی نشوونما سے اس بحرانی صورت حال کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے جو علوم انسانیہ کو درپیش ہے مابعد جدیدیت اس لئے اینٹی تھیوری ہے کہ کسی ایک تھیوری، متعدد تھیوریوں یا تمام تر تھیوریوں پر اکتفا نہیں کرتی کیونکہ صداقت کو جاننے کے جو بھی طریقہ وضع کیا جاتا ہے وہ کلیت کا حامل نہیں ہوسکتا اس لئے مابعد جدیدیت تھیوری کو تسلیم بھی کرتی ہے اور تھیوری کی صداقت پر سوالیہ نشان بھی لگاتی ہے۔

گذشتہ نکات کے تسلسل میں رہتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ترمیم و تغیر اور تنسیخ و تجدید کو اپنائے بغیر کسی ادبی ثقافتی یا انسانی صورت حال کو نہیں سمجھا جا سکتا کوئی ایک تنقیدی نظریہ متن کے حاضر و غائب حصوں میں اور ان کے پیچ در پیچ پرتوں کو منور نہیں کر سکتا اس وقت متعدد تنقیدی نظریات برسرِ عمل ہیں ان میں سے کسی ایک کے ساتھ وفاداری کا مطلب یہ ہے کہ تجزیے کی باقی جہات سے کنارہ کشی اختیار کر لی گئی جز کو چن لیا گیا اور متعدد اجزا کو فراموش کر دیا گیا درست ہے کلیت کے ساتھ تخلیقی تجربے کے امکانات کو گرفت میں نہیں لایا جا سکتا مگر اس عدم رسائی کے اپنے ذہنی و عقلی مضمرات ہیں اس کا مطلب یہ نہیں کہ فن پارے کے سالم ہونے کا احترام ہی نہ کیا جائے اور تنقیدی نظریات کے تنوع ہی سے بیگانگی اختیار کر لی جائے میرے خیال میں امتزاجی تنقید اپنی لچک داری اور گونا گونی کی جو زیادہ قابل قبول دکھائی دیتی ہے یہ فن پارے کو انہی شعاعوں میں لا کر دیکھتی ہے جو اس کے اندر سے پھوٹ رہی ہوتی ہیں جس طرح مابعد جدیدیت تھیوری کی ضرورت کو مانتی بھی ہے اور اس کی صداقت کو حرف آخر کا درجہ بھی نہیں دیتی اسی طرح امتزاجی تنقید بھی تھیوری اور متھاڈولوجی کے متعینہ معنی کو قبول نہیں کرتی۔ خود کو Define نہ کرنے اور حد بندی کو مسترد کرنے کی بدولت اس کا مزاج ہی مابعد جدیدی ہے امتزاجی تنقید کو مابعد جدیدیت کے اثباتی نقوش کو نعم البدل قرار دیا جا سکتا ہے۔

کلاسیکی ادبی ورثہ

اختر عثمان

"یہ مضمون حلقہ ارباب ذوق کھوڑ (پنڈی گھیب) کے سالانہ جلسہ پر خطبۂ صدارت کے طور پر پیش کیا گیا۔(ادارہ)

ایک زمانہ تھا کہ ہم جیتے تھے ہمیں اپنے تہذیبی متون کو سمجھنے کے لئے کسی براؤن، کسی گلکرسٹ، کسی گارسیں دتاسی اور بہت سوں کی ضرورت نہ تھی۔ نکسن کی کیا مجال تھی کہ ہمیں عربی ادب کی تاریخ اور اقبال پڑھاتا! مگر اے وائے کہ آج ہم خیام کیلئے Fitzgerald، ابن العربی کیلئے Titus Burkhard اور حافظ ورومی کیلئے این میری شمل کے محتاج ہیں۔

کہاں تک نام لوں۔ مستشرقین کے ذکر کو دفتر درکار ہیں۔ عشق استشراق کا افسانہ ایڈورڈ سعید ایسا سنا گئے کہ روح کانپ اُٹھتی ہے مگر ذہن ہے کہ جسم کو سلانے پر تلا بیٹھا ہے۔ بقول شخصے ہم وہ کچھوے ہیں جو خرگوش کے سونے پر بھی ہار جاتے ہیں۔ ذرا سوچئے کہ کیا آپ نامور امریکی گائیکہ Madona کی ہیجان خیز اور شہوت انگیز آواز میں بزبان انگلیسی رومی سن کر کوئی عقل کی بات کر سکتے ہیں! ہمارے باکمال متون کو کیا کیا معنی نہیں دئے گئے مگر یہاں توقف کیجئے اور بتائیے کہ میر کو آہ، سودا کو واہ، اور انیس و اقبال کو مذہبی شعرا کس نے بنایا ہے؟ یہ سب کیا دھرا غیروں کا نہیں۔ ہم آپ بلکہ سب کے سب اس کارِ بدنام میں پوری طرح ملوث ہیں آج کسی بھی ادبی محفل میں عربی فارسی تو کجا کلاسیکی اردو شعر پڑھنا رجعت پسندی کی علامت ہے۔ میر و غالب اور انیس تو خیر" بے چارے"بہت پرانے ہیں اقبال جو قومی شاعر ہیں ہماری دستبرد سے محفوظ نہیں۔ ہم اقبال کے از نصف فارسی کمالات کو فراموش کر کے

کس منہ سے انہیں قومی شاعر کہتے ہیں ۔

یہ ماضی کا ماتم نہیں ، انہیں بصیرت افروز چشموں کی ہڑک ہے جو پیاس بڑھاتی ہے لیکن "آبِ حیواں" کے ورثہ داروں کا ایسا عبرت ناک انجام چشم فلک نے کبھی نہ دیکھا ہوگا ۔ اردو کلاسیکی سرمایہ سے توانا رشتہ قائم کرنے کے لئے شہکار فارسی ادب کا گہرا ادراک لازم ہے اور اقبال ہمارے واحد شاعر ہیں جن تک رسائی جدید علوم کے بغیر محال ہے ہمیں اگلی نسلوں کو اپنے اسلاف کے علمی ادبی کارناموں کی طرف راغب کرنے کی جتنی ضرورت آج ہے شائد ہی کبھی رہی ہو ۔ کتاب کا فروغ اور تمیز انتخاب اس سلسلہ کی اہم کڑیاں ہیں تاکہ مغرب کا ہر گھٹیا لکھنے والا ہمارا رول ماڈل نہ بن سکے ۔ عالمی ادب کے ساتھ ہمارا تعلق آقا غلام کا نہیں ۔ اگر ہم آزاد ہیں تو ہمیں اسیری اور وابستگی میں خطِ امتیاز کھینچنا پڑے گا ۔ یقین مانیے کہ آج مغرب سے جو نئے نئے "ادبی لسانی رجحانات" آرہے ہیں اور ہمارے نقاد انہیں ہاتھوں ہاتھ لے رہے ہیں اس سے کہیں زیادہ انسان دوست صورت میں مولوی اور بیدل کے یہاں مل جائیں گے ۔ مغرب کے ساختیاتی مفکرین نے مصنف کا ابطال کر کے جس طرح قاری کو تعبیر کے جملے سونپ دیئے ہیں اس سے تیسری دنیا کے واحدانی تصور حقیقت (بھلے وہ تہذیبی ہو یا مذہبی) پرزد پڑتی ہے لکھاری کا انکار اور قاری کا اقرار دراصل استعمار کی وہ چال ہے جس کے توسط سے تیسری دُنیا میں موجود اس جوہر کی بیخ کنی منظور ہے تاکہ وہ کسی Binding Force کی شکل میں عالمی سرمایہ دارانہ استعمار کے روبرو ہوکر اس سے مبارز طلب نہ ہوسکے ۔ سچ پوچھیے تو موجودہ عالمی سیاسی معاشی منظر نامہ کو اچھی طرح سمجھے بغیر ادب کی تفہیم ممکن ہی نہیں ۔ مغربی معاشرے کا ادیب اسی سرمایہ دارانہ نظام کا حصہ ہے اور اپنے معاشرتی مفادات کا محافظ بھی ادھر ہمارے نقاد ہیں کہ اس آزادئی کو (جو مرغ گرفتار کے پاؤں ہے) دندنانے کا کوئی مہذب طریقہ نہیں لیکن ادب میں بقراطیت اس قدر زوروں پر ہے کہ محض ایک آدھ گھنٹہ کی Net Club میں کھپا کر آپ یہ میدان مار سکتے ہیں اگر ادبی عدالت میں بھی انسان دشمن رویوں کی سماعت نہ ہو سکے تو نقد ادب ایک داخل دفتر مسل سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی ۔ جدید علوم کے ذریعے فن پاروں کا مطالعہ سودمند سہی مگر یہ نکتہ پیش نظر رہے کہ اس عمل میں خود فن پارہ ہی سب سے معقول راستہ ہے ۔

نقد ادب معنی یابی کا مضمون ہے البتہ وتاہم کا نہیں۔ ذرا بتایئے کہ ہمارے "ادبی علما" نے خسرو سے اقبال بلکہ راشد تک اور میر امن سے غلام عباس تک کے یہاں کون سے کمالات دریافت کئے ہیں؟ محقق متن تیار کر کے دے گا تو نقاد کچھ موشگافی کرے گا۔ انگریزی کا غوغا ہے اور حال یہ ہے کہ وہاں بھی مطالعہ ایسا ہے جسے محمد حسین آزاد نے بکریوں کا باغ میں گھسنا کہا تھا یعنی پودے بھی خراب کئے اور پیٹ بھی نہیں بھرا۔ جدید اردو تنقید میں حوالے، حواشی اور مآخذ سب کچھ ملے گا اگر نہیں ہے تو تفہیم، یعنی اصل کام۔ دراصل اس مخلوق کا بھی کوئی قصور نہیں جسے نقاد کہتے ہیں بقال صائب:

بود ملال بمقدار مال ہر کس را
بقدر روغن خود ہر چراغ می سوزد

ابنِ راشد نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اس کے حافظے میں صرف دو ایسی راتیں محفوظ ہیں جن میں وہ مطالعہ نہیں کر سکا ایک اس کی شب زفاف (سہاگ رات) اور دوسری اس کی والدہ کی شب وفات۔ پہلی رات کا تعلق تو خیر جمالیاتی تجربے سے ہے جو کم از کم جدید اردو ناقد کو نصیب نہیں ہوا، دوسری البتہ اس کی ساری زندگی پر چھائی رہتی ہے ایسے میں کلاسیکی کارناموں کی تفہیم کیلئے خود سنجیدہ تخلیق کاروں کو سعی کرنا ہوگی۔ بدقسمتی سے اس میدان میں جو دو اڑھائی لوگ ہوئے اب ہم میں نہیں۔ سو ہماری ذمہ داری ہے کہ اپنی تونمند روایت سے روشنی پائیں اور پھیلائیں۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں موقع پرستی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اقبال کی ایک فارسی نظم کا مطالعہ کے دوران حاصل ہونے والی مسرت میں آپ کو بھی شریک کروں۔ یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ تنقید کی زبان بھی زیر تجزیہ فن پارہ ہی متعین کرتا ہے۔

وجود کیلئے شعور کی پیشگی شرط اگرچہ اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ انسانی فکر، تاہم بیسویں صدی میں اس قضیہ کو ایک منضبط نظام فکر کے طور پر پیش کرنے کا سہرا ژاں پال سارتر کے سر بندھتا ہے شعور اپنی کارفرمائی میں تجسس، سوال، تلاش و تفتیش اور تگ جاودانہ کے کراں تا بہ کراں جہانوں کا سیلانی ہے اور کوئی بھی جبر اسے زنجیر نہیں کر سکتا بلکہ قدغنیں تو اس کے مہمیز کا کام دیتی ہے ہر نوع بعض خارجی اور اکثر داخلی ضروریات کے تحت فطرت کے دائرہ جبر کو

توڑنے کی سعی کرتی لیکن محدود صلاحیتوں کی بنا پر تعینات سے نکلنا کچھ سہل نہیں ۔ یہ کمال فقط صاحب شعور کو ارزانی ہوا ہے کہ کریدے اور معلوم کرے۔

قدرت سوال سے محروم دیگر انواع کے برعکس انسان اس جوہر کا حامل ہے مگر اختیار و انتخاب کے دہن کشودہ نہنگ پوری قربانی کے ساتھ قدم قدم اس کے مقابل ہیں سارتر کے نزدیک اختیار صرف اسی قدر ہے کہ انسان دکھوں کے انبار میں سے ایک دکھ ہمیشہ کے لئے اپنے واسطے چن لے، ایسا دکھ جس کے ساتھ ساری زندگی بتائی جا سکے۔ کیونکہ ہستی اپنی انتہا اور کلیت میں فنا پذیر ہے اور انتخاب کا حق صرف ایک تفویض ہوا رہا ہے دیگر انواع کے برعکس انسان صرف اپنی نوع سے مکالمے اور مخاطبے پر اکتفا نہیں کرتا اظہار کے اکمل جوہر، یعنی زبان، کا حامل ہوتے ہوئے بھی فکر کے بعض منطقے ایسے ہیں جہاں نکتۂ اشتراک کی کوئی صورت نہیں بنتی اور سوال اپنی تنہائیوں میں بھٹکتا رہتا ہے تنہائی سوال کا منبع و مخزن ہے ہستی کے لمحۂ اولین سے لمحۂ موجود تک مختلف جبلی و سماجی خوف انسان کو جکڑے ہوئے ہے مرنے کا خوف، اشتہا کا خوف، قانون کا خوف اور عدم شناخت کا خوف وغیرہ۔ تنہائی خوف کی بدترین شکل ہے اگرچہ ہر جاندار کا زوج یعنی جوڑے کی صورت میں ہونا قدرت کی طرف سے تلافی، تنہائی کی ایک موہوم کوشش ہے لیکن شعور کی برتر سطح پر یہ تلافی بھی ناکافی معلوم ہوتی ہے معاملہ محض ہم نفسی و ہم قدمی تک محدود نہیں رہتا۔

شعور کا آفتاب نصف النہار تک پہنچ کر ہم نظری کا مطالبہ کرتا ہے اس مظاہرے سے گفتگو کا لپکا روز اول سے انسان کی داخلی آرزو رہا ہے اور اس یکطرفہ گفتگو سے نئے نئے سوال مرتب ہوتے رہے ہیں یوں تنہائی تعینات کے منطقوں سے نکل کر کونیاتی معاملہ بن جاتی ہے استفہام کا جوہر انسانی خمیر میں اس درجہ وافر ہے وجود اور جوہر ایک ہی چاک پر گھومتے معلوم ہوتے ہیں اور اسفال سوال کے خدوخال واضح ہونے لگتے ہیں ۔ صاحب جوہر اپنی نوع کی استعداد کو ناکافی سمجھتے ہوئے کسی ایسے وجود کی جستجو میں نکل پڑتا ہے جو تجسس کی بھڑکتی ہوئی لو کے بالمقابل آ کر اسے آسودہ جواب کر سکے کائنات سے ہمکلام ہونے کا شرف دوسری مخلوقات کو حاصل نہیں کہ اس اعزاز کے لئے حرکت و توانائی کے علاوہ بھی کچھ درکار ہے جسے اہل فکر نے چیزے دگر کا نام دیا ہے اور ژاں پال سارتر کی دلچسپی اسی امتیاز سے تھی لیکن انسان

کی کوشش پیہم کا ٹمٹماتا دیا ہمیشہ اس کی نظروں سے اوجھل رہا ہے اور اسے کائنات کی ظلمات بے پایاں میں سرخوشی و روشنی دکھائی نہ دی سو وجود اس کیلئے مجبور محض کے علاوہ کچھ نہیں ۔

اقبال نے جتنا کچھ اور جیسا کہہ رکھا ہے اس کا حاصل انہیں عشق کی صورت میں توفیق ہوا ہے اقبال کی شاعری کا مرکز عشق ، انکے عشق کا مرکز دل اور ان کی فارسی شاعری کا دل ان کی نظم ''تنہائی'' ہے یوں تو انہوں نے اس عنوان کے تحت ایک اردو نظم بھی کہہ رکھی ہے لیکن فارسی نظم میں آفریدگار زمان و مکاں سے وہ مرعوبیت نہیں جو اردو نظم سے مخصوص ہے ۔اردو نظم کا لہجہ استعجابیہ ہے اور فارسی کا ستفہامیہ۔استعجاب عجز انکسار اور اسراریت سے متصف کیفیت ہے گویا ایک خاموش پانی ، سہمے سہمے انداز میں بہتا ہوا جبکہ استفہام شعلہء جوالہ ہے روبرو ہو کر آنچ سمیت اپنی موجودگی کا بھرپور احساس دلاتا ہوا بلکہ حافظ کے لفظوں میں کلامِ رندخراباتی۔

ترکی کی فتح قسطنطنیہ کو ابھی نصف صدی ہی گزری تھی کہ عدم مرکزیت کا شکار ہو کر بکھرنے والے علوم کسی نئی جہت نمائی کے بغیر رخصت ہو گئے ۔دو عظیم جنگوں کے بعد احساس تنہائی کی مختلف صورتیں نئے ادب کا حصہ بنی اور بیسویں صدی کے ادب کا سب سے بڑا سوال تنہائی ٹھہرا۔۱۹۱۸ کے بعد علوم کی انسان مرکز حیثیت ختم ہو گئی اور بربریت اور بہمیت نے نئے خدشات و احساسات کو جنم دیا یوں انسان کا انسان سے اعتماد اُٹھ گیا اور وہ اپنے بچاؤ کے لئے دیگر مخلوقات کے بطون میں پناہیں تلاش کرنے لگا کافکا کی معروف کہانی Metamorphosis اسی احساس کی دین ہے علاوہ ازیں T.S Eliot کی نظم The waste land , allen Ginsberg کی نظم How I اور Gabriel Garcia Marques کا ناول One Hundred Yeard of Solitude بھی اسی موضوع پر استوار ہیں اردو میں فیض اور مجید ان فنکاروں سے قطع نظر اقبال کی فارسی نظم ''تنہائی ایک جداگانہ نوعیت کی تخلیق ہے ان کے دوسرے فن پاروں کی طرح یہ نظم بھی تمثیلی ہے ایسی تمثیل جو خارج سے کردار منتخب کرتی ہے اور فنکار کے اندر ہی کہیں چلتی ہے راوی کے سوا تمام کردار خاموش ہیں اور وقت کا تعین صرف چاند کی موجودگی سے ہوتا ہے کہ رات کا کوئی پہر نظم ایک گھمبیر خودکلامی سے آغاز ہوتی ہے ۔شاعر موج ، کہسار مہتاب اور

یزداں سے استفسار کرتا ہے لیکن کوئی جواب نہیں دیتا۔ بجز اس کے کہ یزداں کے ہونٹوں پر ایک تبسم بکھر جاتا ہے غم کی تلاش اسے ساحل تک لے جاتی ہے اور ایک سوال تکرار تمنا کے طور پر نظم کے ہر بند میں گونجتا ہے موج کی جنبش، سمندر میں اسکی اچھل کود اور ہموار سمندری فضا میں اسکی کشیدگی یہ احساس پیدا کرنے کے لئے کافی ہے کہ تحرک جذبے سے الگ کوئی چیز نہیں۔ شاعر پوچھتا ہے۔

ہمیشہ در طلب استی چہ مشکلے داری
ہزار لو لو و لا لاست در گریبانت
درون سینہ چومن گوہر دلے داری

لیکن یہ کیا:

تپید وازلب ساحل رمید و ہیچ نہ گفت

گویا اپنے اندر ان گنت و گہر رکھنے کا باوصف موج متاع دل سے واقف نہیں اقبال نے موج کو ایک خوفزدہ غزال کی طرح رمیدہ دکھایا ہے جو شکاری کے جال میں صید سوال کی صورت نہیں رہنا چاہتی موج آزاد منش اور آزردہ بوندوں کا مجموعہ ہے لیکن زمین کے سینے پر ٹکے رہنا اس کے اختیار میں نہیں اس لئے رمیدہ کا لفظ عدم اطمینانی کی طرف اشارہ تو کرتا ہے مگر یہ بے کلی دل کی عطا نہیں بلکہ احساس کی کسی بھی سطح سے عاری ہے اور ایک جبر کی صورت اس پر مسلط۔ لعل و گہر موج کو کوئی توقیر اور شادمانی نہیں دے سکتے بلکہ وہ تو اس خزانے سے ہی لاعلم ہے بے خبری اہل دل کا وطیرہ نہیں۔ شعور تو جاننے اور چھاننے کی مسافت ہے ہمہ سرگردانی، ہمہ کاوش و کد، کنارہ چھوڑ کر خاموش لوٹنے میں بھی موج کی رضا کا دخل نہیں کہ وہ تو ساحل سے ٹکرائی ہے اور سماعت و گویائی کے اوصاف سے قطعی محروم ہے سو سوال ناشنیدہ ہو کر فضا میں چکراتا پھرتا ہے۔

سر ساحل تک کا یہ بے ثمر سفر فنکار کو کہسار تک لے آتا ہے اور نظم زمین سے اٹھنے لگتی ہے۔ موج کی حرکت و روانی کے مقابلے میں کہسار کا بھاری وجود محکمی بتاتی ہے کہ استقلال لازمی طور پر کسی یقین کا نتیجہ ہے رنگ رنگ کے پتھر سنگینی کے باوجود لبھاتے اور رجھاتے ہیں تو کیا عجب ہے کہ یہ پابہ گل اور قوی الجثہ شے بھی دل رکھتی ہو۔ پوچھنا چاہیے

رسد بگوش تو آہ و فغاں غمزدہ؟
اگر بہ سنگ تو لعل ز قطرہءِ خونِ است
یکے در آبہ سخن بامن ستم زدہ !

لیکن یہاں بھی کچھ مختلف حال نہیں

بہ خود خزیدو نفس در کشید و ہیچ نہ گفت

گویا یہ بات گمان تک ہی رہتی ہے کہ دوسری جانب سے کچھ سنا بھی گیا۔ سبک سری میں کسی نوبیاہتا کی طرح چھوئی کی کیفیت بیان کرتے ہیں وہاں جسیم نوع کی تہی دامنی اور حیرت ناکی بھی دکھاتے ہیں نفس کشیدگی میں مبہوت ہونے سے زیادہ سوال کے عجیب ہونے کا تاثر ملتا ہے۔پتھروں کا انبار استطاعت جواب تو درکنار سماعت سوال سے ہی معذور ہے استفسار نے اگر کچھ تبدیلی کی بھی تو اتنی کہ خامشی زیادہ گھنی ہوگئی ہے۔چٹانیں تو بات منہ پر دے مارتی ہیں۔

سوال کے کچوکے شعور کو سر بہ گریباں نہیں رہنے دیتے اور تنہائی کا راہی نئی منزلوں کا نکل پڑتا ہے قلمرو فلک پر خسروانہ خرام کرتا ماہ دو ہفتہ پوری تابانی سے ستاروں کے جھرمٹ محو سفر ہے خلا اندر خلا بھٹکتی سیماب صفتی دودھیا دائرے میں آ ٹھہرتی ہے۔ مہتاب کے داغ دھبے کسی گہری کسک، کسی پھانس اور کسی ناشگفتہ ارمان کا پتہ دیتے ہیں استفسار کا پھول شاخِ لب چھوڑتا ہے اور ایک بار پھر استفہامیہ کی چرخی گھومنے لگی ہے:

سفر نصیب ! نصیب تو منزلے ست کہ نیست؟
جہاں ز پرِ تو سیمالے تو سمن زارے
فروغ داغ تو از جلوہء دلے ست کہ نیست ؟

یہاں بھی بے مائیگی ہے:

سوئے ستارہ رقیبانہ دیدو ہیچ نہ گفت

مخاطب جواب دینے کی بجائے ایک ستارے کی طرف دیکھنے لگتا ہے گویا سوال باریاب نہیں ہوسکا۔ مانگے تانگے کی روشنی پر جینے والا بھلا دل ایسی نعمت غیر مرقبہ کا حامل کیسے ہوسکتا ہے دل تو خودی شعور اور عشق کا آفرینده ہے اور عشق کی بے کنارا قلیم میں عطا ہی عطا

ہے دین ہی دین ہے یہاں تقاضا نہیں ہار سکتا خودی کے چراغ میں ذات پر فروغ رہتی ہے اور شعور اس کی سرحدوں پر چوکس نگہبان کی طرح حرص و ہوس کی ہواؤں کو روکے رکھتا ہے یقیناً مہتاب کے داغ مفلسی، ذات اور بے بساطیء شعور کے باعث ہیں یوں بھی چاند پر کہنے سننے کی رسم نہیں سو بات خلاؤں میں سر مارتی پھرتی ہے۔

بھڑک فزود ہوگئی ہے اور شعور انتہائی شکل میں ڈھلنے لگا ہے جنوں اقبال کے یہاں شعور کی مصفا صورت ہے (Superconscious) لیکن عشق کے تابع ایک جوہر اگلی منزلوں میں زمین کی کشش اور کم ہوگئی ہے اور قریۂ مہتاب سے سفری کے قدرم خود بخود اوپر اٹھنے لگے ہیں وہ انتہائے عرش تک جا پہنچتا ہے اور خود کو یزداں کے عین سامنے پاتا ہے، یہاں زماں و مکاں کا کوئی تصور نہیں ہر طرف گھمبیرتا ہے مرگ آثار خامشی۔ بڑا سوال اور بڑا سخن تنہائی میں جنم لیتا ہے اور سناٹے میں پرورش ہوتا ہے سو اپنی بات کہنے کا اس سے بہتر موقع اور کیا ہوسکتا ہے! استفسار کی پھوار دامن یزداں پر جا پڑتی ہے:

کہ در جہاں تو یک ذرہ آشنا یم نیست
جہاں تہی زدل و مشت خاک من ہمہ دل
چمن خوش است ولے در خورِ نو ایم نیست

فنکار کی خود اعتمادی فزوں تر ہے اوہ آنکھوں میں آنکھیں ڈالے صناعِ ازل سے مخاطب ہے اور اس کی یہ خود اعتمادی ''ایاغ آفریدم'' اور ''چراغ آفریدم'' کے فخر سے مملو بھی۔ حقیقت عظمیٰ سے آنکھیں چار کرنا کسی ژولیدہ مو اور سر بہ زانو فنکار کا کام نہیں۔ یہاں تو ہمت مردانہ چاہیے جو اپنے جنوں میں یزداں پر کمند سوال پھینک سکے۔ اب کے کچھ تغیر ضرور رونما ہوگا مگر اتنا کہ نظم زمیں سے آسمان کی آخری حد تک آ پہنچی ہے یہاں سے آگے کچھ نہیں بس خندہء یزدان کی ایک جھلماتی لکیر ہے اسے اتھاہ سوال کی جواب میں خندہ موہوم کیا معنی رکھتا ہے!

معنیٰ کے امکانی علاقوں تک رسائی ہی اصیل نقد ادب کا بنیادی فریضہ ہے جس سے عہدہ برآئی کے لئے متن کی پنہائیوں میں اترنا پڑتا ہے۔ ایک متن خارجی عوامل کی قبولی میں بہت زیادہ سخی نہیں ہوتا کہ ہر قسم کے مباحث کو اپنے دامن میں سمیٹ سکے گو کہ ان سے کچھ نہ کچھ مدد ضرور مل جاتی ہے تفہیم کے سارے نکات زیریں سطح پر متن کے اندر ہی کہیں موجود

ہوتے ہیں اگر ناقد فنکار کے درجہ احساس اور مرتبہ شعور پر ہونا بنیادی شرط ہے نقد ادب احساس شعور اور شعور احساس کا مضمون ہے ساختوں کی تعمیر میں لفظ اور فقرے خود کفالت کے مرتبے سے اتر کر یوں باہم پیوست ہو جاتے ہیں کہ حتمی معنی کا جبر حدود متن سے خارج ہو جاتا ہے۔دراصل ناکشودہ ساختوں کی پرتیں کھولنا ہی معنی یابی کا واحد اور معتبر رستہ ہے بدقسمتی سے اردو تنقید میں فن پارے پر اپنے معنی جاری کرنے کی روایت بہت عام ہے جو نقد ادب کے متوازی کوئی شے تو ہو سکتی ہے لیکن تنقید سے اس کا کوئی علاقہ نہیں معنی ایک عرصہ تک بحروں کی صورت میں متن کے ناپیدا کنار سمندر میں ڈوبے رہتے ہیں لہذا آس پاس کے چھوٹے چھوٹے جزیروں پر بیٹھ کر اس سے متعلق کوئی رائے قائم کرنا نسبتاً آسان کام ہے جبکہ ایک صاحب جوہر ناقد نامعلوم بحروں تک رسائی کے بار بار شناوری کرتا ہے یہی محسوس کو معلوم میں ڈھالنے کا عمل ہے۔اس تنقید سے کیا حاصل جو شاہکار ادب پاروں کو بھی البتہ و تاہم کی بھول بھلیاں میں گم کر دے ہمارے کلاسیکی فنکار ایک مدت سے ناقدین کے اسی قبضہء غاصبانہ کا شکار چلے آتے ہیں سو اقبال کے فارسی تو الگ اردو کمالات ہی ابھی پوری طرح دید نہیں اپنے ادبی ورثے سے یہ تعلو ہماری تنقید کا منہ چڑاتا ہے۔

اس جملۂ معترضہ کی ترتیب میں سوائے اس کے کوئی امر داخل نہیں کہ ایک شہ پارے کی تخلیقی تفہیم میں بہت سارے علمی عناصر کے علاوہ ایک خاص قسم کی دراکی بھی کام آتی ہے جو فنکار کے وجدان میں اُتر سکے منطقی انجام تک پہنچ کر تمام ہونے والی اکثر نئی اور پرانی نظموں کے برخلاف اقبال کی نظم ''تنہائی'' کسی نتیجے کے بغیر ختم ہو جاتی ہے اب یہ ایک ناقد کا فریضہ ہے کہ وہ یزداں کے تبسم کی کیا تفسیر کرے اور یہیں پانی مرتا ہے۔ایک ممکنہ تعبیر تو یہ کے مظاہرہ و مخلوقات میں سے کوئی بھی اس مقام تک نہیں پہنچ سکتا جہاں حضرت انسان کے قدم جا ٹکے ہیں سو دل رکھنے کا ثمر حقیقت تک رسائی کے سوا کیا ہو سکتا ہے لیکن یہاں ایک اور سوال اُٹھتا ہے کہ کہیں خود یزداں تو تنہائی کا شکار نہیں اگر ایسا ہے تو کیا اس کی تنہائی کوئی وجودی حیثیت رکھتی ہے؟ مگر یزداں تو وجود کے جھمیلوں سے ماورا تصور ہے دوسرے یہ کہ مظاہر فطرت سے جواب نہ ملنے پر اتنا لمبا سفر صاحب سوال کو کیا دیتا ہے یقیناً اس کا مقصود محض تبسم نہ رہا ہو گا بھلے اس کے کتنے ہی مفہوم کیوں نہ ہوں فطرت سے اقبال کا تعلق Words

worth کے تصور فطرت سے بہت فاصلے پر واقع ہے کہ ان کی یہ نظم وحدت الشہود سے انکار کرتی ہے خندہ ء یزداں میں جرأت انسان اور اس کی معراج فکر کی داد بھی ہے اور اپنی تنہائی کا اشارہ بھی کائنات لامحدود میں مظاہر کے ساتھ کروڑوں برس گزارنے کے باوجود انسان فطرت سے ہم آہنگ نہیں ہو سکا اور شعور اسے ایک متوازی کائنات تخلیق کرنے پر ہمہ وقت اکساتا رہتا ہے۔

ایک فنی سطح پر اقبال کی نظم انوکھی چھب دکھاتی ہے ہر بند پانچ مصرعوں پر مشتمل ہے ۔ پہلا مصرع چار مصرے نفس مضمون کے تقاضے کے طور پر بلند آہنگ ہیں جبکہ ہر بند کا آخری مصرع ایک غنودہ و خوابیدہ لے کا حامل ہے جس میں لہر، پہاڑ اور چاند کی ہیچ مدانی پوری کیفت کے ساتھ منعکس ہوتی ہے آخری مصرع صوتی لحاظ سے بھی شکستہ و خستہ، اور واماندہ نوع کا تصور ابھارتا ہے۔ نظم کے چاروں بند اسی تقسیم پر قائم ہیں ۔

سارتر سے مرعوب ہو کر انسان کے جوہر کی داد نہ دینا اقبال ایسے رجائی اور کامل فنکار کی طریقت نہیں ان کے نزدیک زندگی دکھ اور سکھ سے زیادہ پیہم تگ و تاز اور سرمستی ء عشق سے عبارت ہے منزل کا لطف اپنی جگہ لیکن مسافت کی دلکشی ہی درحقیت تخلیقی فنکار کی کمائی ہے ۔ تخلیق سے زیادہ تخلیقی عمل سے سروکار رکھنے میں یہ نقطۂ پنہاں ہے کہ کامیابی اور ناکامی ضمنی و ذیلی معاملات ہیں ۔سفر ہی دائمی ہے اور اقبال فلسفی کے نتیجہ نکالنے سے زیادہ مراحل فکر سے شغف رکھتے ہیں اور یہی فلسفیانہ روش ہے۔

نظم کی پیش کردہ تعبیر سے یہ مراد نہیں کہ یہ ایک فن پارہ کے سلسلہ میں حتمی کوشش ہے۔ ہم اپنی کاوشیں بروئے کار لا کر اپنے تہذیبی ورثے سے اتنا کچھ سیکھ سکتے ہیں جو بیان سے باہر ہے ایک زمانہ تھا جب حلقہ اربابِ ذوق میں تنقید کے لئے پیش کے جانے والی تخلیقات کو ناقد ایسے دیکھتا تھا جسے احمد شاہ ابدالی کی طرف۔ ہم جب تک اپنے کلاسیکی اور معاصر ادب کو دیانتداری تنقیدی نظروں سے نہیں پرکھیں گے حال و استقبال کے امید افزا دریچے ہم پر وا نہ ہو گے۔

شناخت کا مسئلہ

یاسر جواد

کچھ لوگوں کا یہ خیال درست معلوم نہیں ہوتا کہ منٹو کا کُرتا پائجامہ اتار کر شلوار قمیض پہنانے کی کوشش سے منٹو کا کچھ بھی بگڑنے والا نہیں، کہ منٹو تو منٹو ہے، کہ پاکستانی یا ہندوستانی ہونے کے سوال کا جواب تو شاید منٹو اردو زبان میں اور انسانوں کے بارے میں لکھتا ہے۔ کچھ کا یہ بھی کہنا ہے کہ اردو جس جس ملک کی سرکاری زبان ہے منٹو اس ملک کا ادیب مانا جانا چاہیے۔ یہ تمام آرا اور جن آرا کے جواب میں یہ پیش کی جاتی ہے، شناخت، قومیت اور لسانی گروہ بندی کی ایسی فرسودہ روایات پر منحصر ہیں جن کا آج کے مائع شناختوں کے دور میں کوئی جواز نہیں رہا۔ ان کی حیثیت اب نعروں سے زیادہ کچھ نہیں اور یہ صرف پاکستان جیسے کچھ پسماندہ ممالک میں ہی ملتی ہے جہاں کی نظریاتی عمارت انیسویں صدی کے آخری عشروں کی فاشسٹ قومی ذہنیت پر کھڑی ہے۔ یعنی ہماری ریاستی فکری تہہ میں غیر استدلالی سوچ مضمر ہے اس مضمون میں میرا مقصد یہ دکھانے کی کوشش کرنا ہے کہ اوپر مذکور اور ان کے برعکس آرا نہ تو تاریخی حوالے سے دُرست ہیں اور نہ یہ موجودہ و آئندہ کی دنیا میں ہمیں کوئی چہرہ دے سکتی ہیں ۔نیز میں یہ بحث بھی چھیڑنا چاہتا ہوں کہ کیا مابعد جدیدیت صرف ایک ادبی مفہوم رکھتی ہے یا اس کا کوئی شناختی و سیاسی پہلو بھی ہے؟ مجھے تو یہ اسی طرح سیاسی و معاشی حالات کا عکس معلوم ہوتی ہے (نہ کہ اس کے برعکس) جیسے جدیدیت اور ساختیت مشینی دور کی پیداوار تھی۔

88ء یا 89ء کا واقعہ ہے جب میں نے ریلوے سٹیڈیم، گڑھی شاہو لاہور میں منعقد کیے گئے فیض امن میلے میں ہزاروں افراد کی طرح شرکت کی تھی۔ ایک بہت بڑا اور اُونچا سٹیج، اردگرد لگے سٹالوں پر بکتے ہوئے فیض کے پوسٹرز، یادگاری پلیٹس اور دیگر سووینیرز،

ہزاروں سر، سرخ پرچم اور پھریرے، ''چھوچھلوم آوے ای آوے'' کے نعرے ڈھول کی آواز...... پھر 97ء یا98ء میں یہ میلہ جناح باغ لاہور میں منعقد کیا گیا اور جگہ نسبتاً محدود ہونے کے باوجود رنگ ترنگ کافی حد تک قائم تھا لیکن جوبن مندمل ہو چکا تھا۔ پھر اب سے کوئی دو تین سال قبل الحمرا آرٹ سنٹر کے ایک ہال میں فیض ''میلے'' کو سنا اس سے اگلا مرحلہ اکادمی ادبیات لاہور کے دفتر (واقع ماڈل ٹاؤن) میں محترم قاضی جاوید کی اہتمام کردہ محفل ''فیض کی یاد'' میں تیس چالیس افراد کے ایک ''فنکشن'' میں بیٹھنے کا موقعہ ملا۔ پروگرام کے آخر میں شعیب ہاشمی نے ہمیشہ کی طرح ''ربا سچیا توں تے آکھیا سی'' پیش کی اور پھر مختصر سوال و جواب ہوئے جن کا مقصد فیض اور شعیب کی بے تکلفی کا اظہار کرنا تھا میں نے بھی ایک سوال کی جسارت کی کہ ''فیض کو ریلوے سٹیڈیم سے جناح باغ، جناح باغ سے الحمرا ہال اور الحمرا ہال سے اکادمی ادبیات کے چھوٹے سے کمرے، اور حتیٰ کہ ٹی وی تک محدود کرتے جانے کا اُلٹا عمل کیسے ہو گیا اور آپ کے خیال میں یہ کس نے کیا؟'' شعیب نے کچھ بل ماتھے پہ ڈال کر جواب دیا ''بھائی فیض تو عوام کی ملکیت ہے وہ اسے جہاں چاہیں لے جائیں'' میں دوبارہ کچھ کہنے لگا تو روک دیا گیا۔ خیر چائے کے بعد سیڑھیاں اترتے وقت شعیب نے مجھے دیکھا اور قریب سے گزرتے ہوئے فرمانے لگے ''بھائی ہم تو مجاور ہیں'' اور پھر پہلے والی بات دہرائی میں نے بس اتنا ہی کہا کہ تبھی تو فیض کو اوقاف کے ماتحت دے دیا گیا ہے اور چندہ............'' وہ گاڑی میں بیٹھ کر چلے گئے۔

میرے خیال میں (فتح محمد صاحب اور ان جیسے دیگر دانشوروں کے طفیل) فیض کا اتنا کچھ بگاڑ دیا گیا ہے کہ وہ اب پہچانا نہیں جاتا...... حال ہی میں فیض کو اقبال جیسا ہی سوشلسٹ بنا کر پیش کرنے اور اس اسٹیبلشمنٹ میں منظوری دلوانے کی کوششیں شروع ہوئی ہیں ...... اور منٹو کی باری کئی بار آئی ہے۔ بہر حال ایسا پاکستان کی تاریخ میں ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔ پنجابی کے شاعر اور ملامتی صوفی شاہ حسین کے ساتھ بھی یہی کیا گیا۔ تحقیقات چشتی (1867ء) کے مطابق شاہ حسین کے مزار پر دو میلے ہوا کرتے تھے ایک میلہ چراغاں اور دوسرا بسنت کا میلہ۔ وہ لکھتے ہیں ''امرتسر سے بسواری ریل ساٹھ ستر ہزار آدمی تخمیناً شریک جلسہ چراغاں ہوتا ہے اور سواران یکہ و پیدل و بگھی و اونٹ وغیرہ ریل سے علیحدہ آتے ہیں اور

خرید وفروخت اشیائے حلوائیاں کا کیا خیال کیا جاوے...... چراغوں کے میلے کا تو حال یہ ہے
کہ کئی میلوں سے ہزارہا مخلوقات بامیل تمام مائل زیارت ہو کر آتے ہیں اور باوجود اس قدر
وسعت باغ شالا مار کے وہاں قدم رکھنے کی جگہ اس روز نہیں رہتی ۔ سبحان اللہ اس روز
وہاں دیدہ" دوسری طرف داتا علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ المعروف داتا صاحب کے عرس کا بھی ملاحظہ ہو
عرس حضرت کا بتاریخ 20ویں ماہ صفر کے ہوتا ہے اور ایک میلہ روز آخری چارشنبہ لگتا ہے۔ مگر
اس روز مجلس ہوتی ہے اور دو عرس ہوتے ہیں ایک چھوٹا اور ایک بڑا۔ اس میں نان وحلوہ ودال
ونخو مع گوشت تقسیم ہوتے ہیں اور خادم لوگ نذریں چڑھاتے ہیں اور بعضوں کو دستاریں بھی
عنائیت ہوتی ہیں"۔ 1911ء میں شائع ہونے والی تین جلدوں پر مشتمل کتاب Tribes
and Castes of punjab and N.W.F.P" (از ای ڈی میکلیگن) میں تو
داتا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے عرس کا اس سے بھی کم ذکر ملتا ہے۔

قائم الدماغ بڑے بوڑھوں سے بھی سنا ہے کہ جتنا بڑا آج داتا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا
میلہ ہوتا ہے اتنا شاہ حسین کا ہوا کرتا تھا اور جتنا آج شاہ حسین رحمۃ اللہ علیہ کا ہے اس سے بھی کم داتا
صاحب کا تھا۔ شاہ حسین اینٹی اسٹبلشمنٹ تھے جو مغل راج کے خلاف عوام دکھ اور غصے کا شعری
اظہار کرتے تھے جبکہ داتا صاحب رحمۃ اللہ علیہ شرع شریعت کے پابند اسٹبلشمنٹ کے ساتھ مل کر چلنے
والے تھے۔ اب شاید واضح ہوجائے کے بے نظیر ہو یا نواز شریف، مشرف ہو یا غلام اسحٰق
خان، سب نے داتا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دربار پر کیوں حاضری دی۔ اور اب ہر غاصب حکمران
کے لئے حکومت حاصل کرنے کے بعد دربار پر حاضری دینا معمول کیوں بن کر رہ گیا ہے۔
ریاست اور بیوروکریسی نے ہمیشہ انہی اولیاؑ او رشعرا کرام کو اپنایا جو ان کے سامنے ہاتھ
باندھے کھڑے رہتے ہیں اور دوسروں کو بھی اپنی پیروی کرنے کی تبلیغ کرتے ہیں ۔ بلھے شاہ
اور وارث شاہ جیسے دیگر مہان لوک شاعروں کا حال بھی کم وبیش شاہ حسین جیسا کیا گیا۔

ایسا کرنے کی تہہ میں خود کو اپنے من پسند یا فائدہ مند نظریات اور شخصیات سے
جوڑنا ہے البتہ کچھ شخصیات اتنی بڑی ہوتی ہیں (جیسا کے منٹو) کہ انہیں قابل قبول بنانے کی
خاطر توڑنا موڑنا یا مسخ کرنا پڑتا ہے۔ نیز ہم لوگ اپنے سے مختلف کوئی بھی چیز برداشت کرنے
کو تیار نہیں ۔ ہمارے اندر ایک انجانا خوف چھپا بیٹھا ہے جو ہم سے مختلف ہے وہ ہمارا نہیں ۔

چاہے یہ اختلاف مذہب کی سطح پر ہو یا نظریے کے معاملے ہیں یہ مسئلہ ایک زیادہ بڑے مسئلے کے ساتھ مربوط ہے شناخت کا مسئلہ۔ آج کا انسان بحیثیت مجموعی اس نئے مسئلے سے نبرآزما ہے گلوبلائزیشن کا مطلب ہے کہ ریاست اور تصور قوم کا ماضی میں لازم وملزوم سمجھا جانے والا 'مقدس' بندھن اب ڈھیلا پڑ گیا ہے۔ ریاست اب قومی شناخت میں دلچسپی نہیں رکھتی یا ایسا کرنے پر قادر نہیں رہی۔ پیپسی کے پاکستانی اشتہار میں فاسٹ باؤلر شعیب ہے تو انڈین اشتہار میں ٹنڈولکر۔ ایک ہی کمپنی دوملکوں میں متعلقہ قوم پرست کرکٹ کی اشاعت کرتی ہے۔ ہندی فیچر فلم کو ہم اردو فلم کہتے ہیں انڈین فلمی گانوں پر ہمارے ہاں نعتیں پڑھی جاتی ہیں (اور نعت کے بعد یہ تک نہیں بتایا جاتا کہ اس کی طرز آنند بخشی نے بنائی یا لکشمی کانت پیارے لال نے)۔ ہندوستان کا قومی ترانہ علامہ اقبال نے لکھا اور بندے ماترم رابندر سنگھ ٹیگور نے۔ پاکستان کا قومی ترانہ جالندھر کے حفیظ کی تخلیق ہے پاکستان نے سیاسی بنیادوں میں آنے کے بعد اپنی شناخت کے کئی رُکے مسئلوں سے نمٹنے کی کوشش کی اور اس کی خاطر ایک "شناخت ایجاد کرنا چاہی۔ جھنڈے میں سبز رنگ اور اسلامی چاند ستارہ شامل ہے قومی شاعر اقبال کو مانا گیا ہے جو مسولینی، کارل مارکس، ٹیگور، ہمالہ اور ہندوستان کے علاوہ نطشے کے سپر مین عرف مرد مومن کا ملغوبہ ہیں۔

درحقیقت "شناخت" ایک دریافت کردہ چیز کی بجائے ایجاد کردہ چیز کے طور پر ہی ہم پر آشکار ہوتی ہے ایک کوشش کے ہدف کے طور ایک مقصد ایک ایسی چیز کی حیثیت میں جو ہمیں بالکل نئے سرے سے تعمیر کرنا پڑتی ہے یا متبادل راستوں میں سے منتخب کرنا پڑتی ہے اس کے بعد ہم اسے محفوظ رکھنے کے لئے اور بھی زیادہ کوشش کرتے ہیں۔ شناخت کے دائمی عبوری حیثیت اور کمزوری اب چھپائی نہیں جاسکتی۔ بھانڈا پھوٹ گیا ہے۔ لیکن یہ ایک بالکل نئی اور بالکل حالیہ ترقی ہے۔ اس شناخت کے لیبل کو قائم رکھنے کی فاشسٹ کوششیں ہمیں کوئی بھی نئی یا پرانی 'مختلف' چیز قبول کرنے کے قابل نہیں رہنے دیں گی۔ ولہلم رائخ نے ہمیں سمجھایا ہے کہ "فاشزم اپنی خالص ترین صورت میں اوسط انسانی کردار کے غیر منطقی ری ایکشنز کا مجموعہ ہے۔ اور فاشٹ ذہنیت بالشتیوں کی ذہنیت ہے ....."

شناخت کا مسئلہ تبھی پیدا ہوتا ہے جب اس کا 'بحران' ہو۔ اگر آپ میری شناخت

کو مسترد کریں تو مجھے اپنی شناخت کے متعلق پوچھنے کا خیال پوچھنے کا خیال تک نہیں آئے گا؛ اور اگر مجھ سے پوچھیں تو مجھے یہ معلوم نہیں ہو گا کہ آپ مجھ سے کس قسم کے جواب کی توقع رکھتے ہیں۔

لیکن زبردستی لاگو کی شناختیں موجودہ گلوبلائزیشن کے عہد میں محو یا بے معنی ہونے لگی ہیں۔ ہم مائع شناختوں کے دور میں رہ رہے ہیں۔ہم ایک طرف اپنے شہر، خطے،صوبے،ملک ،برصغیر،جنوبی ایشیا،براعظم ایشیا اور حتیٰ کہ مشرق کے رہنے والے بھی ہیں۔ دوسری طرف ہماری مذہبی شناختوں کا سلسلہ ہے،مثلاً سنی،وہابی یا بریلوی،قادری یا نقشبندی،وغیرہ۔شناختوں کا تیسرا پہلو معاشرتی ہے جن میں ذات اور قبیلے کا نظام بنیادی اکائی ہے۔اگر ہم اپنے نام کے ساتھ ملک لگاتے ہیں۔کہ لاہور میں ہر شتربان کو ملک کہا جاتا تھا۔نیز یہ کھتریوں کا ایک لقب تھا۔

ان میں سے کسی ایک پہلو میں بھی کسی ایک شناخت کو ''ثابت'' کرنے کے لیے ہمیں دوسری شناختوں کو رد یا کم از کم نظرانداز ضرور کرنا پڑتا ہے۔اگر آپ سب سے پہلے لاہوری یا پنجابی اور آخر میں پاکستانی ہیں تو ملک کی ''سلامتی'' خطرے میں پڑسکتی ہے۔اگر آپ سب سے پہلے پاکستانی اور آخر میں پنجابی ہیں تو ایک بحران سے دوچار ہو جاتے ہیں۔اس بحران سے نمٹنے کی خاطر ریاست نے اپنی ساری تاریخ کے دوران فاشٹ بنیادوں پر دوقومی نظریہ اور تصور مردمومن کا پرچار کرنے اور اس کا اقبال کروانے کی پالیسی اپنائی۔اس مقصد کے تحت اقبال اور منٹو جیسوں کی بھی قطع وبرید کی گئی۔مذہب اور علاقہ رہائش کی بنیاد پر اپنے شعراء و ادیب اور ''فلسفی'' چنے گئے۔قیام پاکستان سے پہلے کا اقبال ''ہمارا'' بنا (اور اس ''ہمارا'' میں مشرقی پاکستان بھی شامل تھا)۔''ہم'' نے غالب کو لے لیا مگر پی ٹی وی کے ڈرامے میں اسے پرہیزگار اور مسلمان صورت میں پیش کیا کیونکہ وہ اتنا بڑا اور اردو کا شاعر اور اسد اللہ تھا کہ نظرانداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔راجندر سنگھ بیدی اور کرشن چندر کے ناموں نے ان کی شناخت کی چغلی کھائی اور وہ مسترد ہوئے۔

اس کے علاوہ دیگر فنون کے شعبہ میں بھی ایسی ہی کاروائی کی گئی۔منٹو نے عمر کا زیادہ حصہ امرتسر میں گزارا مگر تقسیم ہند کے بعد لاہور میں آٹھ برس کی زندگی گزارنے کی وجہ

سے پاکستانی کہلانے کا مستحق قرار پایا۔ دوسری طرف گلوکار محمد رفیع لاہور میں تقریباً پچیس سال زندگی گزار کر ہندوستان کا ہو گیا۔ یہی معاملہ بھیرہ (ضلع سرگودھا) کے ادیب بھیشم ساہنی اور اس کے اداکار بھائی بلراج ساہنی کا تھا۔ وہ بھی "ہمارے" نہ بن سکے اسی طرح گوجرانوالہ کی امرتا پریتم، دینے کا گلزار، لاہور کی اجیت کور اور سرگودھا کا خوشونت سنگھ بھی مسترد ہوئے۔ اور تو اور نوبیل انعام یافتہ طبعیات دان ڈاکٹر عبدالسلام بھی اپنے مذہبی عقائد کی وجہ سے مردود ٹھہرا۔ ہم نے فاشٹ بنیادوں پر اسلام، اردو اور علاقائیت کے نہایت تنگ دائرے بنائے۔ ختنوں، سرکاری دفتری زبان اور جائے پیدائش کے یہ اصول ایک ادھوری شناخت قائم کرنے میں ہی کامیاب ہو سکے جواب مندمل ہونے لگی ہے کیونکہ من موہن سنگھ کا وطن جہلم میں اور پرویز مشرف کا دہلی میں ہے۔

منٹو کو مخلص پاکستانی اور تقسیم ہند کا مبلغ "ثابت" کرنے کی کوشش گزشتہ پچاس سال سے چلی آ رہی کوششوں کا تسلسل ہے یہ آؤٹ ڈیٹڈ تو ضرور ہو گئی ہے لیکن اس کی مضرت رسانی ہنوز قائم ہے۔ وہ یہ سوچنے اور ماننے سے قاصر ہیں کہ زبانیں محض ذریعہ اظہار ہیں اور ملکی حدود اور جذبہ وطنیت محض ریاستی مفادات کے تحفظ کے لئے ہوتی ہے کیا کسی نے کبھی یہ سوال کیا ہے کہ فرانز کافکا چیک زبان اور ملک کا ادیب ہے یا جرمن کا؟ اور کیا سبھی لوگ جانتے ہیں "Waiting for Godot" کا خالق شاعر، ناول نگار، ڈرامہ نویس سیموئل بیکٹ (89ء1906ء) آئرش النسل تھا اور یہ ڈرامہ پہلی بار 1952ء میں فرانسیسی زبان میں شائع ہوا اور دو سال بعد اس کا انگریزی ترجمہ منظر عام پر آیا (جو بیکٹ نے خود کیا تھا)؟ ہم کبھی سوال نہیں کریں گے کہ بیکٹ آئرش تھا، انگلش یا فرانسیسی؟

1953ء کے بعد اس نے انگلش اور فرانسیسی دونوں زبانوں میں لکھا۔ 67 کے بعد اس نے جرمنی اور فرانس میں بھی اپنے ڈرامے پروڈیوس کئے ہم اسے بس بیسویں صدی کا موثر ترین اور نہایت جدت طراز ڈرامہ نگار ہی مانتے ہیں۔

ہمیں یہ پتا چلا ہے کہ وطنیت یا شناخت کوئی چٹان سے تراشی ہوئی چیزیں نہیں، کہ ان کے تاحیات محفوظ رہنے کی کوئی ضمانت موجود نہیں، کہ وہ قابل مصالحت اور قابل تنسیخ ہیں اور یہ کہ ہمارے اپنے فیصلے، اقدامات، انداز ہائے عمال اور ان سب پر قائم رہنے کا عزم......

دونوں کے اہم و بنیادی عناصر ہیں ۔ہم سے کسی بھی وقت سوال کیا جا سکتا ہے کہ "آپ کون ہیں؟" ہمیں ہر وقت اس کا ایک موزوں، مدلل اور متوازن جواب دینے کے لئے تیار رہنا پڑتا ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ جڑیں کٹنے کے بعد ہم کہیں بھی دوبارہ نشوونما پانے کے قابل نہیں رہے۔

ہماری جڑیں کہاں تھیں؟ اس کے جواب میں کچھ سوال ہی پیش کیے جا سکتے ہیں جن کے جواب ہم سب کو کسی مثبت تسلسل سے جوڑ سکتے ہیں کہ ہمارا تہذیب ہماری کیوں نہیں اور سلطنت عثمانیہ کیوں ہماری ہے؟ اورنگزیب ہمارے تو رنجیت سنگھ ہمارا کیوں نہیں اگر محمود غزنوی ہمارا ہے تو جے پال ہمارا کیوں نہیں ہو سکتا؟ داتا علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ ہمارے ہیں تو شاہ حسین کیوں بیگانے بن گئے ہیں؟ عید ہماری ہے تو بیساکھی ہماری کیوں نہیں؟ ہم نیل کے ساحل سے لے کرتا بخاک کاشغر تک محیط ہیں تو ستلج کے اس پار کا سب کچھ مسترد کیوں کرتے ہیں؟ بھگت سنگھ ہمارا کیوں نہیں اور ٹیپو سلطان کیوں ہمارا ہے؟

سنا ہے کہ جب سوال کرنے والے بہت سے ہو جائیں تو ان کے منطقی جواب بھی ملنے لگتے ہیں۔

انسان اور کائنات کا مادی تعلق

ڈاکٹر صلاح الدین درویش

انسان اور کائنات پر بحث سے قبل ضروری ہے کہ ہم دونوں متعلقات کا انتہائی اختصار کے ساتھ جائزہ لے لیں۔ کائنات کی تخلیق کے بارے میں مختلف اقوام، مذاہب اور اساطیر میں مختلف روایات اور داستانیں ملتی ہیں۔ لیکن کائنات کی وسعتوں کے پیش نظر جب ہم ان روایات اور داستانوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ تو یہ سب سہولت پسند فکر کی سادگی پر محمول دکھائی دیتی ہیں۔ سائنسی علوم اور ٹیکنالوجی ہی وہ واحد ذریعہ ہے کہ جو اس کی وسعتوں کی دریافت اور پیائشوں کو ممکن بنا سکتا ہے۔ ابھی تک انسان کی دسترس میں کائنات کی تفہیم اتنی ہی ہے، جس قدر کہ انسان نے سائنس اور ٹکینالوجی کے ذریعے ممکن بنایا ہے۔ دوربین کی ایجاد سے لے کر ''ناسا'' کے ہائی ٹیک تحقیقی ادارے تک کے سفر میں عالم انسان نے کائنات کے مطالعہ میں جو پیش رفت کی ہے اسی کائنات کے سربستہ رازوں سے آگاہی کا موثر وسیلہ ہے۔ انسان کا مادی تمدن بھی اسی وسیلے کے باعث فروغ پذیر ہے۔ انسان جتنا زیادہ اس وسیلے سے کائنات کو مسخر کرتا چلا جارہا ہے اُسی قدر وہ انسانی سماج کے تقاضوں کے مطابق انسانی زندگی کے مسائل کے حل کے لیے سائنسی اور ٹکنالوجی کو مادی زندگی میں ترقی کے لیے بھی مسلسل بروئے کار لا رہا ہے۔ پھیلتی ہوئی کائنات اپنے عمل اور تنظیم میں ہمیشہ متحرک اور برقرار رہتی ہے۔ انسانی سماج کے ساتھ اُس کا براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔ انسانی سماج کے ساتھ اُس کا تعلق اُس وقت بنتا ہے جب انسان ایسا چاہتا ہے۔ انسان کائنات یا فطرت کے مقاصد کی تکمیل کے لیے کسی فاعل یا مفعول وجود کی حیثیت نہیں رکھتا۔ بلکہ وہ اپنے وضع کردہ انسانی

مادی تمدن کی ضروریات کے مطابق کائنات کے مادی مظاہرے قوتوں اور قوانین کو علمی اور عملی
سطح پر استعمال میں لاتا ہے۔

کائنات کی تسخیر انسانی سماج کا بنیادی مقصد نہیں ہے بلکہ اصل مقصد انسانی سماج
کی ضرورتوں کے مطابق کائنات کے متوازی اپنا مادی جہان آباد کرنا ہے اسی غرض سے وہ
کائنات کے بعض گوشوں کو مسخر کرنے میں دلچسپی رکھتا ہے۔ یوں کائنات اور انسان کے
درمیان تعلق کی بنیاد "مادیت" پر قائم ہو جاتی ہے۔ انسان اپنے تمدن کے مادی مظاہر کی تعمیر
وتشکیل کے لیے کائنات کے مادی مظاہر کو استعمال میں لاتا ہے۔ سوئی سے لے کر ہوائی جہاز
تک تمدن کے تمام مادی مظاہر اس تعلق کی بنیاد پر وقوع پذیر ہوئے ہیں۔ اس تعلق سے
ماورا کوئی بھی قوت ایسی نہیں ہوتی جو انسان کے اپنے وضع کردہ مادی تمدن پر براہ راست یا
بالواسطہ طور پر اثر انداز ہوتی ہے۔ یہ تعلق فطرت یا کائنات نے انسان کے ساتھ قائم نہیں کیا
بلکہ انسان نے سماج کی ساری ضرورتوں کے پیش نظر کائنات اور فطرت کے ساتھ قائم کیا ہے

کائنات اپنے پھیلاؤ یا مظاہر اور تحرک میں جس سائنسی میکانکیت کو برقرار رکھتی
ہے اُس کے اُصول وقوانین بھی اپنی جگہ قائم رہتے ہیں۔ گویا کائنات اپنے کُل میں ایک عظیم
ترین سائنسی مظہر کی عکاس ہے۔ لیکن انسانی تمدن اس مظہر کے متوازی تمدن کے جن مادی
مظاہر کو تخلیق کرتا ہے وہ ہمیشہ ارتقائی مدارج سے بتدریج گزرتے رہتے ہیں۔ سماج کی مادی
ضرورتوں کے پیش نظر سائنسی دریافتوں تحققات اور انکشافات کا سلسلہ جیسے جیسے وسعت اختیار
کرتا ہے ویسے ویسے تمدن کے مادی مظاہر بھی بہتر سے بہتر معیارات قائم کرتے چلے جاتے
ہیں۔ سائنس کے علم کو اگر فطرت قرار دے دیا جائے کائنات اپنے کل میں ایک فطرت ہے۔
مثال کے طور پر ہم نظام شمسی کو فطرت کا مترادف کہہ سکتے ہیں۔ لیکن ارتقاء پذیر انسانی علم
فطرت کا مترادف نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فطرت کے متصینات کے متوازی ارتقاء
پذیری کا رجحان رکھنے کے باعث خام حالت سے بہتر حالت کی طرف سفر کرتا ہے۔ کائنات
کے تمام مادی مظاہر اکمل ترین سطح کو برقرار رکھتے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس انسانی تمدن کے
مظاہر عملی ارتقاء کے باعث تغیر پذیر رہتے ہیں۔ کائناتی مظاہر میں ہونے والی تبدیلیاں انسانی
اختیار کے باعث پیدا نہیں ہوتیں بلکہ وہ بھی فطرت کے اُصول وقوانین کے تابع ہوتی ہیں

جبکہ آج بھی اپنے تمدنی مقاصد کو ازخود متعین کرتا ہے۔ کہیں انسان فکر وعمل کا محتاج نہیں ہوتا بلکہ وہ عموماً قائم بالذات ہوتا ہے۔ جبکہ انسانی تمدن میں ہر تبدیلی محض انسانی فکر وعمل کی محتاج ہوتی ہے۔ انسان کائنات کا ایک زندہ مظہر تو ہوتا ہے۔ لیکن وہ فطرت کے کسی انتظام کے زیر اثر دیگر موجودات کی طرح اپنے عمل متعین کرنے کا ہرگز پابند نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنی آزاد اور خود مختار حیثیت کا تعین خود کرتا ہے۔ ایسا وہ اپنے اندر موجود کسی فطرت کے باعث نہیں کرتا بلکہ تمدن کے خارجی مظاہر کی تشکیل کے لیے اپنے ارتقاء پذیر فکر وعمل کو بروئے کار لاتا۔ فطرت ارتقاء یافتہ کٹرے اور حتمی سائنسی امتیارات کی حامل ہوتی ہے یہ اپنے کُل کو ان امتیارات کے بغیر تمام نہیں رکھ سکتی جبکہ انسانی جوہر یعنی اسی کے شعور کا کوئی حتمی معیار نہیں ہوتا۔ کائنات اپنے تحرک کے باعث پیدا شدہ تبدیلیوں کے باوجود ارتقایافتہار مکمل ہے۔ لیکن انسانی فکر وعمل کے باعث ارتقاء پذیر ہوتا ہے۔ شہر میں یا انسان کامل کا تصور بھی اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ انسانی فکر وعمل کی لامحدودیت کائنات کی لامحدودیت کے متوازی اپنے آپ کو وسعت دینے کے اہلیت کو ثابت نہ کردے۔ انسان نے اپنی ہمت اور کوشش سے کائنات کو سائنسی علم اور ٹیکنالوجی کے ذریعے دریافت کیا ہے۔ اس کے پیش نظر انسان کو حل کا کوئی بھی تصور غیر سائنسی اور گمراہ کن سمجھا جائے گا۔ نظام کائنات یا فطرت میں خیر وشر نام کی کوئی چیز موجود نہیں ہوتی۔ منفی اور مثبت قوتیں ضرور موجود ہیں لیکن نہ تو منفی قوت بدی کی علامت کرتی ہے اور نہ ہی مثبت قوت نیکی کی علامت ہوتی ہے بلکہ ہر مصنوی اعتبار سے سائنس کی دو اصطلاحات ہیں۔ کائنات کا نظام خیر وشر کے انسانی پیمانوں اور تصورات سے آزاد ہوتا ہے۔ نیکی اور بدی کے تصورات کا تعلق براہ راست انسانی سماج کی تہذیبی زندگی کے ساتھ ہوتا ہے۔ تمدن انسانی سماج کے مادی مظاہر کا مجموعہ ہوتا ہے اور تہذیب اس مجموعی عملی، فکری، تحقیقی، تنقیدی اور تجرباتی احاطے کا نام ہے۔ کائنات کی جبریت کے مقابلے میں انسان اپنی قدرتی قوتوں صلاحیتوں اور قابلیتوں کو تخلیقی سطح پر بروئے کار لانے کے لیے تہذیب کو مسلسل فروغ دیتا ہے۔ گویا تہذیب کو ارتقاء بخشتے ہیں۔ پس انسانیت کے ارتقاء اور بقاء کے لئے انسانی تہذیب وتمدن کا فروغ بنیادی شرط ہے۔ انسانی تہذیب وتمدن کا میعار کیا ہو؟ اس بات کا تعین فطرت کی جبریت کے دائرہ اختیار سے باہر ہے۔ انسان نے خود اپنے اختیار سے

مسلسل تعین کرتے رہتا ہے۔ یہ اختیار سراسر شعوری ہوتا ہے۔ انسانی تہذیب وتمدن کی کوئی بھی سطح ہو وہ انسان کے شعوری انتخاب کا انعکاس ہوتی ہے۔ نیکی اور بدی کا تصور بھی اسی شعوری انتخاب کا لازمہ ہوتا ہے۔ یہ تصور اُصولی اس بات کے ساتھ مشروط ہوتا ہے کہ وہ تمام فکری وعملی اختیارات جو انسانی تہذیب وتمدن شروع کی بجائے تنزلی کا باعث ہو وہ شر کی ذیل میں شمار ہوتے ہیں۔ اور وہ اختیارات جو توازن اور ترقی کا باعث ہوتی خیر کی ذیل آجائے ہیں۔ انسانی اجتماعی جدوجہد کے باعث تہذیبی سطح پر انسان کو ہمیشہ شعور فراہم کرتا رہا ہے۔ کہ تمدن کو بقا کے لئے اخلاقی صوابدید پر قائم نہیں لکھا جاسکتا خواہ افراد کا کوئی گروہ یا جماعت کیسے ہی زبردست اخلاقی نظام کی دعویدار کیوں نہ ہو چنانچہ اخلاقی نظام کی بجائے بتدریج ریاست کے قانونی نظام کو موثر بنایا جانا ضروری سمجھا گیا۔ ریاستیں قوانین تمدن کے ارتقاء کے لیے اجتماعیت کو فروغ دیتے ہیں۔ یہ قوانین اخلاقی تربیت کا ذریعہ بھی نہیں ہوتے بلکہ تمدن کے بقاء کا ذریعے ہوتے ہیں۔ لوگ اخلاقی یا روحانی ضرورت کے پیش نظر ان قوانین کا احترام ضروری نہیں سمجھتے بلکہ اپنے اور اپنے تمدن کی بقاء کے لئے ان پر عمل درآمد ضروری سمجھتے ہیں۔ ہمارے افکاروخیالات کی بعض جہتوں کا تعلق اخلاقیات سے ہوسکتا ہے مثلا انسان کو جھوٹ کی بجائے سچائی کی طرف رغبت ہونی چاہیے، جھوٹ یا سچ کی طرف رغبت کا پیانہ عملی زندگی میں اُن سے پیدا شدہ نتائج اور اُن کے معاشرے پر مرتب ہونے والے اثرات کا شعور ہے۔ تو پھر جھوٹ یا سچ اپنی عملی سطح پر اخلاقی مسئلہ نہیں رہ جاتا بلکہ سیاسی سماجی اور معاشی مسئلہ بن جا تا ہے۔ ہمارے سیاسی سماجی اور معاشی مسائل جھوٹ یا سچائی کے حوالے سے فرد کی داخلی اخلاقی ترجیح کے تابع نہیں ہوتے اس کے لیے تمدن کے خارجی کوائف کے حساب حال یکساں معیارات ہی کو موثر سیاسی، سماجی یا معاشی قوانین کی شکل دی جاتی ہے۔ یہ قوانین بھی مسلمہ یا حتمی نہیں ہوتے۔ تہذیبی وتمدنی ترقی کے لیے ساتھ ساتھ ترقی پذیر رہتے ہیں۔ ریاست کے سیاسی، سماجی اور معاشی زندگی سے متعلق قوانین بھی اسی حد پر ترقی یافتہ ہوتے ہیں۔ ان قوانین کے اجتماعی تحفظات کے بغیر افراد کی نجی زندگیوں کے معاملات کر بھی تحفظ حاصل ہونا ناممکن ہو تا ہے۔ کائنات میں انسانی زندگی کی بقاء کے لیے انسان کی خارجی زندگی میں فروغ پذیر انسانی تمدن کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

انسان کائنات کے دیگر مظاہر کی طرح بہ عین کوئی فطری وجود نہیں ہے۔ فطری وجود کی بقاء کا مسئلہ کائنات میں موجود اُس کی فطرت سے ہم آہنگ فطرت کے معروضی انتظام کے سپرد ہوتا ہے۔ چاہے تو فطرت اس وجود کی نگہبانی کرلے اور چاہے تو اسے فنا کر دے۔ جمادات پر یہ اُصول زیادہ صادق ہوتا ہے۔ تاہم نباتات اور انسان کے علاوہ دیگر حیوانی مخلوقات کی بقاء کا تعلق بھی اسی اُصول سے کافی حد تک ہوتا ہے۔ جانداروں کی گروہی زندگیوں کا اپنی محدود اور پست جسمانی ساخت کے باعث تحفظ فطری ماحول پر زیادہ انحصار کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ ایسی حیاتی دنیا فطری انتظام کی زیادہ محتاجی کے باعث اپنی گروہی زندگی کو ایک حد سے آگے ترقی دینے سے محروم رہتی ہے۔ گویا حیوانی وجود کسی فطری ماحول میں فطری زندگی گزارنے کا پابند ہوتا ہے۔ وہ فطری ماحول کے متوازی اپنا خود کے ساختہ یا مصنوعہ ماحول تخلیق کرنے کی بہت معمولی درثے کی اہلیت رکھتا ہے۔ کیونکہ مصنوعہ ماحول اُس بقاء کے لیے ایک بڑا خطرہ بن سکتا ہے۔ اُس کی فطرت اور ماحولی فطرت ایک جان دو قالب رہتی ہے۔ ایک دوسرے پر انحصار لازم وملزوم ہوتا ہے۔ انسان بھی ایک حیاتیاتی وجود ہے لیکن دیگر جانداروں کے برعکس یہ اپنی گروہی یا سماجی زندگی میں فطرت کی نوازشات کے ساتھ ساتھ اپنی خودساختہ اور مصنوعہ اشیاء اور ماحول کو تخلیق کرنے کی اہلیت کو نا صرف بڑھاتا رہتا ہے بلکہ اپنے اس نو بہ نو ماحول اور اشیاء کے لیے اپنی حیاتیاتی موافقت کو بھی مسلسل تبدیل کرتا رہتا ہے۔ جہاں تک تخلیق کائنات کا سوال ہے تو ظاہر ہے کہ انسان اور انسانی تہذیب وتمدن کے ارتقاء کے مقابلے میں سر دست لامحدود حد تک قدیم ہے۔ اس کی قدامت کے مقابلے میں ابھی عالم انسان کی امکانی وسعتیں بہت خام حالت میں ہیں اور مسلسل ارتقاء پذیر ہیں۔ انسانی علم اور فکر کی دنیا اگر چہ لامحدود ہے۔ لیکن ہے اگر وہ خود اپنے آپ کو نابود کرنے کے درپے نہ ہوجائے تو وہ یقنا کائنات کی لامحدودیت کے مقابلے میں اپنے فکر وعمل کی حدود کو وسیع تر کرنے میں کامیاب بھی ہوسکتا ہے۔ پس جب تک انسانی فکروعمل کائناتی لامحدودیت کے مقابلے میں وسیع نہیں کرلیتا وہ تخلیق کائنات سے متعلق بنیادی سوال کی کھوج سے محروم رہے گا۔

اگر اس سوال کو زیادہ منطقی اور سائنسی انداز میں سمجھنے کی کوشش کی جائے تو اس کا جواب یہ ہے کہ انسان ابھی جس مرحلے پر ہے وہاں بنیادی مسئلہ خالق کائنات کا نہیں ہے بلکہ تخلیق شدہ کا

ئنات کی بے حد وشمار شکلوں پرتوں اور جہتوں کو سائنس اور ٹیکنالوجی کے مادی علم کی بدولت سمجھنے کا ہے۔انسان اس جانب محوسفر بھی ہے۔نماز کی کنج میں ٹھٹھرتے انسان کے کائنات کے بارے میں علم اور گمان اور عصر حاضر کے انسان کے کائنات کے بارے میں جانکاری کے علم میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔آئندہ دو ہزار سالوں میں انسان اس کائنات کے بارے میں کیا کچھ نہ جان لے گا۔اس کا اندازہ موجودہ انسان کی مادی ترقی کی بنیاد پر لگایا جا سکتا ہے۔ انسان کی تہذیبی وتمدنی سطح پر مادی ترقی پر وہ واحد اساس ہے۔کہ جس کے ذریعے کائنات کے مادی مظاہر،قوانین اور قوتوں کوتاحال دریافت کیا گیا ہے اور اسی کے ذریعے آئندہ بھی دریافت کا سلسلہ جاری رہے گا۔اگر چہ اب بھی بہت سی اقوام ،جماعتیں،افراداورگروہ کائنات کے بارے میں غیر سائنسی تاویلات پر یقینِ محکم رکھتی ہیں لیکن ایسے تاویل پسندوں کا دوراصولی طور پر ترک ہو چکا ہے۔ہمارے روایتی تہذیبی حافظے میں اگر چہ ایسی تاویلات تاحال موجود ہیں لیکن جن کی جیبوں میں موبائل انگلیوں کی پوروں کے نیچے کمپیوٹر کا کی بورڈ،جن کے نصابوں میں 99% مادی علوم کی تعلیم ،جن کے پاس کارخانے اور فیکٹریاں ،آنکھوں کے سامنے دوربینیں اور خوردبینیں اور ایک پورا مشینی عہد دھڑکتا ہے وہ انسان اور کائنات سے متعلق غیر سائنسی تاویلات سے بھی بہت جلد نجات حاصل کر لیں گے۔کیونکہ وہم وگمان پر ہمیشہ تشکیک، تحقیق اور دریافت کی دو دھاری تلوار ہمیشہ لٹکتی رہتی ہے۔

کلام غالب میں لفظ ''آئینہ'' کا تنقیدی مطالعہ

سعید احمد

بلاشبہ غالب کے اشعار میں آنے والا ہر لفظ گنجینۂ معنی کا طلسم ہے وہ نہ صرف الفاظ کے استعمال پر خلاّقانہ قدرت رکھتے ہیں بلکہ معانی کی پراسرار اور متنوع جہات پر بھی گہری اور حکیمانہ نظر رکھتے ہیں ۔ لفظ معنی کے رشتہ ہائے نازک پر غالب جیسی ژرف نگاہی اور باریک بینی کسی اور شاعر کے یہاں نظر نہیں آتی ۔ غالب کا قلم مسیحا رقم نہ صفر مردہ لفظوں میں نئی روح پھونک دیتا ہے بلکہ ایک ایک لفظ اتنا جاندار اور جیتا جاگتا محسوس ہوتا ہے کہ بقول ٹی ایس ایلیٹ "If you cut a word it bleeds" یوں تو غالب کے دامان سخن میں نادر تشبیہوں ، بلیغ استعاروں اور نفیس کنایوں کی کمی نہیں لیکن جیسی اچھوتی اور نایاب تراکیب کا ذخیرہ کلام غالب میں ملتا ہے اس کی نظیر ملنا مشکل ہے ۔ غالب نے وضع تراکیب میں بھی اپنی انفرادیت کا بھرپور ثبوت دیا ہے ۔ انہوں نے ان رنگارنگ اور خوبصورت تراکیب کے طفیل اردو ادب کی تنگ دامانی کو دور کر کے اسے وسعت اور رعنائی بخشی اور ہماری زبان کو زیادہ باوقار اور ثروت مند بنانے میں گراں قدر حصہ لیا ہے ۔ غالب کی تراشیدہ تراکیب غزل کے نگینوں کی طرح جڑی معلوم ہوتی ہیں ۔ غالب نے چند روایتی تراکیب کو بھی اتنی ہنر مندی سے برتا ہے کہ اُن سے تازگی اور ندرت کا احساس جھلکتا ہے اور اکثر موقع محل کی مناسبت سے بہت سی نئی تراکیب اختراع کی ہیں ۔

اس مقالے میں غالب کے ایک پسندیدہ لفظ ''آئینہ'' کی اور اس کی تراکیب ، صفات اور تشبیہات ، متعلقات و تلازمات ، اور تلمیحات وغیرہ کا تنقیدی جائزہ مقصود ہے ۔ غالب نے اس ایک لفظ سے سینکڑوں تراکیب وضع کی ہیں اور ہر ترکیب کو ایک نئے مضمون

میں نئے ڈھنگ سے باندھا ہے۔صرف نسخۂ حمیدیہ میں ایسے اشعار کی تعداد سو سے زائد
جن میں لفظ آئینہ استعمال ہوا ہے۔

شان الحق حقّی اپنے ایک مضمون ''غالب کے استعارات کا بھید'' میں لکھتے ہیں۔

''اردو کے متداول دیوان میں لفظ آئینہ ۴۴ بار آیا ہے اور پورے اُردو کلام میں ۲۶۵ بار فارسی دیوان بھی اس کی تکرار سے خالی نہیں اس میں بھی ۱۸۸ آئینے ملتے ہیں''۔ (نقد و نگارش۔ص ۱۰۷)

آئینہ دل اُردو شاعری کی ایک مقبول عام ترکیب ہے بہت سے شاعروں نے
ترکیب استعمال کی ہے۔شعراً عموماً دل عشاق کو آئینہ سے تشبیہ دیتے ہیں۔غالب نے اس
ترکیب کے استعمال سے عاشقانہ اور عارفانہ ہر رنگ کا مضمون پیدا کیا ہے۔اور ہر جگہ جدّت
ثبوت دیا ہے۔

ایک شعر میں دل شکستگی کا مضمون باندھا ہے کہتے ہیں کہ میرا دل ٹوٹ کر آئینہ خانہ
بن گیا ہے اور میرے مقصد کا عکس ایک ایک ٹکڑے میں نظر آتا ہے۔

مدّعا محو تماشائے شکست دل ہے
آئینہ خانے میں کوئی لیے جاتا ہے مجھے

دوشعر ملاحظہ فرمایئے۔

نہ تمنّا نہ تماشا نہ تحیّر نہ نگاہ
گرد جوہر میں ہے آئینۂ دل پردہ نشین

اب میں ہوں اور ماتم یک شہر آرزو
توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا

طوطی اور آئینہ کے مناسبت باہمی مشہور ہے طوطی کو بولنا سکھانے والا جو جملے بولتا
ہے طوطی اُسے دہرانے اور نقل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

حافظ کا مشہور شعر ہے!

در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند
آں چہ استاد ازل گفت ہماں می گویم

غالب نے طوطی اور آئینے کے تعلق پر بہت دلچسپ اشعار کہے ہیں ان اشعار میں غالب نے خوب مضمون آفرینی کی ہے ایک شعر میں کہتے ہیں کہ۔

اُس چشمِ فسوں گر کا اگر پائے اشارہ
طوطی کی طرح آئینہ گفتار میں آوے

طوطی اور آئینے کی نسبت سے غالب کا یہ شعر بہت مشہور ہے۔

از مہر تابہ ذرّہ دل و دل ہے آئینہ
طوطی کوشش جہت سے مقابل ہے آئینہ

پروفیسر یوسف سلیم چشتی اس شعر کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ۔

''اس تقابل ہے غالب کا یہ مقصود ہے کہ آفتاب سے لیکر ذرّہ تک ہر شے مظہر ذات وصفات ہے ہر شے میں وہی جلوہ گر ہے اور ہر شے سے وہی ظاہر ہو رہا ہے طوطی سے مراد عارف مراد ہے۔آئینہ مقابل ہے یعنی عارف کو ہر شے میں اسی کا جلوہ نظر آتا ہے۔

آفتاب سے لے کر ذرّے تک ہر شے غزلہ دل ہے اور دل غزلہ آئینہ جس میں ذات حق جلوہ گر ہے۔اس لئے عارف کو ہر شے میں وہی وہ نظر آتا ہے یعنی ساری کائنات پرتو یا ظلّ ہے ذات وصفاتِ حق کا''

(شرح دیوان غالب،ص۔۶۱۹)

درج ذیل اشعار میں تراکیب کی جدت دیدنی اور مضامین کی ندرت قابل داد ہے۔

ہر چند ہوں میں طوطی شیریں سخن ولے
آئینہ ، آہ میرے مقابل نہیں رہا

کیوں نہ طوطی طبیعت نغمہ پیرائی کرے
باندھتا ہے رنگ گل آئینہ ہر چاک قفس

کلام غالب میں طوطی آئینہ کے ذکر کے ساتھ ساتھ طاؤس اور آئینے کے تعلق پر
بھی چند بے مثال شعر ملتے ہیں طوطی کے برعکس طاؤس کا حسن بے پروا نہیں بلکہ خود بین و خود
آرا ہے جیسا کہ ابوالکلام آزاد اپنے ایک خط (حکایت بارہ وتریاک) میں لکھتے ہیں۔
''جنگل کے مور کو کبھی باغ و چمن کی جستجو نہیں ہوئی۔ اس کا چمن خود اس کے بغل
میں موجود رہتا ہے۔ جہاں کہیں اپنے پر کھول دے گا ایک چمنستان بوقلموں کھل
جائے گا'' (غبار خاطر: ص۔۶۸)
غالب بھی اس نکتہ سے آگاہ ہیں کہ مسرت و شادمانی کا سرچشمہ دل ہی ہے ایک
شعر میں مور کے پیروں کو صد چشم کہا ہے۔ تشبیہ لاجواب اور خیال بالکل نیا ہے۔

پر طاؤس تماشا نظر آیا ہے مجھے
ایک دل تھا کہ بہ صد چشم دکھایا ہے مجھے

قصیدہ حیدریہ کا ایک شعر ملاحظہ ہو۔

شکل طاؤس کرے آئینہ خانہ پرواز
ذوق میں جلوۂ کے تیرے بہ ہوالے دیدار

مولانا حسرت موہانی اس شعر کی شرح میں فرماتے ہیں کہ۔
''آئینہ خانہ تیرے جلوے کے ذوق اور تیرے دیدار کی خواہش میں مثل
طاؤس پرواز کرتا ہے'' (شرح دیوان غالب: ص۲۴۶)
ذوقِ دیدار کے مضمون کو ایک اور شعر میں بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔
طاؤس پرافشاں کو اڑتا ہوا آئینہ خانہ کہنا تشبیہ کا کمال ہے۔

پروازِ نقدِ دام تمنائے جلوہ تھا
طاؤس نے اک آئینہ خانہ رکھا گرد

شیشے اور پری کا مضمون بھی متعدد شعراء نے باندھا ہے۔ آتش کا شعر ہے۔

نازک دلوں کو شرط ہے آتش خیال یار
شیشہ خدا جودے تو پری کو اُتاریئے

غالب نے آئینہ اور پری کے باہمی تعلق پر متعدد شعر کہتے ہیں چند شعروں میں پری

کی مناسبت سے وحشت، حیرت، سایہ، طلسم اور جادو وغیرہ کا ذکر بھی کیا ہے ان اشعار میں رعایت لفظی کا قرینہ بہت پر لطف معلوم ہوتا ہے۔

وحشت دل سے پریشاں ہیں چراغاں خیال
باندھوں ہوں آئینے پر چشم پری سے آئیں

پری اور پریشاں ایک ماخذ سے مشتق معلوم ہوتے ہیں لیکن دراصل ان کا ماخذ علیحدہ ہے جبکہ آئینہ اور آئین کے الفاظ واقعی ایک ماخذ سے مربوط ہیں گویا غالب نے اس ایک شعر میں شبہ اشتقاق اور اشتقاق کی صنعتیں جمع کر کے ضائع لفظی کا حق ادا کر دیا ہے۔

عابد علی عابد نے اپنے ایک مضمون ''کلمہ آئینہ کی تحقیق'' میں صاحب ''برہان قاطع'' اور صاحب ''فرہنگ آنندراج'' کے حوالہ سے لکھا ہے کہ۔

''آئینہ آئین ہی سے مشتق ہے کہ اسباب زینت ہے ......اب آئین کے مختلف معانی کی باہمی تعلق پر غور فرمالیجئے۔اس کے معنی روش و دستور کے ہیں قانون ایک دستور ہے ایک روش ہے اچھے قانون سے ملک کی زیب و زینت ہے آئینہ اسباب زینت میں سے ہے۔

اب ایک اور بات رہ گئی انگریزی میں آئینہ کیلئے کیا لفظ ہے اور اس کی لسانی تحقیق کیا ہے وہ نہایت دلچسپ ہے انگریزی میں آئینہ کو Mirror کہتے ہیں ۔شپلی Shipley فرہنگ ماخذ الفاظ میں امیر کے ماتحت کہتا ہے کہ امیر کا مادہ امر ہے ۔حکم دینا اور انگریزی لفظ Admiral اسی سے ہے۔ انگریزی کا لفظ Admire (تعریف کرنا خوش کرنا) بھی اسی لفظ سے ہے اور یاد رہے کے آئینہ کو انگریزی میں Admiring Glass بھی کہتے ہیں جو شعراء اس نکتہ سے واقف ہیں کہ حقیقت میں آئینہ کا مادہ آئین ہے وہ جب ان دو کلمات کو استعمال کرتے ہیں تو عجیب لطف پیدا ہوتا ہے۔مثلاً

کفراست در طریقت ماکینہ داشتن
آئین ماست سینہ چو آئینہ داشتن

(بحوالہ۔ماہِ نو۔جلد اوّل (چالیس سالہ مخزن)

دلچسپ بات یہ ہے کہ غالب اکثر اشعار میں آئینہ اور آئین کے ساتھ پری کا ذکر ضرور کرتے ہیں کہ پری زیب و زینت اور حسن و جمال کا استعارہ ہے۔

حیرتِ ، حدِ اقلیم تمنا سے پری ہے
آئینے پہ آئین گلستان ارم باندھ

پری کے ساتھ حیرت و وحشت اور جنون کے تلازمات ایک روایتی مضمون کی حیثیت رکھتے ہیں اس ضمن میں سراج اورنگ آبادی کی مشہور غزل کا مطلع بہت خوب ہے۔

خبر تحیّر عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ تو تو رہا نہ تو میں رہا ، جو رہی سو بے خبری رہی

آئینہ اور پری کی مناسبت سے رعایت لفظی اور تراکیب کی خوبصورتی ملاحظہ فرمائیں۔

خود آرا وحشتِ چشم پری سے شب وہ بدخو تھا
کہ موم آئینہ تمثال کو تعویز بازو تھا

پری کو شیشے میں اُتارنے والا مضمون عام ہے اکثر شعراء شراب کو شیشے کی پری کہتے ہیں ۔غالب نے ایک شعر میں اس رعایت کو یوں بیان کیا ہے۔

بزم مے وحشت کدہ ہے کس کی چشم مست کا
شیشہ میں نبض پری پنہاں ہے موج بادہ سے

اور یہ شعر دیکھیے۔

مئے تمثال پری نشۂ مینا آزاد
دلِ آئینہ طرب ساغر بخت بیدار

آئینہ غالب کے تصورِ حسن میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے حُسن کو خود بینی اور خود آرائی کیلئے آئینے کی ضرورت ہے ۔غالب کا محبوب حسن و نزاکت میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔یہی احساس جمال اسے مغرور اور تنک مزاج بنا دیتا ہے۔

آئینہ محبوب کی آرائش و زیبائش ہی کا کام نہیں کرتا بلکہ احساس حسن کو بھی بڑھا دیتا ہے ایک شعر میں کہتے ہیں کہ آئینہ حسنِ خوابیدہ کیلئے مشتِ آب کا کام دیتا ہے ۔جب محبوب

نیند کے خمار یا نیم خوابی سے بیداری کیلئے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارنا چاہتا ہے تو آبینہ (آئینہ آب) میں اپنا عکس دیکھ کر مثل نرگس اپنے حسن پر فریفتہ ہو جاتا ہے اور یوں سوئے ہوئے فتنوں کے جاگ اُٹھنے سے حشر برپا ہو جاتا ہے۔شوخیِ خیال اور حُسن اظہار قابل ستایش ہیں۔

جوش تکلیف تماشا محشر آباد نگاہ
فتنۂ خوابیدہ کو آئینہ مشتِ آب تھا

غالب کا محبوب جب آئینہ دیکھتا ہے تو خود بینی میں اس قدر محو ہو جاتا ہے دنیا و مافیہا سے غافل ہو جاتا ہے اُسے یہ احساس نہیں کہ جتنی محویت اور محبت سے وہ آئینہ دیکھ رہا ہے اس سے کہیں زیادہ حیرت وحسرت اور تمنا سے اسے کوئی اور دیکھ رہا ہے۔

تماشہ کر اے محوِ آئینہ داری
تجھے کس تمنّا سے ہم دیکھتے ہیں

عابد علی عابد لکھتے ہیں کے دوسرے مصرعے میں لہجے کا کھیل دیدنی ہے۔

تجھے کس تمنّا سے ہم دیکھتے ہیں

یعنی آئینہ تو صرف تمہارے حسن کی عکاسی ہی کرتا ہے ہم تو اس حسن کی خوبی اور محبوبی اور متعلقہ کوایف کی دلالتوں پر غور کرتے ہیں کہ تمنّا کی حسرت اور آرزو کی شدت کیا ہے۔اس طرح یہ مطلب نکلے گا کہ آئینہ کوئی جذبہ نہیں پیدا کرسکتا۔وہ تجھے تمنا سے نہیں دیکھتا لیکن ہمارا دیکھنا آئینے کے دیکھنے سے بالکل مختلف ہے"

(البدیع: ص۔۳۳۹)

جس طرح فانی کی محبت فنا کر دیتی ہے اور باقی کی محبت بقا عطا کرتی ہے بالکل اسی طرح حسین کی محبت بھی چاہنے والے کو حسین بنا دیتی ہے۔

غالب کے محبوب کے حسن و جمال کا یہ کمال ہے کہ اس کا چاہنے والا (غالب) بھی دولت حسن سے مالا مال ہو جاتا ہے۔جمال ہمنشیں کا اثر دیکھیے۔

سچ کہتے ہو خودبین و خودآرا ہوں نہ کیوں ہوں
بیٹھا ہے بُتِ آئینہ سیما مرے آگے

اور اس شعر میں جلوۂ حسن کی کرشمہ سازی قابل دید ہے۔

یہ کس خورشید کی تمثال کا ہے جلوۂ سیمابی
کہ مثلِ ذرہ ہائے خاک آئینے پر افشاں ہیں

اسی مضمون کو ایک اور شعر میں بھی بیان کیا ہے مشاہدہ و قابلِ تعریف ہے۔

ہوئے اس مہروش کی جلوۂ تمثال کے آگے
پر افشاں جوہر آئینے میں مثلِ ذرہ روزن میں

غالب کے کلام میں رشک کا مضمون بھی اپنی الگ بہار دکھاتا ہے دراصل غالب کے تصورِ رشک کے ڈانڈے بھی تصورِ حسن سے ہی جا ملتے ہیں۔ غالب کا محبوب اتنا حسین ہے کہ غالب کو نہ صرف اپنے آپ پر رشک آتا ہے بلکہ بعض اوقات تو چشم و گوش بھی ایک دوسرے پر رشک کرتے ہیں لیکن رشک کی انتہا یہ ہے کہ محبوب کو بھی اپنے آپ پر رشک محسوس ہوتا ہے اور آئینہ اس کا دعویٰ باطل کر دیتا ہے کہ محبوب جیسا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے
صاحب کو دل نہ دینے پر کتنا غرور تھا

جوش ملسیانی اس شعر کی شرح میں لکھتے ہیں۔

''نکتہ یہ ہے کہ اپنے حسن کا عکس دیکھ کر تابِ حسن سے اتنے بے خود ہو گئے کہ عکس کو ایک اور حسین سمجھ لیا۔ اس وارفتگی کا کیا ٹھکانا کہ عکس اور اصل میں امتیاز پیدا کر لیا۔ مقصودِ کلام یہ ہے کہ تیرا حسن تجھے بھی بے خود و وارفتہ کرنے والا ہے''

(شرح دیوان غالب: ص ۱۱۰)

مزید دو شعر ملاحظہ فرمائیں۔

وہ شوخ اپنے حسن پہ مغرور ہے اسدؔ
دکھلا کے اس کو آئینہ توڑا کرے کوئی

وہ دیکھ کے حسن اپنا مغرور ہوا غالب
صد جلوۂ آئینہ یک صبحِ جدائی ہے

حسن و رشک کا مضمون اس شعر میں خوب باندھا ہے۔

الجھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ
جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو یہ کیونکر ہو

حالی اس شعر کے تشریح میں فرماتے ہیں۔

''اس کا مطلب ایک تو یہ ہے کہ تم جیسے نازک مزاج شہر میں ایک دو اور ہوں تو شہر کا کیا حال ہو اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ جب تم کو اپنے عکس کا بھی اپنی مانند ہونا گوارا نہیں تو شہر میں اگر فی الواقع تم جیسے ایک دو حسین موجود ہوں تو تم کیا قیامت برپا کرو'' (یادگارِ غالب: ص۔۱۸۶)

یوں تو غالب نے محبوب کے حسن پر بہت سے ایسے شعر کہے ہیں جنہیں حقیقت و مجاز دونوں پر محمول کیا جا سکتا ہے لیکن یہ شعر تو بے اختیاری اور وجد طاری کر دیتا ہے۔

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

اور یہ شعر بھی تاثیر سے خالی نہیں۔

سامنا حور و پری نے نہ کیا ہے نہ کریں
عکس تیرا ہی مگر تیرے مقابل آئے

ہمارے شعرا نے آئینے کی جن متعدد صفات کا ذکر کیا ہے ان میں سے حیرت ایک عام صفت ہے شعراء آئینے کو حیران باندھتے ہیں اور حیرت آئینہ، آئینہ حیرت جیسی تراکیب عام استعمال کرتے ہیں چند اشعار پیش خدمت ہیں۔

حیراں ، آئینہ دار ہیں ہم
کس سے یارب دوچار ہیں ہم
(دردؔ)

منہ تکا ہی کرے ہے جس تس کا
حیرتی ہے یہ آئینہ کس کا
(میرؔ)

آئینہ دیکھیے مری صورت نہ دیکھیے
میں آئینہ نہیں مجھے حیران نہ کیجیے
(حفیظ)

یہ عام مشاہدہ ہے کہ ساکن پانی کی سطح پر کلعی جم جاتی ہے اس مشاہدے سے یہ مضمون پیدا کیا ہے کہ آئینے کی حیرت ہی اسکی صفائی کیلئے آخر کار سامان رنگ بن جاتی ہے۔

صفا نے حیرتِ آئینہ ہے سامان زنگ آخر
تغیر آب برجا ماندہ کا پاتا ہے رنگ آخر

پروفیسر یوسف سلیم چشتی فرماتے ہیں کہ۔

"اس شعر میں حُسنِ تعلیل کا رنگ ہے کہتے ہیں کہ آئینہ میں زنگ اس لیے لگ جاتا ہے کہ وہ حیران ہوتا ہے اور حیرانی متلزم جمود ہے اور جو شے ساکن و جامد ہو جائے اس میں کثافت پیدا ہو جاتی ہے، دوسرے مصرع میں مثال سے اپنی دعویٰ کو ثابت ہے کہ دیکھ لو! جو پانی ٹھہرا ہوا ہوتا ہے اسکا رنگ اور ذائقہ تبدیل ہو جاتا ہے۔"
(شرح دیوان غالب: ص ۴۴۳)

ایک شعر میں کہتے ہیں کہ دل بے قرار نے ہمیں یوں حیران کر دیا ہے کہ جیسے پارا آئینے کو امداد دیتا ہے اور اسے حیران و پریشان کر دیتا ہے۔ پارے کی بیقراری مشہور ہے۔

سیمابِ پشتِ گرمی آئینہ دے ہے ہم
حیراں کیے ہوئے ہیں دل بے قرار کے

عاشق کی حیرانی اور بے قراری پارے سے فزوں تر ہے۔

آئینہ داغِ حیرت و حیرت شکنج یاس
سیماب بے قرار و اسدؔ بے قرار تر

آئینے اور حیرت کی نسبت سے یہ دو شعر سماعت فرمائیں۔

کب مجھے کوئے یار میں رہنے کی وضع یاد تھی
آئینہ دار بن گئی حیرت نقش پا کہ یوں

گردشِ ساغر صد جلوۂ رنگین تجھ سے
آئینہ داری یک دیدہ حیراں مجھ سے

آئینہ سکندر کی ایجاد بتایا جاتا ہے۔غالب نے آئینہ اسکندری کی تلمیح کی اشعار میں استعمال کی ہے۔غالب کا ایک فارسی شعر ملاحظہ فرمایئے مضمون تصوف کا ہے۔

بجام و آئینہ حرفِ جم و سکندر چیست
کہ ہر چہ رفت بہر عہد در زمانۂ تست

(یعنی یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ جام جہاں نما جمشید کے عہد میں تھا اور آئینہ سکندر کے عہد میں؟ کیوں کہ جو کچھ جس زمانے میں گزرا وہ تیرے ہی زمانے میں تھا)

بہادر شاہ ظفر کے مدح میں لکھتے ہیں۔

شاہ کے آگے دھرا ہے آئینہ
اب مآلِ سعی اسکندر کھلا

ایک شعر میں آئینے کے ساتھ "سدِّ اسکندر" کی تلمیح کو جمع کر دیا ہے یہ شعر بھی مدح کا ہے۔

سدِّ اسکندر ہو از بہر نگاہِ گُل رُخاں
گر کرے یوں امر نہی بو تراب آئینے پر

آئینہ اسکندر کی نسبت سے شادؔ عظیم آبادی کا یہ شعر بھی بہت پُرلطف ہے۔

تا قیامت رہے آئینہ سلامت یارب
ہر حسین کو ہے یہ دعوٰی کہ سکندر ہیں ہم

آئینہ سکندر کو لوہے کو صیقل کر کے بنایا گیا تھا۔فارسی میں آئینے کے لئے آہینہ کا لفظ بھی آتا ہے آئینہ اور آہن کی نسبت سے دردؔ کا یہ شعر دیکھئے۔

ہے مظہر انوارِ صفا میری کدورت
ہر چند کے آہن ہوں پہ آئینہ بنا ہوں

یہ تصوف کا مضمون ہے اور حق یہ ہے کہ متصوفانہ اشعار میں لفظ آئینے کا استعمال درد پر ختم ہے۔

ایک غزل کے دو شعروں پر اکتفا کروں گا۔

ہر چند آئینہ ہوں پر اتنا ہوں نا قبول
منہ پھیر لے وہ جس کے مجھے روبرو کریں
مٹ جائیں ایک آن میں کثرت نمائیاں
ہم آئینہ کے سامنے جب آ کے ہوا کریں

صیقل آئینہ کی ترکیب غالب نے بھی استعمال کی ہے۔

یک الف بیش نہیں ، صیقل آئینہ ہنوز
چاک کرتا ہوں میں جب سے گریباں سمجھا

اس شعر کی تشریح خود غالب نے ایک خط میں لکھی ہے۔

''پہلے یہ سمجھنا چاہیے کہ آئینہ عبارت فولاد کے آئینے سے ہے ورنہ جلی آئینوں میں جوہر کہاں اور ان کو صقیل کون کرتا ہے۔ فولاد کی جن چیزوں کو صقیل کرو گے۔ بے شبہ پہلے ایک لکیر پڑے گی اسے الفِ صقیل کہتے ہیں جب یہ مقدمہ معلوم ہوا تو اب اس مفہوم کو سمجھیے۔

چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا

یعنی ابتدائے سن تمیز سے مشق جنون ہے اب تک کمالِ فن حاصل نہیں ہوا۔ آئینہ عام صاف نہیں ہو گیا۔ بس وہی ایک لکیر صقیل کی موجود ہے چاک کی صورت الف کی سی ہوتی ہے اور چاکِ جیب آثار جنوں میں سے ہے''

(بحوالہ،نوائے سروش: ص۱۳۲)

فولادی آئینہ برسات میں سبز ہو کر اپنا چمن خود پیدا کر لیتا ہے۔

تا کہ تجھ پر کھلے اعجازِ ہوائے صیقل
دیکھ برسات میں سبز آئینے کا ہو جانا

ایک شعر میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ لطافت کو بھی اپنی جلوہ گری کیلئے کثافت کا سہارا لینا پڑتا ہے بقول عبدالرحمٰن بخوری ''جمال الٰہی اگر بے تقاضائے حسن وجود چاہتا تو وجودِ مادی کیوں اختیار کرتا ہے اسکا جواب مرزا غالب کے سوا آج تک دنیا کے کسی

فلسفی نے نہیں دیا۔

اور وہ جواب یہ ہے کہ

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینہ باد بہاری کا

(محاسن کلام غالب، تنقید غالب کے ۱۱۰ سال، ص ۱۴۴)

جوہر آئنہ، زنگار اور طوطی میں سبز رنگ مشترک صفت ہے۔

اہل بینش نے بہ حیرت کدہ شوخی ناز
جوہر آئینہ کو طوطی بسمل باندھا

کیا بدگماں ہے مجھ سے کہ آئینے میں مرے
طوطی کا عکس سمجھے ہے زنگار دیکھ کر

"صفا بھی منجملہ صفات آئینہ ہے صوفی شعراء نے آئینے کی اس صفت کا ذکر کثرت سے کیا ہے۔ اردو کے یہاں ایسے اشعار عام ہیں جن میں آئینے کے باصفا ہونے کا مضمون باندھا ہے۔

خواجہ آتش کا ایک شعر یاد آتا ہے۔

چاروں طرف سے صورت جاناں ہو جلوہ گر
دل صاف ہو ترا تو ہے آئینہ خانہ کیا

حضرت داغ کا یہ مطلع بھی خوب ہے۔

آئینہ منہ پہ بھلا اور برا کہتا ہے
سچ یہ ہے صاف جو ہوتا ہے صفا کہتا ہے

اقبال فرماتے ہیں۔

تعصب چھوڑ ناداں دہر کے آئینہ خانے میں
یہ تصویریں ہیں تیری جن کو سمجھا ہے بُرا تو نے

غالب ایک شعر میں کہتے ہیں کہ میرے دشمن میرے دل کی صفائی دیکھ کر شرمندہ ہوتے ہیں اور ناحق آئینے پر عتاب کرتے ہیں حالانکہ اُن کی بدصورتی میں آئینے کا کیا قصور؟

مدّعی میرے صفائے دل سے ہوتا ہے خجل
ہے تماشا زشت زدیوں کا عتاب آئینے پر

بدصورت، زشت رو اور بدخصال آئینے کو ناپسند کرتے ہیں۔

''آرائش محفل کے دوسرے سفر میں حاتم طائی کا سامنا ایک آدمخور بلا'حلوقہ' سے ہوتا ہے حاتم اس بلا کو مارنے کیلئے ایک بہت بڑا آئینہ تیار کراتا ہے۔ بلا آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ غصّے سے پھولنے لگتی ہے اور بلا آخر پھٹ جاتی ہے۔''

ڈاکٹر سہیل احمد خان لکھتے ہیں کہ

''حلوقہ کو ہلاک کرنے کا طریقہ کتنا معنی خیز ہے۔ کیا ہماری مسخ شدہ انا اسی طرح پھولی نہیں ہوتی؟ کبر اور خود پسندی کو آئینہ دکھا دیا جائے تو وہ اپنی صورت کی تاب نہ لاسکیں۔ عشق ''خود پرستی ہی کو ختم کرتا ہے''

(داستانوں کی علامتی کائنات: ص۔۲۹)

آئینے کی چند مزید صفات کے لئے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

بروئے شش جہت درِ آئینہ باز ہے
یاں امتیاز ناقص و کامل نہیں رہا

تمیز زشتی و نیکی میں لاکھ باتیں ہیں
بہ عکس آئینہ یک فرد سادہ رکھتے ہیں

آئینہ نفس سے بھی ہوتا ہے کدورت کش
عاشق کو غبار دل اک وجہ صفائی ہے

یوں تو غالب نے ہر جگہ لفظ آئینہ اور اسکی تراکیب و تلازمات کے استعمال کا حق ادا کیا ہے اور ہر جگہ مضمون آفرینی اور زور تخیل کا ثبوت فراہم کیا ہے لیکن جن اشعار میں محبوب اور آئینہ آمنے سامنے ہیں ان میں غالب کی جودت طبع عروج پر نظر آتی ہے غالب ان اشعار میں اپنے محبوب کیلئے خورشید طلعت، رشک ماہتاب، مہروش، اور مہر درخشاں جیسی پرشکوہ تشبیہات

استعمال کرتا ہے وہ اس نکتہ سے بخوبی آگاہ ہیں کہ جمال ہی کی شدت کو جلال کہتے ہیں۔

ایک شعر میں فرماتے ہیں کہ مرے محبوب کی جلوؤں کے سامنے آئینہ خانے کی آب وتاب یوں اُڑ جاتی ہے جیسے سورج کے سامنے شبنم۔

کیا آئینہ خانے کو وہ نقشہ ترے جلوے نے
کرے جو پرتو خورشید عالم شبنمستاں کا

مہر اس شعر کی شرح میں لکھتے ہیں کہ

''اس شعر کی حقیقی حیثیت کا اندازہ مشاہدے سے تعلق رکھتا ہے صبح کو اُٹھیے اور کسی ایسے مقام پر پہنچ جائیے جہاں سبزے کا فرش ہو۔ جابجا پھولوں کی کیاریاں ہوں اوران پر خوب شبنم پڑی ہوئی ہو جیسا کہ سرما میں پڑتی ہے۔ پھر سورج نکلے اس کی شعاعیں شبنم کی قطروں پر پڑیں تو ہر قطرۂ ایک چھوٹا قمقمہ نظر آئے گا۔ جس میں چراغ کی روشنی ہوگی۔ آپ مختلف زاویوں سے دیکھیں گے تو ہر قطرے میں نور کے مختلف رنگوں کا جلوہ دکھائی دے گا۔ آپ دیکھتے جائیں ایسی بہار آپ کے سامنے ہوگی جس کا نقشہ لفظوں میں نہیں کھینچا جاسکتا۔ شاعر کہتا ہے کہ اے محبوب! یہی کیفیت آئینہ خانے میں تیرے جلوے نے پیدا کر دی''۔(نوائے سروش: ص۔۴۷)

غالب کی ایک غزل کی ردیف ''آئینے پر ہے سات اشعار پر مشتمل یہ غزل گویا ایک ہفت پہلو نگینہ ہے ہر شعر میں الگ رنگ دکھاتا ہے مطلع میں ماہتاب اور آفتاب کی صفات وتراکیب قابل غور ہیں۔

چاند سورج کی روشنی کو منعکس کرتا ہے۔

بسکہ مائل ہے وہ رشکِ ماہتاب آئینے پر
ہے نفس تارِ شعاع آفتاب آئینے پر

اسی غزل کا دوسرا شعر بھی شنیدنی ہے۔

باز گشت جادہ پیما لے رہ حیرت کہاں
غافلاں غش جان کر چھڑکے ہیں آب آئینے پر

''آئینے پر پانی چھڑکنا ایک تلمیح ہے مولانا طباطبائی لکھتے ہیں کے ایران میں یہ رسم ہے کہ جب کوئی شخص سفر پر روانہ ہوتو اس کے گھر والے آئینے پر پانی چھڑکتے ہیں اسے نیک شگون خیال کیا جاتا ہے تا کہ مسافر سفر کی شدائد سے محفوظ رہے اور بخیر و بامراد لوٹ آئے۔ لیکن بختی کشانِ عشق اور وہ حیرت کے مسافر کبھی نہیں لوٹتے۔''

آئینے پر پانی چھڑکنے کا مضمون ایک اور شعر میں بھی بیان کیا گیا صنعت مراعاۃ النظیر دیکھئے

چھڑکے ہے شبنم آئینہ برگ گُل پر آب
اے عندلیب وقت و وداع بہار ہے

آئینہ گل اور آئینہ بہار کی ترکیب غالب بے بکثرت استعمال کی ہے

چمن چمن گُل آئینہ درکنار ہوس
امیدِ محوِ تماشائے گلستاں تجھ سے

ایک شعر میں کہتے ہیں کہ گُل و صبح کی حیرانی چمن کو آئینہ بنا دیتی ہے۔

آئینہ خانہ ہے صحن چمنستان یکسر
بسکہ ہیں بیخود و وارفتہ و حیران گل و صبح

ڈاکٹر یوسف حسین لکھتے ہیں کہ۔''حیرانی کی مناسبت سے چمن کا آئینہ خانہ بن جانا شعری رمزیت کا کمال ہے''

(اُردو غزل: ص۳۲)

''گل و صبح'' ردیف والی غزل کا یہ شعر بھی خوب ہے گل و صبح دعائے سحری میں وصل محبوب کی خواہاں ہیں۔

وصل آئینہ رخاں ہم نفس یک دیگر
ہیں دعا ہائے سحرگاہ سے خواہاں گل و صبح

ایک شعر میں دیر و حرم کو واماندگی شوق کی پناہ گاہیں قرار دیا ہے بیت العزل ہے۔

دیر و حرم آئینہ تکرارِ تمنا
واماندگی شوق تراشے ہے پناہیں

ڈاکٹر یوسف حسین اس شعر کی شرح میں فرماتے ہیں کہ
"دیر و حرم مقصود بالذات نہیں بلکہ ان سے اصلی مقصود کی طرف رہنمائی ہوتی ہے"
(غالب اور اقبال کی متحرک جمالیات: ص ۷۹)

اکثر نسخوں میں دیر و حرم والا صرف ایک شعر ملتا ہے لیکن آسی نے سات شعر دیئے ہیں نسخہ حمیدیہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

ایک شعر میں تراکیب کا حسن ملاحظہ ہو اگر چہ مضمون کاوش اور تفع سے خالی نہیں۔

کس دل پہ ہے عزم صف مژگان خود آرا
آئینے کی پایاب سے اتری ہیں سپاہیں
(نسخہ حمیدیہ: ص۔۱۶۱)

آسی نے سپاہیں کی جگہ نگاہیں لکھا ہے (شرح غیر مطبوعہ کلام غالب: ص۔۱۴۹)

اگرچہ نگاہ کا دل میں اترنا عام مضمون ہے
دل سے تیری نگاہ جگر تک اُتر گئی

لیکن صفِ مژگان خود آرا کی رعایت سے لفظ سپاہیں انسب معلوم ہوتا ہے آئینہ پایاب کی ترکیب اس شعر میں بھی ملتی ہے۔

بے خبر مت کہہ ہمیں بے درد! خود بینی سے پوچھ
قلزمِ شوق نظر میں آئینہ پایاب تھا

غالب نے خود بینی و خود آرائی کی مضامین بڑے ہنر مندی اور دلچسپی سے باندھے ہیں آئینے اور خود بینی کی نسبت سے زیب النساء مخفی دختر اورنگزیب کے حکایت بھی لطف سے خالی نہیں زیب النساء کی کنیز اٹھکیلیاں کرتی آئینہ لا رہی تھی کہ وہ ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گرا اور ٹوٹ گیا۔ آئینہ مانگنے پر کنیز نے پریشان ہو کر کہا۔ از قضا آئینہ چینی شکست۔

زیب النساء نے برجستہ کہا:

خوب شد اسبابِ خود بینی شکست

الغرض مرزا غالب نے لفظ آئینہ اور اسکی صفات و تشبیہات سے پیدا ہونے والے مضامین کو جس شان اور سلیقے سے بیان کیا ہے اردو شاعری میں اسکی مثال نہیں ملتی۔ انہوں نے

اس آئینے میں نہ صرف جلوۂ ہائے معانی کی بہار دکھائی ہے بلکہ فکر اور جذبے کے امتزاج سے ایسی شعری تمثالیں اور لفظی پیکر تراشے ہیں جن پر اردو زبان داد کو ہمیشہ ناز رہے گا۔ دراصل فنکار کا فن ہی اسکی ذات کا آئینہ ہوتا ہے اور کلام غالب ایک ایسا ہی آئینہ ہے جس میں شاعر کے بطون ذات سے لے کرشش جہات تک کی ہر شے اپنا جلوہ دکھاتی ہے بلکہ اس آئینے میں چرخ سے اُدھر کے وہ مناظر بھی دیکھے جاسکتے ہیں جو نہ تو جام جم میں نظر آ سکتے ہیں نہ آئینہ سکندر میں ایسا ہی ایک منظر غالب نے ہمیں دکھایا ہے۔ جہاں وہ حقیقتِ منتظر لباس مجاز میں نظر آ رہی ہے جو ہر لمحہ حُسن آفرینی اور آرائش جمال میں مصروف ہے۔

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

تاریخی وراثت کی پامالی

رابرٹ فِسک

ترجمہ۔نوشاد علی

چاروں طرف تباہی کا منظر تھا۔جہاں تک نظر پہنچ سکتی تھی وہاں تاریخ دم توڑ رہی تھی۔ لٹیروں نے چند قیمتی پتھروں اور زیورات کے لئے میسو پوٹامیہ اور سمیریا کی ہزاروں سال پُرانی تہذیب کے باقیات کو تباہ کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔امریکی حملے کے بعد اپنی تاریخ لٹا کر عراق ہوش حواس کھو بیٹھا تھا۔مجھ سے کچھ ہی قدم کی دوری پر سمیریا کے محل اور عبادت گاہوں کی دیواروں کے باقیات، چراغ ٹوٹے فن پارے اور نا معلوم کیا کیا بکھرا پڑا تھا۔طشتریوں اور ہاتھ سے بنی اینٹوں کے ٹکڑوں کے درمیان تین گھنٹے تک بھٹکنے کے بعد مجھے ہری مٹی کا ایک بڑا سا برتن ملا۔تقریباً چار سو سال پہلے ہمارے آباؤ اجداد نے اسے تراشا ہوگا ۔اس برتن کی پینیدی پر بنانے والے کے انگوٹھے کا نشان اب بھی موجود ہے۔لیکن ان احسان فراموش لٹیروں نے اس برتن کو لا پرواہی سے پھینک کر انسان کو پہلی بار قانون پڑھانے اور کیلنڈر دینے، نیز پہیے کا تحفہ دینے والی عظیم تہذیب کا شکریہ ادا کیا تھا۔ٹگرس ندی کے کنارے نصیریہ،نمرود،ننیوا اور حترٰ میں ڈیرا جمائے ان لٹیروں کو ۲۰۰۰ قبل مسیح کی وراثت سے کوئی سروکار نہیں تھا۔وہ تو امریکہ ،یورپ ،وسط ایشیا اور جاپان سے نوادرات جمع کرنے والوں کے لیے ۵۰۰۰ سال پرانے برتن ،مجسمے اور زیورات اکٹھا کرنے آئے تھے اس لئے تہذیبیں روندی جارہی ہیں ۔زنا بالجبر کا شکار ہو کر پھر زمین میں دفن ہونے کے لیے۔ہاں انہوں نے ایک نشانی ضرور چھوڑ دی تھی ......سگریٹ کا ایک خالی پیکٹ ،جس پر ایک بانسری کی تصویر بنی ہوئی تھی اور اس پر لفظ ''سمیریہ'' لکھا ہوا تھا۔

نصیریہ سے چالیس کلومیٹر دور اُم القرب میں کبھی سمیریہ تہذیب اپنے عروج پر تھی۔

آج بھی وہاں پر بہت کچھ نہیں بدلا ہے۔مٹی کے گھر،ان کی دیواروں سے جھانکتی شہتیریں ،دروازے اور چھوٹے چھوٹے کھیت سب کے سب ویسے ہی ہیں جیسا کے ۷۰۰ سال پہلے تھا۔سمیریہ کے لوگ چھوٹی چھوٹی نہریں بنا کر نگرس ندی کا پانی ریگستان میں کھینچ لائے تھے طویل عرصہ بعد یہ نہریں خشک ہو گئیں لیکن امریکی بمباری سے ایک بار پھر نگرس ریگستان تک آ گئی ہے۔

امریکہ نے صدیوں پہلے تہذیب کو جنم زمین کے لیے بس اتنا ہی کیا ہے ۃ جب عراق کی تاریخی وراثت پر زنا بالجبر ہو رہا تھا اس وقت امریکہ خاموش تماشائی تھا لٹیروں نے منصوبہ بند طریقے سے بغداد کے قدیم ترین میوزیم میں لوٹ کھسوٹ کی ۔امریکہ نے لوٹ کھسوٹ کی روک تھام کے لئے فوج بھی بھیجی لیکن اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی اور لٹیرے اپنا کام انجام دے چکے تھے ۔جہاں تہذیب نے پہلی بار آنکھیں کھولی تھی ، جہاں اس نے گھٹنوں کے بل چلنا سیکھا تھا وہاں اب ریتلے طوفانوں کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے ۔اس منظر کو دیکھ کر محسوس ہوا کہ واقعی تاریخ کی موت کتنی دردناک ہوتی ہے ۔یہ جنگ ہو سکتا ہے کہ تاناشاہی سے نجات کا پیغام لائی ہو ،لیکن نصیریہ کے قدیم ترین میوزیم کی نائب ناظم اقبال کاظم کے لئے ،آنسوؤں کی سوغات لے کر آئی ہے ۔۳۵ سالہ کاظم نے ۱۹۹۱ء کی خلیجی جنگ میں اپنی جان پر کھیل کر میوزیم کے قیمتی خزانے کو لٹنے سے بچا لیا تھا۔لیکن اس بار وہ بے بس تھیں نصیریہ کے میوزیم سے کچھ بھی باہر لے جانے کی اجازت نہیں تھی اب کوئی لے بھی نہیں سکے گا کیوں کے وہاں کچھ بچا ہی نہیں ہے چاروں طرف لٹیروں نے سب صاف کر دیا ہے ‘‘ سوئٹزرلینڈ ،امریکہ ،اور برطانیہ کے ماہرین نوادرات کی مانگ پوری کرنے کے لیے تمام بیش قیمت نشانیاں بڑی بڑی لاریوں میں بھر کر لے گئے ۔

جب میں پہنچا تو ام القرب لٹ چکا تھا لیکن قریب کے امہ شہر میں لٹیرے ابھی بھی ڈیرا ڈالے ہوئے تھے ۔سات مربع میل کے علاقے میں چاروں طرف تہذیب کے سفر کی نادر نشانیاں بکھری پڑی تھی اور لٹیرے اپنے کام میں لگے ہوئے تھے جب میں ان کے پاس پہنچا تو وہ اپنے خیموں سے باہر نکل آئے ۔لٹیرے ہتھیار بند جوانوں کے ساتھ ہنسی مذاق کر رہے تھے ں ان جوانوں کے ساتھ جنہیں تاریخی وراثت کی حفاظت کرنی تھی لیکن میرے خیال

میں وہ بھی اس گھٹیا کام میں شامل تھے ۔ لال نقاب کے پیچھے چہرہ چھپائے ایک لٹیرے نے سمیریہ تہذیب کے عہد وسطٰی کے ایک برتن کا ٹکڑا اُٹھا کر مسکراتے ہوئے کہا کہ وہ نہیں جانتا اسے بنانے والے کون تھے وہ تو صرف زمین کھودتا ہے اور اسے جو ملتا ہے بیچ ڈالتا ہے لٹیروں نے صرف زمین ہی نہیں کھودی تھی، انہوں نے کئی جگہ پر قہر ڈھایا تھا۔ ہر ایک اینٹ ماضی کی ایک دستاویز تھی کیوں کے اس پر بنانے والے کے انگوٹھے کا نشان تھا۔ محل کا اگلا حصہ اور قریب میں واقع مندر انہیں اینٹوں سے بنے ہوئے تھے لیکن ماضی کا یہ بیش قیمت خزانہ بھی زیورات کی تلاش میں آئے لٹیروں کے قہر سے نہ بچ سکا ۔ پوشیدہ زیورات اور سکوں کی تلاش میں انہوں نے اینٹیں نکال کر پھینک دیں اور صرف دیوار ہی نہیں تقریباً پورے محل کو نیست نابود کر دیا ۔ بڑے پیمانے پر اس لوٹ کھسوٹ کا وسیع مطالعہ کرنے کے لئے لبنان سے آئی آثار قدیمہ کی ماہر جون فرچاخ کے مطابق گزشتہ ہزار سال میں تہذیب پر شاید کبھی ایسا قہر نہیں ٹوٹا ہوگا اور نا ہی اتنے بڑے پیمانے پر آثار قدیمہ کے اثاثے کو برباد کیا گیا ہوگا۔ انہوں نے کہا کہ سمیریہ تہذیب میں ام القرب اور امہ سب سے اہم شہر تھے لیکن اب تو یہ گزرے زمانے کی بات ہو گئی ہے ۔

پچھلی خلیجی جنگ میں بھی تھوڑی بہت لوٹ کھسوٹ ہوئی تھی اور نینوا میں لٹیروں نے قدیم محل کے نقش و نگار سے آراستہ دیوار چوری کر لی تھی ۔ بعد میں اس قدیم دیوار کا ایک ٹکڑا اسرائیل میں ایک ماہر نوادرات کے پاس برآمد ہوا۔ لیکن پچھلی بار ناکام رہنے والے چور بچی ہوئی دیوار چرانے کے لئے ایک بار پھر واپس آئے اور اس بار ڈنکے کی چوٹ پر اپنا کام پورا کر گئے ۔

فرچاخ نے کہا کہ یہ ماہرین نوادرات کی سازش تھی ۔ کیوں کہ کچھ چیزوں کے بغیر ان کا میوزیم ادھورا تھا لٹیرے ان کے پاس اکاڑیا کے برتن اور بہلون، نیز سمیریہ تہذیب کے بعد کے مرحلوں کے فن پارے تو موجود تھے لیکن ابتدائی مرحلوں کے کے فن پاروں کے بغیر ان کا میوزیم ادھورا تھا۔ لٹیرے اس پورے سامان کی فہرست اپنے ساتھ لائے تھے جن کی ماہرین نوادرات کو ضرورت تھی انہیں دو ہزار سال پرانے مجسموں کے سر کی ضرورت تھی ۔ دھڑ کی نہیں اسی لئے انہوں نے مورتیاں چور چور کر ڈالی اور سر اپنے ساتھ لے گئے صدام نے ماضی کی اس

بیش قیمت وراثت کو بچانے کی کوشش کی تھی لیکن امریکہ اس طرف آنکھیں موند کر بیٹھ گیا
گزشتہ سال موسم سرما میں جب یہ معلوم گیا تھا کہ جنگ ضرور ہو گی، اس وقت پنٹاگن نے
ماہرین آثار قدیمہ کے ساتھ بیٹھ کر میسوپوٹامیہ کی نشانیوں کو بچانے کی بابت بات ہوئی
تھی۔ ماہرین آثار قدیمہ پنٹاگن کو نصیریہ تہذیب کے باقیات کے بارے میں بتایا تھا۔ ان
باقیات کو میرے پہنچنے سے پہلے تباہ کر دیا گیا تھا۔ لیکن امریکہ ہر طرح کی تنبیہ کو نظر انداز
کرتے ہوئے
بموں کی قالین بچھانے میں لگا رہا۔ امریکہ نے بعد میں بے حد ڈھیٹ پن دکھایا۔ لوٹ
کھسوٹ کے بارے میں امریکہ کے ترجمان ایری فریشر نے یہ کہہ کر پلہ جھاڑ لیا کہ لوٹ مار
صدام کے دور اقتدار میں ہوئے جبر و استحصال کے خلاف فطری عمل تھا۔ وزیر دفاع
رمسفیلڈ نے بھی اس سے ملتا جلتا بیان دیا تھا لیکن اس وقت بے شرمی کی انتہا ہو گئی جب قطر
میں امریکی سنٹرل کمان کے ترجمان بریگیڈیر جنرل ونسنٹ بروکس نے کہا کہ کسی کو اس بات کا
اندیشہ نہیں تھا کہ عراقی عوام لوٹ مار کریں گے۔

امریکہ اس سے زیادہ بے ہودہ بیان دے بھی نہیں سکتا تھا۔ لوٹ مار کے لئے عراق
عوام کو قصوروار ٹھہرانا نسلی امتیاز والی ذہنیت نہیں تو اور کیا ہے؟ اس کے علاوہ یہ کہنا کہ لوٹ مار
کا اندیشہ نہیں تھا، سچ مچ مضحکہ خیز بات ہے۔ پنٹاگن میں ہوئی بات چیت کو نظر انداز بھی کر
دیں تو مختلف اخبارات نے نے جنگ سے پہلے لوٹ مار کا اندیشہ ظاہر کیا تھا۔ "انٹرنیشنل
ہیرالڈ" نے تو ۸ مارچ کو ایک تحریر میں صاف طور پر کہا تھا کہ عراق کے آثار قدیمہ والے
مقامات پر فوج تعینات کرنے کی ضرورت ہے۔ جنرل بروکس کے بیان پر سب سے پہلے بڑا
سوال امریکی فوج کا اخبار "اسٹار اینڈ اسٹرپس" ہی کھڑا کرتا ہے۔ اخبار نے ۲۳ مارچ کے
شمارے میں میگوائر گبسن کے "تہذیب کو خطرہ" کے عنوان سے اپنے مضمون میں ۱۹۹۱ء کی خلیجی
جنگ کا ذکر کرتے ہوئے تنبیہ کی تھی کہ بمباری کرنے کے بعد زبردست لوٹ مار ہو گی۔ اتنا
ہی نہیں، انہوں نے بغداد میوزیم میں رکھی ہوئی قیمتی اشیاء کے بارے میں بھی لکھا تھا کہ ان کی
حفاظت کرنا ضروری ہے مذکورہ اخبار کو امریکی فوج کے سپاہی سے لے کر افسران تک پڑھتے
ہیں پھر بھی جنرل بروکس کہتے ہیں کہ لوٹ مار کا اندیشہ نہیں تھا۔ امریکی صدر جارج بش، اور

برطانیوی وزیراعظم ٹونی بلیئر جنگ جیتنے کے بعد بھی وسیع تباہی پھیلانے والے ہتھیار نہیں ڈھونڈ سکے، الٹے سمیریہ کی وادیوں میں وحشی پن کے ننگے ناچ نے ان کی جیت کی چمک دمک کو اور دھند لا کر رکھ دیا۔

اپریل میں میرے ساتھ گئے ٹی۔وی۔نامہ نگاروں نے لٹے پٹے بغداد میوزیم کی بدحواس خاموشی کا نظارہ دکھانا شروع کیا۔امریکہ نے بھی بیوہ کی طرح بین کرنا شروع کر دیا۔لیکن لٹیروں سے میوزیم کو محفوظ رکھنے کے لئے امریکی ٹینکس ۱۶ اپریل کو پہنچے

جب راقم السطور نے میوزیم میں چور چور ہوئے قدیم برتن اور فن پارے دیکھے تو دوسری خلیجی جنگ کے وقت ہوئی لوٹ مار یاد آ گئی لیکن جب میں جنوبی عراق میں سمیریہ تہذیب کی اجڑی گود میں پہنچا تو مجھے احساس ہوا کہ تاریخ کے بیش قیمت اوراق غائب ہو گئے ہیں اور ہم اپنی جڑ سے ہی الگ ہو گئے ہیں۔اس نقصان کا موازنہ صرف سکندریہ کی اس لائبریری سے کیا جا سکتا ہے جسے چند سر پھروں نے نذر آتش کر دیا تھا۔امریکہ نے لوٹ مار کی جانچ اور لوٹے گئے باقیات کی تلاش کے لئے اپنی خفیہ ایجنسی تعینات کر کے اپنا دامن پاک صاف رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔وہ دنیا کو اس بات کا احساس دلا رہا ہے کہ اسے تہذیب و ثقافت کی بڑی فکر ہے لیکن اس کے جوان سمیریہ کے بارے میں جاننے کے لیے قدیم کلاسیکل شاعری ''گلگمیش'' پڑھ رہے ہیں۔ایک خفیہ ایجنٹ کی بات سے بھی امریکی دعوے کی پول کھل گئی کہ وہ تہذیب کا محافظ ہے اس ایجنٹ نے چھپی ہوئی ہنسی کے ساتھ مجھ سے کہا کہ یہاں آنے سے پہلے اسے لفظ عراق کہنا بھی نہیں آتا تھا۔

خفیہ ایجنسیوں نے اپنی تازہ رپورٹ میں کہا ہے کہ میوزیم کے ملازمین ۸ اپریل کو بھاگ گئے تھے اور اس کے بعد شروع ہوئی لوٹ مار ۱۲ اپریل کو قابو میں آئی لیکن یہ سراسر جھوٹ ہے۔جب ۱۱ اپریل کو میں میوزیم میں داخل ہوا تو لوٹ مار ختم ہو چکی تھی۔فرچاخ اور امریکی افسران بھی مانتے ہیں کہ منصوبہ بند لوٹ مار تھی۔جنگ شروع ہونے سے پہلے ہی انڈر ورلڈ اسمگلر اور آثار قدیمہ کے حریص نوادرات کی فرمائش کر چکے تھے، جسے پورا کرنے کے لئے لوٹ مار کی گئی اور الزام عراق کے معصوم عوام پر لگایا گیا۔

حقیقت میں امریکہ اتنی آسانی سے بری نہیں ہو سکتا۔عراق میں قانون و انتظام

بحال کرنے بغداد پہنچے اس کے جوانوں کی ترجیح مجرموں کو سزا دینا نہیں تھا۔ مجسمے، برتن، زیورات لوٹ کر بھاگنے والے سڑکوں پر پکڑے تو گئے لیکن انہیں سزا نہیں ملی۔ سامان واپس لے کر امریک فوجیوں نے انہیں چھوڑ دیا...... پھر سے ایسا ہی کام کرنے کا حوصلہ دے کر۔ صاف ظاہر ہے کہ اس کے پیچھے نیویارک، لندن، اور جنیوا میں بیٹھے ان کے سرپرستوں کا ہاتھ تھا۔ امریکہ کا کہنا ہے کہ وہ میوزیم کے سامان کی حفاظت محض اس لئے نہیں کر سکا کیونکہ وہاں لڑاکے چھپے ہوئے تھے اور ان کی آڑ میں لٹیرے اپنا کام کر گئے۔ یہ بات صحیح بھی ہے کیوں کہ میوزیم میں ٹہلتے ہوئے مجھے ایک اے۔ کے ۴۷ رائفل ملی تھی۔ لیکن امریکہ اتنے سے بے گناہ ثابت نہیں ہوتا۔ عراق حتّی کہ امریکہ میں بھی کئی لوگ مانتے ہیں کہ تاریخ کے ساتھ زنا بالجبر کے لئے امریکہ کافی حد تک ذمہ دار ہے لیکن سمیریہ تہذیب کی باقیات کی وحشیانہ تباہی کی کہانی جاننے کے بعد شاید دنیا کے ہر کونے سے آواز اُٹھے گی اور امریکہ پر سوالیہ نشان بھی کھڑا کیا جائے گا۔ لیکن امریکہ کو پہلے بھی اس سے کوئی سروکار نہیں رہا ہے ۱۹۴۹ء کے جنیوا کنونشن میں ہوئے سمجھوتے میں مسلح لڑائی کے وقت تہذیبی وراثت کے تحفظ کے بارے میں بھی ایک پیرا تھا۔ لیکن امریکہ نے اس سمجھوتے پر دستخط نہیں کئے تھے۔

عراق میں امریکہ کے ناک کے نیچے لوٹ کھسوٹ کا دور ابھی تک جاری ہے۔ عالمی بازار میں سمیریہ تہذیب اور میسو پوٹامیہ کے باقیات کی زبردست مانگ نے لیڈروں کے لئے ڈالروں سے بھرے بوروں کے منہ کھول دیئے ہیں۔ لٹیروں نے بھی پورا میسو پوٹامیہ عالمی بازار میں پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ لیکن عالمی ماہرین آثار قدیمہ کی بھوک ابھی بھی ختم نہیں ہوئی ہے۔ بیش قیمت تہذیبی دولت والے عراق کو کنگال کیا جا رہا ہے اور امریکہ اب بھی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا ہے۔ وہ کچھ کرے بھی کیوں؟ اسے ہزاروں سال پُرانے امہ شہر کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے، کیوں کہ اب وہ شہر ختم ہو چکا ہے۔ خاموشی کے ساتھ آنسو بہاتے ہوئے تاریخ کے اوراق میں سما چکا ہے۔

افسانے

شب مراقبہ کے اعترافات کی چوتھی کہانی

رشید امجد

عجب خوشبو بھرے دِن تھے۔ پیلے پھول نئے ہمکتے ہوئے موسم کی آمد آمد کی خبریں پھیلا رہے تھے وہ سیر کرتے ہوئے جھوم جھوم جاتا کہ یہ دن خوشبو کے دن تھے۔ اس کی خوشبو کی حس سال سن ہفتہ دس دن کے لئے ہی بیدار ہوتی تھی ورنہ سارا سال اسے خوشبو بدبو سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اچانک ہی کسی کھلکھلاتی صبح شیو کرتے ہوئے اسے احساس ہوتا کہ شیونگ کریم میں تو خوشبو بھی ہے۔ اس پر وہ وجدانی کیفیت میں آ جاتا۔ صابن کو اُٹھا کر سونگھتا۔ شیونگ کریم کو تھپتھپا کر چہرے پر ملتا، بعد میں کریم بھی لگاتا، خوشبو کا اسپرے کرتا۔ اس کی ملنے جلنے والوں کو معلوم ہو جاتا کہ یہ خوشبو کے دن ہیں۔ سب سے پہلے تو بیوی ہنستی۔۔۔" لگتا ہے تمہاری ناک کھل گئی ہے۔"

وہ جھومتے ہوئے کہتا۔۔۔" ہر طرف خوشبو ہی خوشبو ہے"

لیکن خوشبو کا یہ رقص چند دن ہی رہا، پھر کسی دن اچانک اسے احساس ہوتا کہ شیونگ کریم میں خوشبو نہیں، صابن خوشبو سے خالی ہے۔۔۔ بس پھر وہی لمبا عرصہ نہ خوشبو نہ بدبو۔ خوشبوؤں کا عرصہ مختصر سا ہوتا لیکن سال بھر کی کوفت دور کر جاتا، ذہن میں نئی نئی باتیں آتیں۔ مرشد سے لمبی لمبی بحثیں ہوتیں۔

یہ دن۔۔۔ رقص کرتے دن، خوشبوؤں کے نام تھے، لیکن مرشد حسب معمول غائب، لمبی سیر کر کے آس پاس کے پھولوں کی خوشبو سونگھتے، وہ تالاب کنارے پڑی سل پر آ بیٹھا اور تیرے کنولوں کو دیکھنے لگا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟"

وہ چونکا۔مرشد چپ چاپ آ کر بیٹھ گیا تھا۔

''سوچ رہا ہوں۔۔۔'' وہ بولا ۔۔۔''صاف پانی میں تو سبھی غوطہ لگاتے ہیں، کیوں نہ اس تالاب میں جھانکا جائے''

مرشد مسکرایا۔۔۔''کنول کی تہہ دیکھنا چاہتے ہو؟''

''ہاں'' وہ بڑبڑایا۔۔۔''میرے بچپن میں کنول کی جڑوں میں پایا جانے والا ایک پھل بِکا کرتا تھا' جسے کول ڈوڈے کہتے تھے''

''وہ تو اب بھی موجود ہیں'' مرشد بولا ۔۔۔''لیکن اب لوگوں کی پسند بدل گئی ہے،وہ ایسی چیزیں نہیں کھاتے''

ٹھیک کہتے ہو ۔۔آج صبح میں نے چائے میں روٹی بھگو کر کھائی تو میرے بچے حیرت سے دیکھنے لگےاور ماں سے پوچھنے لگے کہ ابو یہ کیا گند کر رہے ہیں''

مرشد ہنسا۔۔۔''تمہاری بیوی نے کہا ہوگا اپنا پینڈو پن نہیں بھولتے''

''یہی کہا تھا ۔۔''وہ بھی ہنسا ۔۔''میرا جی چاہتا ہے کنول کی جڑوں سے کول ڈوڈے نِکالوں''

''پھسل کر اندر جا گرے تو پھر وہیں رہو گے'' مرشد بولا

''پھر کیا۔۔۔یہ تجربہ بھی ہوا''

''اب نئے نئے تجربے کرنے کی تمہاری عمر نہیں ہے'' بیوی غصے سے بولی

''ہر نئے تجربے کی گود میں ایک نیا ہمکتا ہوا خیال ہوتا ہے''اُس نے سوچا' لیکن چپ رہا بیوی دوسرے کمرے میں چلی گئی تو وہ خیالوں کی پگڈنڈی پگڈنڈی دور تک پھیلے مرغزاروں میں پہنچ گیا۔خوشبوئیں ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے رقص کر رہی تھیں ۔ہوا گِد اں بجاتی ،ہنس ہنس کر دُہری ہوتی جا رہی تھی۔

مرشد بولا ۔۔۔''اُس کا ہونا بھی ایسے ہی ہے جیسے پھول میں خوشبو''

اُس نے کچھ دیر سوچا۔۔۔''تو پھر اس کے ساتھ چلنے کے لئے ہوا بننا ضروری ہے''

دونوں ہوا بن گئے اور اُڑتے پھرے' ٹہنی ٹہنی، پھول پھول، دیر تک اُڑنے کے بعد رُکے تو دیکھا کہ ایک شخص اشاروں سے پوچھ رہا ہے۔

وہ چونکا۔مرشد چپ چاپ آ کر بیٹھ گیا تھا۔

''سوچ رہا ہوں۔۔۔'' وہ بولا ۔۔۔''صاف پانی میں تو سبھی غوطہ لگاتے ہیں، کیوں نہ اس تالاب میں جھانکا جائے''

مرشد مسکرایا۔۔۔''کنول کی تہہ دیکھنا چاہتے ہو؟''

''ہاں'' وہ بڑبڑایا۔۔۔''میرے بچپن میں کنول کی جڑوں میں پایا جانے والا ایک پھل بِکا کرتا تھا' جسے کول ڈوڈے کہتے تھے''

''وہ تو اب بھی موجود ہیں'' مرشد بولا ۔۔۔''لیکن اب لوگوں کی پسند بدل گئی ہے،وہ ایسی چیزیں نہیں کھاتے''

ٹھیک کہتے ہو ۔۔آج صبح میں نے چائے میں روٹی بھگو کر کھائی تو میرے بچے حیرت سے دیکھنے لگے اور ماں سے پوچھنے لگے کہ ابو یہ کیا گند کر رہے ہیں''

مرشد ہنسا۔۔۔''تمہاری بیوی نے کہا ہوگا اپنا پینڈو پن نہیں بھولتے''

''یہی کہا تھا ۔۔''وہ بھی ہنسا ۔۔''میرا جی چاہتا ہے کنول کی جڑوں سے کول ڈوڈے نِکالوں''

''پھسل کر اندر جا گرے تو پھر وہیں رہو گے'' مرشد بولا

''پھر کیا۔۔۔یہ تجربہ بھی ہوا''

''اب نئے نئے تجربے کرنے کی تمہاری عمر نہیں ہے'' بیوی غصے سے بولی

''ہر نئے تجربے کی گود میں ایک نیا ہمکتا ہوا خیال ہوتا ہے''اُس نے سوچا' لیکن چپ رہا بیوی دوسرے کمرے میں چلی گئی تو وہ خیالوں کی پگڈنڈی پگڈنڈی دور تک پھیلے مرغزاروں میں پہنچ گیا۔خوشبوئیں ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے رقص کر رہی تھیں ۔ہوا گِدا اں بجاتی ،ہنس ہنس کر دُہری ہوتی جا رہی تھی۔

مرشد بولا ۔۔۔''اُس کا ہونا بھی ایسے ہی ہے جیسے پھول میں خوشبو''

اُس نے کچھ دیر سوچا۔۔۔''تو پھر اس کے ساتھ چلنے کے لئے ہوا بننا ضروری ہے''

دونوں ہوا بن گئے اور اُڑتے پھرے' ٹہنی ٹہنی، پھول پھول، دیر تک اُڑنے کے بعد رُکے تو دیکھا کہ ایک شخص اشاروں سے پوچھ رہا ہے۔

پوچھا۔۔۔"اے شخص کیا کر رہا ہے"

وہ بولا۔۔۔"دیکھتے نہیں میں اُس سے گفتگو کر رہا ہوں"

کہا۔۔۔"یہ کیسی گفتگو ہے جس میں لفظ نہیں"

اُس نے جواب دیا۔۔۔"لفظ گمراہ کرتے ہیں اور درمیان میں ایک پردہ کھینچ دیتے ہیں، میں نے عرصہ ہوا لفظ ترک کر دیئے۔اب اُس سے گفتگو کرنے کے لئے مجھے کسی وسیلے کی ضرورت نہیں"

اُس نے مرشد کی طرف دیکھا'

مرشد نے کہا۔۔۔"یہ شخص اگلے پڑاؤ پر ہے"

وہ اُسے اُسی حالت میں چھوڑ کر مڑے۔

اُس نے پوچھا"یہ میرے ساتھ کیا ظلم ہے کہ سال میں صرف چند دن میرے ہیں"

مرشد بولا۔۔۔"اسے بھی غنیمت سمجھو کہ چند دن تو تمہارے ہیں"

اُس نے جھنجلا کر کہا۔۔۔"یہ میری بے بسی ہے"

مرشد بولا۔۔"بے بسی بھی ایک کیفیت ہے"

اُسے بڑا غصہ آیا۔۔۔"ہر چیز ہی ایک کیفیت ہے تو میں کہاں ہوں؟"

"کیوں نہیں؟"

"یہی تو سفر کا آغاز ہے،اس کیوں کو تلاش کرو،جانو اور سمجھو"

وہ جھنجلایا ہوا تھا،بُری طرح جھنجلایا ہوا تھا۔۔۔بولا"خوشبوئیں مدہم ہو رہی ہیں۔پھر وہی ایک طویل خشک موسم"

مرشد نے کہا۔۔۔"آؤ کنول کے تالاب پر چلیں"

دونوں پتھر کی سِل پر بیٹھ گئے تادیر چپ رہے پھر مرشد نے کہا۔۔۔"پھول تالاب کی سطح پر کھلے ہیں اور نیچے کائی اور سرانڈ ہے" پھول کی قسمت یہی کہا ہے"

"ٹھیک کہتے ہو" وہ بڑبڑایا اور چپ چاپ گھر کی طرف چل پڑا۔

تتلی

احمد جاوید

بھاگتے پھرنا ہی اُس کا کام تھا۔دن ہوتو تتلیاں ہوتیں شام ہوتی تو جگنو۔تتلی چونکہ مُٹھی میں سماتی نہیں تھی اس لئے چٹکیوں میں لیتی، کچھ دیر جھلاتی پھرتی پر کسی پھول ،اس طرح رکھ دیتی جیسے اُسے اُلٹایا ہوتا۔جگنوں سے البتہ اُس کی دوستی اور طرح کی تھی۔یوں ہی ہاتھ بڑھا کر کسی ایک کو اپنی ہتھیلی پر لے لیتی پھر دوسرے ہاتھ سے اُس پر اوٹ کرتی،اور جھانک جھانک دیکھتی ایسے جیسے کوئی قیمتی موتی ہاتھ آ گیا ہو۔

میں اُسے پنکھ پھیلا کر آتے اور کیاریوں میں داخل ہوتے اکثر دیکھتا۔دیکھتا اور اپنا کام بھول جاتا۔

میں اُس کا نام نہیں جانتا تھا۔اصل میں اُس کا کوئی نام تھا ہی نہیں ۔جب اُس کا کوئی نام نہیں تھا تو میں بھلا کیسے جان لیتا۔مگر کیا کوئی آدمی نام کے بغیر بھی ہوا ہے۔ہاں وہ تھی۔اسمیں اُس کا کوئی قصور نہیں تھا۔اُس کی ماں اسکا نام رکھنا بھول گئی تھی۔

چونکہ اُس کا کوئی نام نہیں تھا لہٰذا جن کا جو جی میں آتا پکار لیتا۔ہر روز ایک نیا نام ہوتا۔سو وہ کہ جس کا کوئی نام نہیں تھا کتنے ہی اُس کے نام ہو گئے۔یہی نہیں بلکہ خود اُس نے بھی اپنے کئی نام رکھ لئے۔دن ہوتا تو خود کو تتلی کہتی رات ہوتی تو جگنو اور پھر ہنستی۔

اُس کا گھر ہماری گلی میں نہیں تھا۔سچ پوچھو تو اُس کا گھر کسی بھی گلی میں نہیں تھا۔ہم جس آبادی میں رہتے تھے وہاں ایک خالی قطعہ زمین پر کچھ مزدور پیشہ جھونپڑیاں ڈال کے رہتے تھے بس اسی میں ایک اُس کا بھی ٹھکانا تھا۔

جیسے اُس کی کوئی گلی نہیں تھی اور اُس کا نام نہیں تھا ایسے ہی اُس کے سپرد کوئی کام

نہیں تھا۔اُس کی ماں کسی نہ کسی کام سے اُسے صدائیں دیتی رہتی مگر طرح دے جاتی۔اُسے کاموں سے کیا غرض تھی۔ایک عمر میں تتلیوں اور جگنوؤں کے پیچھے بھاگنے پھرنے کے علاوہ بھی کوئی کام ہوا ہے؟

ہم جس علاقے میں رہتے تھے وہاں گھروں کے اندر پھولوں کی رنگارنگ کیاریاں تھیں اور گھروں کے باہر چھوٹے بڑے خوشنما سبزہ زار تھے۔یہ سب میرے دیکھنے کے لئے ہی بھی تھا مگر مجھے ان کے درمیان ہونے کا بہت کم موقع ملتا۔میرے باپ نے میرے لئے ایک منزل متعین کی تھی مجھے اس کی طرف ہر وقت گامزن رہنا تھا۔صبح ہوتی تو سکول کے لئے روانہ ہونا لازم تھا۔شام ہوتی تو گھر کے لئے ملا ڈھیروں کام نمٹانے کی دردسری ہوتی۔جب میں سکول کے لئے نکلتا اور اپنی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے باہر جھانک کر اُسے دیکھتا تو دکھ سے سوچتا کہ مجھے ایسی فرصت کیوں میّسر نہیں۔مگر کیا کرتا کسی کسی کو عمر بھر ایسی فرصت نہیں ملتی کہ وہ پھولوں اور تتلیوں اور جگنوؤں کے درمیان بسر کر سکے۔

پھولوں اور تتلیوں کا زمانہ بہت دیر قیام نہیں کرتا۔عمر کو نکلنے میں کتنی دیر لگتی ہے۔وقت بدلتا ہے تو آدمی اور کا اور ہو جاتا ہے۔

میں ابھی اور کا اور نہیں ہوا تھا۔عمر بھی ابھی کہاں نکلی تھی۔وہی ایک متعین منزل تھی جس کا حصول ابھی باقی تھا۔ہاں شہر ضرور بدل گیا تھا۔گھر کی جگہ ہاسٹل تھا۔معمول اب بھی وہی تھا۔صبح ہوتی تو یونیورسٹی کے لئے نکلتا دن بھر لائبریریوں کی خاک چھانتا رات بھی پڑھنے لکھنے میں سر کھپاتا۔سستانے کو کچھ دیر باقی تھی۔تتلیاں اور جگنو ابھی میرا مقدر نہیں تھا۔

تھک کر بیٹھ جانے کا ابھی وقت تو نہیں تھا مگر آدمی خود کو لاکھ روکے کہیں کوئی سایہ دار پیڑ آ جائے تو بیٹھ ہی جاتا ہے۔یہی زندگی ہے۔منزل بدلنے میں کتنی دیر لگتی ہے۔

یونیورسٹی کی نیم تاریک راہداریوں میں چلتے پھرتے میں نے کسی کو ہنستے دیکھا تو ایک لمحے کے لئے معمول فراموش ہوا۔مُڑ کر دیکھا تو کوئی آنچل لہرایا جیسے تتلی نے اپنے رنگین پر کھولے ہوں۔میرے ہاتھوں سے کتابیں اُچھل کر نیچے جا گریں۔جب میں کتابیں اُٹھانے کو جُھکا بیٹھا سر اُٹھائے اُسے حیرت سے دیکھ رہا تھا تو وہ زیرلب مُسکرا رہی تھی۔ایسے جیسے اوس سے بھیگے پتوں پر کوئی جگنو جل بجھ رہا ہو۔

وہ جو تتلی کی طرح تھی اُس کے رنگین پر ایک دن میری چنکی میں آ گئے ۔ مجھے اپنی قسمت پر ناز تھا۔منزل کو فراموش ہوئی ،مگر اب منزل کی کسے ہوش تھی۔ پھولوں سے بھری کیاریوں کے درمیان بیٹھے بیٹھے شام ہو جاتی۔

اُس دن تمہیں کیا ہو گیا تھا، کتابیں اُچھل کر دُور کیوں جا پڑی تھیں۔؟ بہت دنوں بعد جب اُس کی قربت حاصل ہوئی تو وہ میری بدحواسی کو یاد کر کے ہنس پڑی۔

''تمہاری ہنسی پر مجھے کچھ یاد آ گیا تھا۔''

''کون یاد آ گیا تھا۔'' وہ روٹھ گئی۔

کوئی بھی نہیں ، کچھ بھی نہیں ، میں اُس کے روٹھنے پر بدحواس ہو گیا۔

''کوئی تو تھا،کوئی تو ہوگا۔'' حسد لاحق ہو جائے تو وہ کب جان چھوڑتا ہے۔

'' کچھ بھی نہیں تھا،بس ایسا لگا تھا جیسے کچھ یاد آ گیا ہو۔''

وہ مطمئن نہیں ہوتی تھی ۔ اکثر پوچھتی رہتی تھی۔ اصرار کرتی رہتی تھی مگر صرف اُس وقت جب وہ ہنستی ہوتی۔ جب وہ ہنستی ہوتی تو اُسے میری آنکھوں میں کوئی اور ہی منظر دکھائی دیتا۔کوئی بہت ہی اجنبی منظر۔پھر وہ ہنستے ہنستے رک جاتی۔ مجھے حیرت سے دیکھتی۔

''بتاؤنا۔۔۔۔۔؟''

میں اُسے کیسے یقین دلاتا مجھے کچھ یاد نہیں آتا بس ویسے ہی کچھ بہت مانوس سا لگتا ہے۔میرا دھرم اگر ہندوانہ طرز پر ہوتا تو اُسے باور کرا سکتا کہ شاید کوئی پچھلے جنم کی بات ہے۔

وہ یاد جو کہیں ذات کے اماں خانے پر نقش ہوتی ہے وقت اُس پر اپنی دھول ڈال دیتا ہے۔مٹا دیتا ہے مگر جو بے چینی دل میں رکھ لیتا ہے وہ تو کسی نہ کسی صورت ہمکتی رہتی ہے مگر بس صرف بے چینی ہوتی ہے یاد کچھ بھی نہیں ہوتا اُسے دیکھ دیکھ کر ایسی ہی بے چینی ہوتی تھی۔

گردو پیش ہی نہیں اپنا آپ بھی فراموش ہو جاتا آنکھوں کے آگے بس ایک تتلی اُڑتی پھرتی۔

خود فراموشی کے دن تھوڑے تھے میں نے پھولوں کی کیاریوں کی اُوٹ میں اُس کے ہمراہ بیٹھے بیٹھے موسموں کے گذرنے کی چاپ نہیں سُنی تھی۔ بہت بُرا ہوا ہے اتنے دن نکل گئے۔امتحان سر پہ آ گیا وہ منزل یاد آ گئی جس کا تصور مجھے اپنے شہر سے لے کر چلا تھا۔زندگی کی رنگینیوں کا دریا سراب ہو گیا۔ میں اُس کا اُڑتا آنچل چھوڑ کر کتابیں اُٹھا کر گھر لوٹ گیا۔

بدحواسی نے رُکنے نہ دیا۔ تنہائی اور یکسوئی کی ضرورت تھی۔ یہ ایک نئی بے چینی تھی۔

یہ بس اسی زمانے کے ساتھ ہے کہ بدحواسی اور عجلت زیادہ دیر ستانے نہیں دیتے کسی منزل کے حصول کی خواہش ہر کسی کو اُڑائے پھرتی ہے۔ میری صحبتیں اور میری شامیں ایک دفعہ پھر کسی منزل کی اسیر ہوئیں میں کتابیں لے کر صبح ہوتے ہی گھر کے لان میں آ بیٹھا اور پھر سہ پہر ڈھلنے تک بیٹھا رہتا۔

میں بیٹھا رہتا مگر میرے اردگرد وہ رنگین آنچل لہراتا رہتا جسے میں یونیورسٹی کی نیم تاریک راہداریوں میں چھوڑ آیا تھا۔ جب سے بے چینی دل میں گھر کرتی تو اُٹھ کر گھر سے باہر سڑک پر آ کھڑا ہوتا۔ آدمیوں اور گاڑیوں اور سائیکلوں کو دیکھتا رہتا۔ اُس کے دھیان سے نجات کی بس یہی ایک صورت تھی۔

ہجوم کو دیکھتے رہنے میں میں نے اُسے ایک روز پھر دیکھ لیا۔ وہی کہ جسے دن میں تتلیاں اچھی لگتی تھیں اور رات میں جگنو۔ اتنا عرصہ ہوا اُسے تو میں نے بہلایا ہی بیٹھا تھا۔ مگر کیا اُسے یاد رکھنا ضروری تھا؟۔ اگر ضروری بھی تھا تب بھی اب وہ ویسی نہ تھی جیسی ہوا کرتی تھی۔ یا جیسا اُسے اب ہونا چاہیے تھا۔ مجھے افسوس تھا کہ اب اُسے دیکھنے یا اُس پر رشک کرنے والی کوئی بات نہ تھی۔ نہ آنکھوں میں شرارت نہ ہونٹوں پر ہنسی اب تو جیسے اُس کی فراغت بھی کہیں رخصت ہوگئی تھی اور کوئی کام آ پڑا تھا۔

جنہیں کوئی کام آ پڑے اُن کا ڈھنگ بھی بدل جاتا ہے۔ وہ بھی اب اور طرح کی ہوگئی تھی مگر بُرا احوال تھا اس کا۔ میلے چکٹ کپڑوں اور اُلجھے ہوئے بے ترتیب بالوں کے ساتھ وہ ایک گلی سے دوسری اور دوسری سے تیسری میں داخل ہونے کے عمل میں مبتلا رہتی اور گھروں میں داخل ہوتی نکلتی۔ میں فرصت سے ہوتا تو کھڑا اُسے دیکھتا۔ میں اُسے دیکھتا اور حیران ہوتا کہ اُس کے اندر جو ایک تتلیوں سے بھری ایک پھولوں کی کیاری تھی وہ کیسے کملا گئی۔ اب تو ایک ملگجا سا بیزار کُن دن تھا۔ بس ویسا ہی جیسا جاڑے کی سہ پہروں میں ہو جاتا ہے۔ جب آسمان بادلوں سے بھر جائے۔

مجھے کبھی کبھی خواہش ہوتی تھی کہ عمر کی وہ ننھی سی گھڑی ایک مرتبہ پھر لوٹ آئے۔ وہ میرے سامنے آئے اپنی بند مٹھی پر میری آنکھوں کے سامنے کھولے اور ہنس پڑے۔ کوئی

کھلکھلاتی ہوئی ہنسی سُنے بہت عرصہ گذر گیا تھا۔

مٹھی تو اب بھی اُسکی بند رہتی تھی جسے وہ اپنی بغلوں میں چھپائے رکھتی جیسے کوئی قیمتی متاع اُس میں چھپی ہو مگر وہ اُسے کھولتی نہیں تھی۔

وہ بند مٹھی کو بغلوں میں دبائے جدھر سے بھی گذرتی اوباش لڑکوں کی سیٹیاں اُس کے ہمراہ ہوتیں اُس پر عمر جو ایک ایسی آئی بیٹھی تھی۔اور وہ جو اُس کی عمر کی کشش ہو میں تھے اشارہ کرتے بلاتے۔

اوباش لڑکوں کا اجتماع پڑوش کے کسی گھر میں ہوتا تھا۔وہ ادھر سے گذرتی تو جیسے طرح دکے جاتی مگر وہ یونہی نوٹ لہراتے سامنے آ کھڑے ہوتی۔اُسکی ماں یاد دلاتے جسے لقوہ مار گیا تھا۔اور زندگی کا سہل راستہ بتاتے۔مگر سہل راستے میں دلدل تھی۔میں اُسے دلدل سے بچ کر چلتے۔لڑکھڑاتے بعد سنبھل جاتے دیکھا کرتا۔مگر جب فراغت سے ہوتا۔

اُن بیزار کن دنوں میں جب لکھنے پڑھنے میں جی نہیں لگتا تھا اور اُس کا خیال جسے میں پیچھے کہیں چھوڑ آیا تھا ریشم کے دھاگے کی طرح میرے وجود سے لپٹا رہتا اُس میلی کچیلی لڑکی کو دیکھنے اور اُس کے بارے میں متفکر رہنے میں کیا حرج تھا۔دھیان بٹانے کی ایک سبیل بھی تو تھی مگر ایک روز ایک خط موصول ہوا۔

''لوٹ آؤ''۔۔۔ورنہ تاخیر ہو جائے گی''

بیزاری کے دن یکلخت ختم ہوئے میں ایک اور طرح کی بدحواسی نے اپنی گرفت میں لے لیا میں اب جست بھرنے میں وہاں پہنچ جانا چاہتا تھا۔جہاں کسی اُڑتے آنچل کی خوشبو تھی۔گرد و پیش کی ہر چیز معدوم ہونے لگی۔

شام ابھی سنولائی نہ تھی بس دن بجھ گیا تھا۔جب میں نے کتابیں سمیٹیں بیگ کاندھے سے لٹکایا گھر کو الوداع کہا اور باہر سڑک پر کسی سواری کے انتظار میں آ کھڑا ہوا۔باہر سبزہ زار سے تتلیاں ابھی رخصت نہ ہوئی تھیں مگر اس کے بارے پودوں میں کہیں کہیں کوئی جگنو سا جگمگانے لگا تھا۔مگر مجھے ان منظروں سے کوئی غرض نہ تھی پہلے ہی بہت تاخیر ہو چکی تھی۔

گھروں کے درمیان سے گذرنے والی سڑکوں پر زیادہ ٹریفک نہیں ہوتی مگر مجھے جلد ہی سواری مل گئی اب مجھے بیٹھنا تھا اور نکل لینا تھا۔مگر اچانک اُس میلی کچیلی لڑکی کو عجب

وحشت میں دیکھا۔ اور تھم گیا۔ وہ بدحواسی کے عالم میں اُس گھر سے نکلی تھی جہاں اوباشوں کا اجتماع رہتا تھا۔ ڈوپٹہ کاندھے سے لڑھک گیا تھا۔ ایک بازو سے پھٹی ہوئی قمیض کا چیتھڑا لٹک رہا تھا۔ میں حیران تھا اسے کیا ہوا؟۔

وہ اپنے بکھرے ہوئے احوال سے بے نیاز سرپٹ بھاگے چلی جا رہی تھی۔ شاید گھر پہنچ جانا چاہتی تھی۔ وہ پہنچ گئی ہوئی مگر مخالف سمت سے آنے والی گاڑی نے اُسے نکلنے نہ دیا۔ بچاتے بچاتے اُلٹ ہی دیا۔ وہ اُچھلی۔ ہوا میں لہرائی اور ایک دیوار سے ٹکرا کر زمین پر ڈھیر ہو گئی۔ سناٹا سا ہو گیا۔

ایک لمحے کو یوں ہوا جیسے کائنات کی ہر چیز ساکت ہو گئی ہو۔ پھر کہیں بہت دیر بعد واپسی کے سفر پر جاتے ہوئے پرندوں نے آسمان پر شور کیا تو نیچے ایک ہجوم بن گیا۔ لوگ چاروں طرف سے آ آ کر اُس کے گرد اکھٹا ہو گئے تھے۔ ہجوم میں ہر کوئی اُس کی سانسیں تلاش کر رہا تھا۔ جواب شاید باقی نہیں رہی تھیں۔ آناً فاناً ہوا ہو گئی تھیں۔

وہ بکھری ہوئی پڑی تھی۔ صرف ایک بھینچا ہوا ہاتھ بغل میں تھا۔ جانے اسکی مٹھی میں کیا ہے؟ بھیڑ میں سے کسی کو تشویش تھی کہ جیسے وہ کچھ کہیں سے لے کر بھاگی ہو۔ جانے اسکی مٹھی میں کیا ہے؟

تھوڑی دیر میں ہر ایک کو یہ تشویش تھی۔ تشویش تو مجھے بھی تھی مگر خیال کیا۔ تتلی ہو گئی یا جگنو۔

اسکے ڈھیلے پڑے ہوئے جسم میں مٹھی کی گرفت بڑی سخت تھی۔ کھولنے والے کو بڑی جدوجہد کرنا پڑی۔ مگر پھر ایک ایک کر انگلیاں کھل گئیں۔ انگلیاں تو کھل گئیں مگر بھینچے ہوئے ہاتھ میں کچھ بھی نہ تھا بس چند مڑے تڑے کرنسی نوٹ تھے۔ مجھے افسوس ہوا۔ نہ تتلی تھی نہ جگنو تھا۔

لوگ اُسے اُٹھا کر لے گئے۔ بھیڑ چھٹ گئی۔ سواری والا ہارن بجا بجا کر مجھے بُلاتا رہا پھر وہ بھی رخصت ہو گیا۔ دیر ہو گئی تھی مگر میں تاریکی میں کھڑا عجب مخمصے میں تھا۔ جانے مجھے کہاں جانا تھا؟

کالی گھوڑی والا

خالد محمود خان

وہ دونوں اپنے گھروں میں خوش اور ہمسائیوں کے حوالے سے بہت دکھی تھیں۔ان دونوں نے ایک دوسری کی زندگی کو اجیرن کر دیا تھا۔ان کے گھر میں سکھ اور دیواروں پر دکھ تھا۔خوشی ان کے گھروں میں اگتی تھی اور چھتوں پر آگ برستی تھی۔اس آگ نے ہمسائے خاندانوں کے افراد،خواتین اور بچوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔مسائل میں گھرے ہوئے خاندانوں کے سروں پر رحمتوں کے سارے بادل بن برسے ہی گزر چکے تھے۔بڑے،بزرگ،نجومی جوتشی،پیر فقیر،عطائی قصائی تعویز گنڈے،بھوت چڑیل،جن اور ڈنڈے کے ماہرین سب کے سب بھگت چکے تھے۔سنیاسیوں کے متعلق انہیں اپنے علم زیادہ اعتماد نہ تھا۔کالے بکرے کا گوشت اور اجوائن کا دھواں بھی آزمایا گیا۔نابیناؤں کے سُرمہ کا شیشہ نہ دشمن کی شکل دکھا سکا نہ اپنی شکل کی وضاحت کر سکا۔ٹونے ٹوٹکے رنگ نہ لائے اور رفتہ رفتہ سارے سہارے ٹوٹنے لگے۔آخر کار دونوں ہمسائیاں شہر کی ایک مضافاتی بستی میں اپنے گھروں کی چھتوں پر پہروں کھڑی رہتیں اور کالی گھوڑی والے کا انتظار کرتیں۔ان کا خیال تھا کہ وہ گلی سے گزرتے ہوئے جو عمل تجویز کر دے گا وہی ان کے مسائل کا حل ہوگا۔اس کے آنے میں دیر ہوتی گئی اور انتظار کے ہر لمحے میں ان کا عقیدہ مضبوط ہوتا گیا۔ایک نے اپنے سینوں کے اردگرد بازوؤں کی چوکور کسی ہوئی ہوتی اور دوسری کی کمر کے اردگرد تکونیں لٹکی رہتیں تھیں۔دونوں کی خواہش تھی کہ وہ کالی گھوڑی والے سے اپنا سوال دوسری سے پہلے پوچھ لے اور وہ دیکھتی رہ جائے۔

مگر کالی گھڑی والا نہ کبھی آیا نہ اسے آنا تھا نہ بلایا جا سکتا تھا۔ گھوڑوں اور گھوڑیوں کا نظام دیہاتوں سے بھی اٹھا جا رہا تھا۔ پگڈنڈیاں راستوں اور راستے سڑکوں میں بدل چکے تھے۔ چوپائی سواریوں کی بجائے سائیکل، موٹر سائیکل، ٹیکسی۔ رکشہ۔ ویگن اور بس نے لے لی تھی۔ شہروں میں گھوڑوں یا گھوڑیوں کے متعلق سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ کبھی کبھار کوئی مریل گھوڑا تانگے یا ریڑھے میں جتا نظر آ بھی جاتا تو اس میں گھوڑا پن دکھائی نہیں دیتا تھا۔ بس اس کی ٹاپ سے اندازہ ہوتا تھا کہ کوئی زندگی کا سفر پورا کرتا پھرتا ہے۔ اس کے مالک کو لوگ سڑکوں کے کناروں ہی سے پکارتے ''تانگہ!'' اور اترتے ہوئے چند سکے تانگہ بان کی ہتھیلی پر رکھ جاتے۔ ایسے گھوڑے اور اس کے مالک میں کوئی عطا نہ تھی جو کالی گھوڑی اور اس کے سوار سے منسوب تھی۔

کبھی کبھی ایک ہمسائی دوسری کو ''بڈھی گھوڑی اور لال لگام'' کا طعنہ تڑ کا لگا تیاور دوسری کہتی ''گھوڑیوں کا کیا ہے۔ اصل بات سوار کی ہے۔'' ''کالی گھوڑی والا'' پہلی ہمسائی لفظ چبا چبا کر بات کرتی۔ اور اپنے نشتر کو زہر میں بجھاتے ہوئے کہتی ''تمہارے لئے کالی دھوتی والا ہی کافی نہیں؟'' کبھی کبھی ایسی باتوں پر وہ 'پھس' پھس' ہنستی ہنس دیتیں۔ ان کے ہونٹ بھنچے ہوے اور باچھیں کھلی رہتیں تھیں ان میں سے ہوا، ہنسی اور حیا بیک وقت خارج ہوتی تھی۔ ایسے میں وہ کھسیانی ہو کر جلدی سے نیچے اتر جاتیں۔

گلیاں سستی اشیا کی دوکانوں، مکھیوں، نالیوں کی غلاظت اور بچوں سے بھر' بھر اور 'پر 'پر کرتی تھیں۔ گندی نالی میں رکے ہوے پانی میں غلیظ کیڑے 'سر' سر کرتے سر اٹھاتے، گراتے دکھائی دیتے۔ وہ اپنی زندگی جیتے اور اپنی موت مر جاتے۔ نہ کوئی نظام ان کی حیات کا باعث تھا نہ ان کی موت کا سبب۔ بس ان پر پیدا ہونا اور مر جانا ہی لازم تھا۔ مرغے مرغیاں گلی میں غلاظت ڈھونڈ ڈھونڈ کر کھاتے اور آپس میں بے تکلفیاں کرتے رہتے تھے۔ وہ سارا دن بلا تفریق غیرے، انڈے بنانے کا اہتمام کرتے اور شام کے وقت اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جاتے۔ وہ دونوں ایک عرصہ سے دوپہر کی دھوپ جلتی چھتوں پر سہتی تھیں۔ نہ وہ اپنے شوہروں سے تنگ تھیں نہ حالات سے۔ وہ ایک دوسری کے لئے مصیبت یا معمہ سے کم نہ تھیں۔ شوہروں کو کام پر اور بچوں کو اسکول بھیج دینے کے بعد وہ نہائی دھوئی نکھری نکھری اور بنی بنی

اپنے گھروں کی چھتوں پر پہروں کھڑی رہتیں تھیں۔وہ جلتی دوپہروں میں بھی ٹھنڈی ٹھنڈی لگتی تھیں۔انہیں دیکھ کر اکثر لڑکے ایک دوسرے کو کہنی مارتے ہوئے کہتے''پیپسی مرنڈا''۔وہ ایک دوسری کی وجہ سے مکمل تھیں اور ایک دوسری کے بغیر غیر مکمل۔ان کا وجود ایک دوسری کے لئے لازم تھا۔ورنہ نہ تو کسی میں پیپسی کی مٹھاس تسلیم کی جاتی اور نہ مرنڈا کا رنگ۔

مگر کالی گھوڑی والا انہیں دیکھائی نہیں دیتا تھا۔انہوں نے اپنی ماؤں سے بچپن میں سنا تھا کہ گلی سے گزرتے ہوئے کالی گھوڑی والا آپ کے مسائل کا جو بھی حل تجویز کرے گا وہ واقعی میں مسائل کا حل ثابت ہوگا۔مگر وہ تو لڑکپن ہی میں شہر اٹھا آئی تھیں۔کالی گھوڑی والے سے متعلق ان کا تصور ادھورا تھا۔نہ سچ نہ جھوٹ۔بس کسی خواہش کی طرح۔اس کے باوجود وہ کالی گھوڑی والے کو تبھی نہ بھلا سکیں۔کبھی کبھار،وہ دونوں مایوس ہوکر دیوار پر سے ایک دوسری کو گندی گالیاں دینے لگتیں۔اور سننے والے محظوظ ہوتے رہتے۔اکثر وبیشتر ان کے سامعین ہمسائیاں،بڑی بوڑھیاں اور گھروں میں کام کرنے والی نوکرانیاں،بھنگنیں،اور بھنگی ہوتے تھے۔کبھی کبھی گالی گلوچ چھت پر سے ہی شروع ہو جاتی اور گلی میں محلے بھر سے لڑکے اکٹھے ہو جاتے۔لڑکیاں دیواروں کے سائے ،دروازوں کی اوٹ اور پردوں کے پیچھے چھپ چھپ کر انسانی اعضا کے واشگاف اظہار سے لطف اندوز ہوتیں۔اعضا اور بدن کا بار بار ذکر اور ناجائز استعمال فلک شگاف مغلظات سے گونج اٹھتا۔گالیوں میں انسانی اعضاء کا بے دریغ استعمال کیا جاتا تھا۔مگر اردگرد پھیلی ہوئی زندگی میں اس سے کوئی شگاف نہیں پڑتا تھا۔صرف ان کا زہر سکون آور تھا۔مسکّن اور مغلّظ ادویات معجونوں اور کشتہ جات کی طرح۔شام کو لڑکے شور مچاتے اور کرکٹ کھیلتے ہوئے نظر آتے اور لڑکیاں ہنڈیا کے لئے مصالحے کوٹتی۔ڈنڈا'گھوم'گھوم اور جھوم'جھوم کر کونڈی میں گر پڑتا۔پیاز دھنیا اور مرچیں،ادرک،لہسن،سب کی سب مصالحہ ہو جاتی تھیں۔

ان دونوں کو اپنی گالیوں کی فضیلت کا بالکل اندازہ نہ تھا۔کبھی کبھی وہ فون پر بھی تبادلہ خیالات کر لیتی تھیں۔اس طرح وہ ایک دوسری کے ارادے بھانپ لیتیں اور اپنے لئے آئندہ کا لائحہ عمل تیار کرلیتی تھیں۔ان کے مخالفانہ خیالات اور منصوبوں میں ایک خاص قسم کی ہم آہنگی پیدا ہو جاتی تھی۔وہ اس سب کے باوجود کالی گھوڑی والے کو تلاش نہ کر سکیں۔اس کا

انتظار کبھی مکمل نہ ہوا۔نہ وہ کبھی آیا نہ وہ اس کا استقبال کر سکیں۔ہاں البتہ محلے کے نوجوان لڑکے کیفے انٹرنیٹ پہ شامیں،راتیں بلکہ اب دوپہریں بھی گزارنے لگے تھے۔کسی کو یہ جاننے کی ضرورت نہ تھی کہ کالی گھوڑی والے اور کیفے انٹرنیٹ میں کیا بات مشترک یا مختلف تھی۔کالی گھوڑی والے کا انتظار کرنے والے کیفے انٹرنیٹ کے کسی منظر سے کوئی واسطہ نہ رکھتے تھے۔سنوکر کے میز ویران پڑے رہتے تھے۔ان کے اردگرد ہونے والی لڑائیاں ختم ہو چکی تھیں۔ٹی وی ہوٹلوں میں لوگوں کی تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی تھی۔

شام ہوتے ہی گلیوں میں روشنی ،بدبو،مچھر اور اندھیرے اکٹھے ہو جاتے۔کٹا کٹ،ٹکا ٹک،گردے کلیجی،کپورے گرم توے پر رقص کرتے سنائی بھی دیتیا ور دکھائی بھی۔ذرا دیر سے بڑے بزرگ ٹی وی ہوٹل کا رُخ کرتے تھے۔وہاں بیٹھنے کے لیے کم از کم چائے پینا لازم تھا۔اس کی گرمی میں مسلسل اضافہ ہوتا رہتا تھا۔وہ دیکھنے والوں کو ٹھنڈا ہونے ہی نہیں دیتی تھی۔کبھی کبھی دونوں ہمسائے دوکان دار بھی سر جھکائے ہوٹل میں داخل ہو جاتے اور دیر تک باہر نہ نکلتے۔پولیس کا ایک سپاہی باہر ایک ٹوٹی ہوئی کرسی میں پڑا اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرتا اور جمائیاں لیتا بھی نظر آ جاتا تھا۔وہ تھوڑے تھوڑے وقفے سے اندر جانے کی کوشش کرتا رہتا۔جب کوئی اسے تنگ کرتا یا تحقیر آمیز نظروں سے دیکھتا تو بڑبڑاتے ہوئے کہتا''کوئی ملزم میری نظر سے بچ کر نہیں جا سکتا۔میں ہر قسم کے مجرموں کو ہلاک کر سکتا ہوں۔''وہ اپنے سر پر بار بار ہاتھ مارتے ہوئے کہتا۔

ہمسائیوں کے شوہر بازاروں میں ایک دوسرے کے ہمسائے دوکان دار تھے ان دونوں میں کبھی دوستی کے آثار نہ دیکھے گئے تھے۔وہ صبح سویرے مرغ کی پہلی اذان کے ساتھ بیدار ہو جاتے۔اپنے اپنے ضروری مشاغل بھگتا کر دوکانوں پر چلے جاتے۔ان کی دوکانیں آمنے سامنے تھیں وہ دکانوں کے سامنے سڑک پر،ابھی چھڑکاؤ کر رہے ہوتے کہ ناشتہ آ جاتا۔قریب ہی ایک خوانچے پر حلوہ پوری،نان چھولے اور کبھی کبھی سری پائے کا ناشتہ سجایا جاتا۔اس خوانچے کو''سویرہوٹل''کے نام سے ہر کوئی جانتا تھا۔روزانہ سویر ہوٹل پر ان کے مقدر کی کرنیں'اترتی تھیں۔ان کے بیویاں بچے اس ذمہ داری سے بری تھے۔ایک عرصے سے یہ ذمہ داری ہوٹل کا مالک''چاچا ناشتہ''ادا کر رہا تھا۔اس کے تمام گاہک اسے دور ہی سے

پکارتے ''چاچا!ناشتہ''۔اور یوں ان کا کہنا، اس کا نام بن گیا۔اس کی مدد تین چار چھوٹے کرتے تھے جنہیں لوٹو، ریڑھا، کوچی اور مانجا جیسے ناموں سے پکارا جاتا تھا۔چھوٹے ہمیشہ چھوٹے ہی سمجھے جاتے تھے۔ان کے چھوٹے پن کا عمر سے کوئی تعلق نہیں تھا۔دھوپ کے تیز ہوتے ہی ہوٹل پہلے خالی ہو جاتا اور پھر کہیں گم اور اگلی صبح پھر نمودار ہو جاتا۔

بازار میں ہمسائے دوکان داروں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔بلکہ انہیں بازار کی بدبختی اور نحوست سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ان کے ہوتے ہوئے کوئی گاہک ان کی دوکانیں چھوڑ کر نہ جاسکتا تھا گاہک کو گھیر لانا اور پھر خریداری کے لئے قائل کر لینا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔زیادہ سے زیادہ اگر گاہک ایک کی دوکان چھوڑ دیتا تو دوسرے کی دوکان سے سودا لے لیتا۔اگر کوئی بدقسمت ان کی دوکانوں سے بغیر خریداری کے چلا جاتا تو وہ کہیں کا نہ رہتا۔ ''جو گاہک آپ کا نہ رہے،اسے گندہ کر دیں'' وہ اپنی اپنی دوکانوں میں بیٹھے ایک دوسرے کو اشارے کنایوں سے پیغام دیتے۔گاہک کو بھاؤ تاؤ کی ایسی گھتیوں میں الجھا دیتے کہ وہ پورے بازار میں لڑ جھگڑ کر انہیں کے ہاں لوٹ آتا۔وہ اسے اپنی کامیابی سمجھتے اور اپنی کامیابیوں پر فخر کرتے تھے۔ان کا ذکر کبھی کبھی اپنے بچوں سے بھی کرتے مگر وہ ان پر زیادہ توجہ نہ دیتے اور ٹی وی دیکھتے رہتے۔

ڈرامہ، گانا اور فلم کے ساتھ کیبل والوں نے ''ڈیلی مجرا'' کا اضافہ کر دیا تھا۔یہ چینل ہر وقت گرم رہتا۔گھروں میں لڑکے لڑکیاں الگ الگ اوقات میں مجرا سے فیض یاب ہوتے۔ہاں البتہ خواتین پر ایسی کوئی پابندی نہ تھی۔وہ مسلسل بیٹھی رہتیں اور سامعین اور ناظرین بدلتے رہتے۔کبھی کبھی اسماء بھی ان کے گھروں میں ٹی وی دیکھنے آ جاتی۔وہ کالج کی طالبہ تھی اور دوسرے بہت سے گھروں کی طرح اس کے گھر میں بھی ٹی وی کی آمد نہ ہوئی تھی۔دوسروں کے گھروں میں ٹی وی دیکھنا معیوب بھی نہیں سمجھا جاتا تھا۔خاص طور سے جب لڑکے کیفے انٹرنیٹ میں جمگھٹا جما لیتے۔

وہ دونوں ہمسائیوں کی دوست بھی تھی اور ضرورت مند بھی۔وہ ایک دوسری کے خلاف زہر نکالتیں اور اسماء اپنا کام۔جیسے کتابیں کاپیاں، پنسلیں، پین اور دیگر مراعات۔کبھی کبھی اسے ان کی باتوں حکایتوں اور شکایتوں سے الجھن بھی ہوتی تھی۔مگر وہ ان کی عادی ہوتی

چلی گئی۔وہ انہیں اکثر مشورہ دیتی کہ نجومیوں ،جوتشیوں ،اور کالے علم کے ماہرین کے بعد کی
ماہرنفسیات بھی مشورہ کرلیں ۔سایدوہ ان کے مسائل کا حل تجویز کردیں اور خواتین سے بچوں
تک اور بچوں سے محلے تک پھیلتے ہوئے انسانی اعضاء کے زبانی استعمال میں کمی ہو جا
ئے۔مگر وہ اسے برا بھلا سنا کر بھگا دیتیں۔ایک دن اس نے ان سے کہا کہ اس کی پروفیسر
انٹرنیٹ سے نئے نئے مضامین اتارتی ہیں جو بہت سبق آموز ،مفیداور معنی خیز ہوتے ہیں۔مگر
وہ اس کی ایک نہ مانتیں۔''اے لڑکی آپے میں رہو۔آپا بننے کی مت کوشش کرو۔''اسے اکثر
ڈانٹ پلاتی رہتی تھیں۔ایک دن اس نے ان سے کہا کہ وہ بیوقوفوں کی ایک کہانی لائی ہے جو
بہت مزیدار ہے۔اس نے ایک ایک کاپی دونوں گھروں میں پہنچا دی۔

''خاندانی اور ازدواجی مسائل کے ایک ماہر کے پاس بہت سی عورتیں اپنے مسائل
اور بے اطمینانی کا حل تلاش کرنے جاتی تھیں۔خاص طور سے شوہروں سے متعلق بے اطمینانی
سے۔اگرچہ اس سے ڈاکٹر کی کمائی میں بہت اضافہ ہوگیا مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ
اس کام سے بیزار ہوتا گیا۔ہر کسی کی کہانی ایک جیسی تھی۔ہر ایک کا علاج اور مشورہ ایک ہی
جیسا تھا۔اس کی بیوی کو بھی اس سے ،ایسی ہی شکایات تھیں جیسی اس کی مریض خواتین کو۔اس
نے ایک دفعہ بہت سی خواتین کو لیکچر دیتے ہوئے کہا کہ ان سب کو چاہئے کہ شوھروں کی منڈی
لگالیں ۔میلہ منڈی شوہراں۔ان کے چہروں پہ نقاب ڈال کر انھیں منڈی میں چھوڑ دیں تا کہ
انہیں کوئی پہچان نہ سکے۔پھر خواتین اس میدان میں سا یک ایک شوہر کو پکڑ کر لے جائیں اور
اپنے اپنے گھروں میں جا کر ان کے نقاب اتار دیں اور نئے شوہروں کے ساتھ خوش رہنے کی
کوشش کریں۔اس پر سب نے یک زبان ہو کے کہا کہ وہ نئے آدمی بھی تو ان کے پرانے
شوہروں کی طرح ہی ہوں گے۔بلکہ اس سب سے کیا فرق پڑے گا یہ تو سب کچھ جوں کا توں
ہی رہے گا۔

ہمسائیاں یہ کہانی پڑھتیں اور پھر کہتیں کہ تمہارا ماہرنفسیات کالی گھوڑی والے کی
طرح نہیں ہے اور نہ ہوسکتا ہے۔وہ انہیں اکثر کہتی کہ کالی گھوڑی والے کے متعلق تو صرف اتنا
کہا جاتا تھا کہ وہ کالی کھانسی کی دوا بتاتا تھا۔اس کے لئے چلتے چلتے کھانے کی کسی بھی چیز کا نام
تجویز کردیتا تو وہ کالی کھانسی کا تریاق ثابت ہو جاتی۔اب تو ڈاکٹر ،ہسپتال ،دوائی سب کچھ میسر

تھا۔یوں بھی بچوں کو پیدا ہوتے ہی کالی کھانسی سے بچاؤ کے ٹیکے لگا دیئے جاتے ہیں۔ہمسائیوں کو اصل حکایت تو یاد نہ رہی البتہ وہ گھوڑی کے ساتھ کالی کے وصف اور رشتہ کو کبھی نہ بھلا سکیں۔اس کے پاس ہر مرض کا علاج تو نہیں مگر وہ نجومیوں اور مجوسیوں سے مایوس ہو کر کالی گھوڑی والے کا ہی انتظار کرتی تھیں۔'' دیکھو اسماء تمھاری کہانی کا مجھ سے یا میرے شوہر سے کوئی تعلق نہیں ۔''ایک نے کہا۔

دوسری ہمسائی نے کہا'' یہ شوہر کہاں سے اس قصے میں گھس آئے ۔مجھے اپنے شوہر سے کوئی شکایت نہیں۔''میری ہمسائی سے لڑائی کی وجہ نہ میرا شوہر ہے نہ اس کا۔یہ کیا تم اول فول سناتی رہتی ہو۔جھگڑا تو مرغیوں کی وجہ سے ہوتا ہے۔وہ کہتی ہے کہ ہمارا مرغا ان کی چوزوں والی مرغی کے پیچھے پڑا رہتا ہے۔اس میں میرا کیا قصور ہے۔جانور، پرندے اپنی طرح کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ہماری طرح تھوڑے ہی رہتے ہیں۔ہمارا مرغا ان کی دوسری مرغیوں کے پیچھے سارا دن ہلکان ہوتا رہتا ہے اور جھولیوں بھر بھر انڈے اکٹھے کرتی رہتی ہے ۔اس پر کوئی جھگڑا نہیں۔بس اس سے ذرا غلطی سرزد ہوئی اور یہ مجھ پر چڑھ دوڑی۔جانور یا پرندے بندوں کی طرح تو نہیں ہوتے۔ان پر تو کوئی پابندی نہیں ہوتی کہ وہ کب اور کس سے ملیں۔اس سے کوئی پوچھے کہ کیا مرغے بھی مسلمان ہوتے ہیں۔بے دین۔حرامڑ۔بھلا ان چیزوں کا علاج ڈاکٹر کے پاس کہاں ہوتا ہے۔اصل جھگڑا تو کالی گھوڑی والے کی وجہ سے ہے۔وہ اپنے آپ کو خوش قسمت ثابت کرنے کے لئے چھت پر کھڑی ،اس کا انتظار کرتی رہتی ہے۔تا کہ مجھے بدقسمت ثابت کر سکے۔مجھے بھی جواباً یہی کچھ کرنا چاہئے جو وہ کرتی ہے۔اور میں بھی وہی کچھ کرتی ہوں۔''اسماء نے کہا ''خالہ کل لڑکیاں ،لڑکوں کے کالج میں ڈرامہ دیکھنے جا رہی ہیں۔میں بھی جانا چاہتی ہوں۔کالج والوں نے بیس روپے منگوا رکھے ہیں۔ہمسائی نے فوراً اسے بیس روپے تھما دیئے۔

شام کے سائے گہرے ہو چلے تھے۔ہمسائے دوکان دار دوستی یا دشمنی کے تعلق کے بغیر ہمیشہ کی طرح اپنے گھروں کو لوٹ آئے۔مرغے اور مرغیاں اگلے دن میں ہونے والی تبدیلیوں سے بے خبر ،اپنے اپنے گھروں اور ڈربوں میں جا دبکے۔کیفے انٹرنیٹ ،لڑکوں سے بھرے جا رہے تھے۔ٹی وی ہوٹل میں چائے پہ چائے اور سگریٹ پہ سگریٹ پئے جا رہے

تھے۔پولس کا سپاہی غائب تھا۔گلی میں دل ،گردے،کلیجی،کپورے کی دوکانیں چمک رہی تھیں۔ٹکا ٹک ،کٹا کٹ ،ٹک ٹک کے سوا کچھ سنائی نہ دے رہا تھا۔گرم توؤں پر پکویوں کے ہاتھ،کھرپیاں اور گردے،کپورے بیک وقت رقص میں مصروف تھے۔

اسماء ایک ہمسائی کے گھر میں داخل ہوئی اور کہا'' کچھ پیسے چاہئیں۔گھر میں مہمان میری منگنی کے لئے آئے ہیں''۔مگر تمہارا تو امتحان ہورہا ہے۔کیا حرج نہ ہوگا''۔ ''نہیں خالہ میرا صرف ایک پرچہ رہ گیا۔میں پاس ہو جاؤں گی۔منگنی نہ ہو تو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا،ہو جائے تو بھی نہیں۔یہ کام کبھی نہ کبھی ہونے ہی ہوتے ہیں۔پھر اِدھر ادھر کی کیوں ماریں۔جو کرنا ہو کر ڈالیں جو نہ کرنا ہو،اس کا فیصلہ کرلیں''۔''اچھا تو تمھیں یہ رشتہ پسند ہے'' خالہ نے اسے چمکارتے ہوئے کچھ پیسے تھما دیئے۔''خالہ سب رشتے ایسے ہی ہوتے ہیں،خوابوں میں شاید اور طرح کے ہوں۔ورنہ تو ایسے ہی ہوتے ہیں۔پسند ناپسند کس بات کی کریں،اور وہ تو خود بھی آیا ہوا ہے''اسماء نے جواب دیا۔''کون۔کالی گھوڑی والا؟''ہمسائی نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے پوچھا۔

''نہیں۔نہیں۔اس کا نام تو ارشد ہے''۔اسماء نے جاتے جاتے مسکراتے ہوئے کہا۔

ہے کوئی

محمد حامد سراج

کشادہ بازار کے پہلو میں اونگھتی تنگ گلی میں پندرہ بیش دکانیں سانس لے رہی تھیں۔ دکانوں میں مال زیادہ اور گاہک کم تھے۔ بازار سے اس گلی میں داخل ہوتے ہی اچانک ایسے محسوس ہونے لگتا ہے جیسے انسان کسی اور دنیا میں آنکلا ہے۔ یہ گلی اپنے وجود کے اعتبار سے ایک مکمل ریاست کی طرح تھی۔ دورویہ دکانوں میں اک دنیا آباد تھی۔ بھانت بھانت کی بولی سننے کو ملتی۔ ہر دکان دار کی اپنی ایک الگ دنیا تھی اور سب کی سوچ کا اپنا منطقہ.....ان ہی دکانوں کے بیچ ایک دکان مروت کی بھی تھی۔ جس میں بکنے کو کوئی چیز نہ رکھی گئی تھی۔ مروت گاہک بھی خود تھا اور دکان دار بھی۔ دکان میں نصب اکلوتے پنکھے کے پر اس کی قسمت کی مانند ساکت تھے۔ پر جنبش کرتے نہ اس کا نصیب۔ وہ باہر کی تازہ ہوا کا منتظر رہتا۔ پنکھا صرف اس وقت چلایا جاتا جب کوئی گاہک آنکلتا۔ کیوں کہ بجلی کے کمرشل ریٹ کے نئے ہوش ربا ٹیرف نے پوری گلی کے اوسان خطا کر رکھے تھے۔ مروت دن بھر گلی سے گزرنے والی ریڑھیوں، سائیکلوں، موٹر سائیکلوں اور پیدل گزرنے والوں کو تکتا رہتا۔ وہ ہر گزرنے والے کو پُر امید نظروں سے جانچنے کی سعی کرتا۔ مبادا ان میں سے کوئی میرا مقدر اپنی جیب میں لیے پھر رہا ہو۔

وہ علی الصبح جھاڑو لگا کر سیمنٹ کے تھڑے پر اپنی خستہ کرسی سجا دیا کرتا۔ دکان میں چھڑکاؤ کرتا۔ بالٹی بھر پانی کا چھڑکاؤ گرد بٹھانے کو گلی میں کر دیتا۔ سلائی مشین کی جھاڑ پونچھ کر کے تیل کے دو چار قطرے اسے پلا دیتا۔ دکان کے اندر نصب پڑچھتی پر فوم کے ٹکڑے ترتیب سے رکھتا، صوفوں سے اُترے ہوئے بوسیدہ کپڑوں کو ترتیب سے رکھتے ہوئے اس کے ذہن

میں کئی خیالات اُترتے۔ وہ راتوں رات امیر ہونے کے خواب دیکھتا۔ لیکن ہر صبح غریب اٹھتا۔

اس کی دکان کے بالمقابل جلیل درزی کی دکان تھی۔ جلیل کی کمر نصف صدی سے کپڑے سیتے سیتے خمیدہ ہوگئی تھی۔ جلیل کے پاس آنے والے گاہکوں میں سے چند عمر رسیدہ گاہکوں نے اس کی دکان پر ''مجلسِ دانش وراں'' کی تختی آویزاں کردی۔ شام سے ذرا پہلے ایک ایک کرکے دانش ور دکان میں اکٹھے ہونے لگتے۔ تھوڑی دیر بعد دکان سے مغلظات کا لاوابہہ نکلتا۔ مروت سوچتا یہ کیسے دانش ور ہیں جو شام ڈھلے روزانہ اکٹھے ہوتے ہیں، اونچی آواز میں چیختے اور گالیاں بکتے ہیں۔ اخبارات کی خبریں چباچبا کر دکان کے سامنے بہنے والی گندی نالی میں پھینکتے رہتے ہیں۔ اخلاق اور مروت سے عاری، نرمی اور ملائمت سے ناآشنا ..... یہ کیسے دانش ور ہیں؟ ان کے منہ سے ہر وقت خبروں کے بھبوکے اٹھتے رہتے ہیں۔ ملکی سیاست سے لے کر گلی میں سے گزرنے والی کالی چمارن تک کو یہ چباجاتے ہیں ..... ہونہہ..... دانش ور ..... اسے تو عورتوں کی مانند سر پر لٹکتی لٹوں والا دانش ور بالکل ہی نہیں بھاتا تھا جو ہر عورت کے گزرنے پر غیر ضروری خارش سے گزرنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔

جلیل درزی کی دکان کے پہلو میں ایک چھوٹا سا ہوٹل تھا۔ لمبوترے چہرے اور تنگ ماتھے والا ایک شخص اونچی آواز میں دوہڑے، ماہیوں کی کیسٹ لگا کر چھ عدد کرسیوں کی روزانہ مرمت کرتا۔ ہوٹل اس کے ماتھے کی طرح تنگ اور لباس کی طرح میلا تھا۔ صفائی کرتے ہوئے میزوں کرسیوں پر میل کی تہہ صاف ہونے کی بجائے اور جم جاتی۔ دہی پر دن بھر باریک کپڑے کے باوجود مکھیاں بھنبھناتی رہتیں۔ وہ مکھیوں کی بھنبھناہٹ سے بے خبر اپنے خیالوں میں مگن اکڑوں بیٹھا جانے کیا گنگناتا رہتا۔ اکا دکا گاہک کے آنے پر دہیتو لنے کے بعد وہ پھر اس آسن میں لوٹ جاتا۔ اس کی دن بھر کی لاگت دہی کی تین پراتیں تھیں۔ کسی پیالی کی مٹھ سلامت نہیں تھی۔ چائے بناتے ہوئے وہ پتیلی میں پرانی پتی پھینٹتا رہتا۔ اسے دیکھ کر مکھیاں بھی کراہت محسوس کرتی تھیں۔ اس نے ایک دن مجلسِ دانش وراں میں قدم رنجہ فرمانے کی کوشش کی۔ اگلے دن اسے دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال کر پھینک دیا گیا۔

اُلو کا پٹھا ..... حرامی ..... سارا دن خصیئے کھجاتا اور انہی ہاتھوں سے چائے بناتا ہے۔

ایک دانش ور نے کہا۔

شکل دیکھی ہے اس .....مداری والے بندر کی طرح، چلا ہے دانش وروں کی مجلس میں دانش وری بگھارنے! وہ کٹورے میں دہی تولتے ہوئے سوچتا رہا، دانش ور چائے تو میرے ہاتھ کی پیتے ہیں، مجھے اپنے ساتھ بٹھانے میں انہیں کیوں عار ہے۔ یہ ایک ایسا سوال تھا جس کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ طبقاتی کشمکش اس نے دہی میں تول دی اور خود اونچی آواز میں دوہڑے سننے لگا۔

جلیل درزی کے بائیں جانب ایک ڈسکو نائی کی دکان تھی......اس گلی میں صبح جھاڑو لگانے کے بعد دکان دار سب پہلا کام یہی کرتے کہ اپنی اپنی کرسی سجاتے اور دن بھر دکان داری کم اور نظر بازی زیادہ کرتے۔ نائی بھی اپنے اوزار سجانے کے بعد بال سنوارتا۔ ٹیپ ریکارڈر میں جھنکار والی کیسٹ ڈال کر باہر کرسی پر آبیٹھتا۔ اسے دن بھر سرخ ساٹن کے پائنچوں سے جھانکتے کالی پمپی میں دھرے سفید پاؤں کا انتظار رہتا۔ آئینہ اس نے ایسے رخ لگایا تھا کہ گلی کی نکڑ سے وہ جیسے ہی داخل ہوتی اس پر نظر پڑتے ہی ایک مکروہ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں تلے اٹھلاتی، گھنی مونچھوں میں ناچتی کودتی .....شیو بناتے ہوئے استرے پر صابن کی جھاگ لیے وہ سیٹی بجاتے ہوئے دکان سے نکلتا۔ نالی میں جھاگ پھینکتا اور لوٹ کر گنگناتے ہوئے گاہک کے چہرے پر پھٹکوی ملنے لگتا۔

جس روز مروت کی دکان سے دو دکانیں چھوڑ کر ڈینٹل کلینک کھلا سب دن بھر اپنی بتیسیاں آئینے میں دیکھتے رہے اور گلی میں نئی دکان کھلنے پر مفت معائنے کو اپنا حق جانتے ہوئے ڈاکٹر سے ہنس ہنس کر ملتے رہے۔ گلی میں ڈاکٹر کی روزی بھی چل نکلی۔ مریض کو کرسی پر لٹا کر وہ اس کا معائنہ کرتا۔ چھ انچ کے فاصلے سے جھانکتے ہوئے بلب کی زرد روشنی میں معائنہ کرنے کے بعد وہ ہاتھ جھٹک کر دو قدم پیچھے ہٹتا اور کہتا:

''برباد ہو گئے جی..... مکمل برباد ..... کچھ نہیں رہا دانتوں میں ..... یہ تو Denture بنانا ہوگا..... ماپ لیں گے .....دو سیٹ لگیں گے .....نہیں تو موجود دانتوں کا بھی اللہ حافظ ہے۔ معاوضے کا سن کر اکثر گاہک کرسی سے اُتر کر کھسک جاتے .....ہوا کا رخ پہچان کر اس نے معاوضہ کم کرنا شروع کر دیا.....تو دکان میں رونق بڑھنے لگی۔ وہ چوڑے ماتھے والا

ایک شریف النفس انسان تھا۔ اسے کبھی کسی نے کوئی چھچھوری حرکت کرتے نہیں پکڑا۔ وہ اجلے کپڑے پہن کر آتا اور بے داغ لوٹ جاتا۔

ایک دن جب سورج کی حدت دکانوں کے آگے لگے ٹین کے چھجوں سے اُتر کر دکانوں اور دلوں میں اُتر رہی تھی، سہ پہر گزار کے ڈاکٹر نے جلیل درزی کی دکان میں قدم دھرا۔ جلیل نے ٹھنڈے سادہ پانی اور چائے سے اس کی تواضع کی۔ ایک ایک کر کے حسب معمول دانش ور اکٹھے ہونے لگے۔ اسی شام متفقہ رائے کی روشنی میں انھوں نے ڈاکٹر کو مجلس کی رکنیت دے دی..... جب دانشوروں نے ڈاکٹر کو اظہارِ خیال کو کہا تو ڈاکٹر نے کھنکار کر گلا صاف کیا..... مایہ لگے سوٹ کی سلوٹوں پر ایک نظر ڈالی..... عینک کے شیشے صاف کیے اور کہا..... ہمیں گلی کے مسائل حل کرنے کے لیے اور اسے منظم طریقے سے چلانے کے لیے ایک ایسا نظام وضع کرنا چاہیئے جو ساری مشکلات کے حل میں معاون ثابت ہو۔ ہمیں جمہوری طریقِ کار کو اپناتے ہوئے پوری گلی سے رائے لے کر صدر، سیکرٹری اور دیگر عہدیداران کا چناؤ کرنا چاہیئے۔

فر..... ہم جو چاہے کرتے پھریں..... ایک دانش ور نے قہقہہ لگایا۔

اوئے فتنے..... بیچ میں مت بولا کر..... دوسرا بولا۔

آخر کار ایک دن مجلس کا قیام عمل میں آ گیا۔ ووٹ تولنے کی بجائے گن لیے گئے ..... ایسا گھن چکر چلا کہ وہی دانش ور عہدوں پر متمکن ہو گئے اور گلی کے سیاہ وسفید کے مالک ٹھہرے۔ گلی والے مطمئن تھے کہ کوئی مسئلہ تو حل ہوگا۔ جلیل درزی بھی خوش تھا کہ نصف صدی سے سلائی مشین کی ہتھی گھماتے گھماتے اس کے ہاتھ کی لکیریں ہی گھس گئی ہیں، اب بھلے سے سلائی مشین کو موٹر لگ جائے گی ..... اللہ کرے گا میرے دائیں ہاتھ کی لکیریں دوبارہ ابھر آئیں گی۔ یہ بھی طے پایا کہ ہر مہینے مجلس کا اجلاس باقاعدگی سے منعقد ہوا کرے گا تا کہ مسائل سے آگاہی رہے۔

اسی دوران گلی کے آخری سرے پر دو نئی دکانیں کھل گئیں۔ ایک دکان پر بچوں کے ریڈی میڈ کپڑے لہلانے لگے، دوسری پر بچوں کے کھلونے اور اسٹیشنری کی چیزیں گاہکوں کی توجہ کا مرکز بن گئیں۔ جس روز ان دکانوں میں روزی کا در کھلا، ایک دانش ور نے کہا..... گلی کی شمالی سمت والی دکانوں میں آسیب ہے۔ ان میں کوئی ایک ماہ سے زیادہ ٹک ہی

نہیں سکتا اور اکثر ہوا بھی یہی..... شمالی سمت دونوں اطراف کی چار چار دکانیں طوائف کی طرح گاہک بدل لیتیں۔ جب مروت نے دکان لی تھی تو اسے بھی جلیل درزی نے یہ دکان لینے سے منع کیا تھا اور بلا کر سمجھایا تھا کہ یہ دکان مت لو۔ اس کی بنیادوں میں کالے بکرے کی سری دفن ہے..... مروت حیرت سے جلیل درزی کا کالا سر دیکھتا رہا تھا۔ وہ سوچنے لگا تھا کہ جب وہ نیا نیا یہاں آیا تھا تو اسے کتنی پزیرائی ملی تھی، نائی نے اس کی شیو اور بال مفت تراش دیئے تھے۔ ہوٹل والے نے لسی کے پیسے لینے سے انکار کر دیا تھا۔ ڈاکٹر نے اس کی کھوکھلی داڑھ مفت میں نکال دی تھی، لیکن جلیل درزی نے سوٹ کی سلائی پوری لی تھی اور گن گن کر نوٹ اپنے سلوٹ زدہ کرتے کی بغلی جیب میں ڈالے تھے.....اسے بکرے کی کالی سری سے خوف آنے لگا۔

مروت نے ایک بڑے شہر سے صوفوں کے کشن، پردوں کی سلائی اور کاروں، موٹر سائیکلوں کے سیٹ کورز کی ڈیکوریشن کا کام سیکھا تھا۔ وہ بھالو، اونٹ اور ہاتھی بنانے کے فن سے بھی آشنا تھا۔ اس کے ہاتھ میں نفاست تھی۔ بڑے شہر میں اس کے بھالو، اونٹ اور ہاتھی بہت اچھی قیمت پر نکل جایا کرتے تھے۔ لیکن دکان کا مالک آٹے میں نمک کے برابر معاوضہ اس کی ہتھیلی پر رکھتا تھا۔ اس نے بھی یہ سوچ رکھا تھا کہ جب بھی اپنا کام الگ شروع کرے گا، ایسی چیزیں بنانے سے اس پر باب رزق کھل جائے گا۔

اس نے یقین کامل سے دکان کھول کر نئی زندگی کا آغاز کیا تھا۔ شروع کے دنوں میں اسے پچاس کرسیوں اور صوفوں کے کشن کا کام ملا تو اس نے اپنے اندر مستقبل کی نامعلوم خواہشوں کے دیپ جلا لیے۔ وہ پُرامید تھا لیکن مہنگائی کی وجہ سے گاہک اب کم ہی گلی کا رُخ کرتے تھے۔ دوسرے مہینے وہ ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھا رہا۔ لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری۔ اس کا یہ بھی یقین تھا کہ میرے مقدر کی بنیادوں میں کہیں کالے بکرے کا سر نہیں ہے۔ وہ جنات، بھوت پریت، آسیب اور سایوں پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ اس کا اللہ پر کامل یقین تھا۔ بچپن سے سویرے اٹھنا اس کا معمول رہا، کیوں کہ اسے معلوم تھا کہ صبح کا سونا رزق کم کرتا ہے۔ اسے رزق حلال کمانے اور کھانے کی تعلیم ماں نے گھٹی میں دی تھی۔ وہ بڑی بڑی مارکیٹیں، چمکتی دمکتی دکانیں، صرافہ بازار سے گزرتے ہوئے سونے کی چمک دمک، نئے ماڈل کی ایک سے ایک کار دیکھ کر سوچتا کیا یہ سب اکل حلال سے ممکن ہے؟ دولتیں کہاں سے آرہی ہے.....؟ کالا دھن

کیسے سفید ہوتا ہے؟ لاینحل سوالات اسے الجھا کر رکھ دیتے اور وہ پھر اپنی ڈگر پر چل نکلتا۔

جب بہت دنوں مندا رہا تو اسے جلیل درزی کی بات ڈسنے لگی۔ سر بہ زانو واہمے اس کے اندر ڈیرہ ڈال کر بیٹھ گئے۔ اس نے کتنی ہی آیات کا ورد کیا، لیکن ایک نامعلوم سا خوف اس کے ذہن میں رینگنے لگا ۔۔۔۔۔ ایک صبح اس نے دکان کھولی تو ایک عفریت کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ وہ سہم گیا۔ عفریت انگڑائی لے کر بیدار ہوا اور دکان میں گھومنے لگا۔ پنکھے کے پر ساکت تھے۔ وہ کرسی پر بیٹھا آنکھوں میں خوف سمیٹے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کی طرف بڑھنے لگا..... اس نے آیت الکرسی کا ورد تیز کر دیا..... عفریت غائب ہوا، لیکن دوسرے ہی لمحے وہ اسے پنکھے کے پروں سے چمٹا نظر آیا۔ اس نے اٹھ کر بٹن دبانا چاہا کہ پروں ہی میں وہ کٹ کر مر جائے لیکن تاروں میں حرارت ہی نہ تھی۔ دو ماہ سے بجلی کا بل ادا نہ کرنے کی وجہ سے لائن مین کا بے رحم پلاس تاریں کاٹ گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ عفریت اس پر حملہ آور ہوتا، وہ دانش وروں کے پاس آ بیٹھا۔

دانش ور اخبار سامنے پھیلائے قہقہے لگا رہے تھے۔ وہی خبریں چبانے کا ایک سائکل ..... دہشت گردی، خوف، گینگ ریپ، قتل، اغوا، زنا بالجبر، مہنگائی، بدامنی، اغوا برائے تاوان، مسجد کے صحن میں نمازیوں کی لاشیں، بس اور ٹرین میں دھماکے، نسلی تعصبات ...... وہ سوچنے لگا لوگ اخبار کا مطالعہ کیوں کرتے ہیں ....؟ اخبارات ہمیں کیا دے رہے ہیں، بے چینی، خوف و ہراس، مستقبل کے اندیشے، بے چینی کی فضا ...... کیا ...... کیا ......؟ ایک کیڑا اخبار کی سطور میں رینگنے لگا ...... پھر اس نے لاتعداد کیڑے رینگتے دیکھے..... اس کا رنگ لٹھے کی طرح سفید ہونے لگا۔ اس سے پہلے کہ دانش ور اخبار کی بجائے اس کا چہرہ پڑھ لیتے وہ وہاں سے اٹھ آیا۔ ہوٹل والے سے ایک کپ چائے کا کہا اور بوسیدہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ اسکو دیواروں پر خوف رینگتا ہوا محسوس ہوا۔ چائے کی پیالی میں پتی دیکھ کر وہ کانپنے لگا..... اتنی چیونٹیاں، کہیں یہ بھی زہریلی نہ ہوں ...... میں مر نہ جاؤں ......وہ نائی کے پاس گیا، اخبار الٹ پلٹ کر دیکھا ...... رنگین تصاویر سے خون بہنے لگا ...... دہشت اس کی رگوں میں بیٹھنے لگی ...... آخر میں جاؤں کہاں .....؟ جائے اماں ملے گی کیا.....؟ مگر کہاں ......؟ دکانوں کے باہر لٹکتے کھلونے چیخ رہے تھے، کھلونوں کے پیٹ پھول گئے تھے اور ان سے پیپ بہہ رہی تھی..... اس نے گلی میں موجود

دکان داروں اور دانش وروں کو بتلانا چاہا کہ اخبارات میں زہریلے کیڑے رینگ رہے ہیں، رنگین تصاویر سے لہو بہہ رہا ہے۔ عفریت گلی میں گھس آیا ہے۔ کھلونوں کے پیٹ سے پیپ بہہ رہی ہے۔ لیکن وہ چپ رہا.....رو سکا نہ چیخ.....آنسو حیران پتلیوں میں پھرتے رہے اور چیخ ہونٹوں کے مرقد میں دفن ہوگئی.....اس ڈر سے کہ لوگ اسے پاگل کہہ کر پتھر نہ مارنے لگیں .....وہ چپ رہا.....

مروت کو ابھی بہت سے کام کرنے تھے۔ بڑی بہن عمر کی اس دہلیز پر کھڑی تھی جہاں رشتے آنا بند ہوجاتے ہیں۔ آنگن میں اس کے ساتھ سٹاپو کھیلتی لڑکی جوانی کے دروازے میں ایستادہ اسے پُر امید نظروں سے تک رہی تھی۔ اسے کتنے ہی کام کرنے تھے۔ اپنا مستقبل سنوارنا تھا، بہن کی شادی کرنی تھی۔ اسے زندہ رہنا تھا اور اپنے حصے کا رزق تلاش کرنا تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا، اللہ کی بجائے لوگوں نے رزق کی تقسیم اپنے ہاتھ میں لے لی ہے۔ وہ سورج، چاند، ستاروں اور سمندروں پر قابض ہوکر روشنی اور پانی کا بیوپار کرنے لگے ہیں۔

وہ اپنی دکان پر آ کر بیٹھ گیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اگلے مہینے دانش وروں کی مجلس کے اجلاس میں اپنا مسئلہ ضرور اٹھائے گا۔ وہ انہیں آگاہ کرے گا کہ ایک عفریت گلی میں گھوم رہا ہے۔ اس کا سدّ باب کیا جائے۔ وہ گھروں کی دیواروں، چھتوں اور آنگنوں میں اُترتا اور خوف پھیلاتا رہتا ہے۔ اب وہ گلی کی ہر دکان میں مکین ہو رہا ہے۔ وہ گلی، گلی میں موجود دکانوں اور انسانوں کو ہڑپ کر جائے گا۔

اجلاس میں اس کی بات کو سگریٹ کے دھویں میں اڑا دیا گیا۔ دانش وروں نے اس کے خوف کو رد کرتے ہوئے اسے اس کا ذہنی عارضہ قرار دیا۔ کیوں کہ ان میں سے کسی کے گھر، دفتر، کھیت کھلیان یا دکان میں آسیب نہیں اُترا تھا۔ ڈاکٹر نے مروت کی بات پر توجہ دینے کو کہا کہ ممکن ہے اس نے وقت کی نبض پہچان لی ہو۔ ہمیں کوئی لائحہ عمل طے کرنا چاہیئے.....کبوتر کے آنکھیں بند کر لینے سے بلی معدوم نہیں ہوجاتی۔ وہ ایک اٹل حقیقت کی طرح موجود رہتی ہے اور تر نوالہ کبوتر ہی بنتا ہے.....

نقار خانے میں طوطی کی کون سنتا.....

ہوٹل والے نے ہمت کر کے کہا.....مروت کی بات کو وزن دیا جائے، نہیں تو ہم

ہڑتال کر دیں گے۔ اوئے .....تو .....کیا پدی اور کیا پدی کا شوربہ..... تجھے بھی زبان مل گئی.....
بات بڑھنے لگی ..... ہر کوئی اپنی اپنی بولی بول رہا تھا.....اس تُو تکار میں دانش ور
آپس میں دست و گریباں ہو گئے .....وہ اودھم مچا کہ الامان والحفیظ.....مروت سوچتا رہا یہ کیسے
دانش ور ہیں۔ ان کو تو گلی کی قسمت سنوارنی تھی ..... یہ آپس میں دست و گریباں ہو گئے
۔۔۔۔۔انہیں کون سمجھائے .....؟ کون عقل دلائے .....؟ یہ تو فیصلے کرنے والے لوگ ہیں، ان
کا فیصلہ کون کرے گا؟

بڑی مشکل سے بیچ بچاؤ کرایا گیا۔ لمحوں میں یہ خبر گلی کی ریاست سے نکل کر بڑے بازار سے ہوتی ہوئی پورے شہر میں گردش کرنے لگی۔ جس نے سُنا، انگشت بدنداں رہ گیا اور کفِ افسوس ملنے لگا..... مروت بوجھل قدموں سے اپنے دکھ اور مسائل کاندھوں پر اٹھائے دکان پر آن بیٹھا۔ کیا کبھی کوئی آئے گا.....؟ ابنِ مریم .....اذنِ مسیحائی لے کر اور یہ بوجھ ہمارے کاندھوں سے اتارے گا۔ ہر آنے والے دن کے ساتھ بوجھ بڑھتا جا رہا ہے..... گلی کی نالی سے تعفن اٹھ رہا ہے، کوڑے کرکٹ کے ڈھیر لگ رہے ہیں .....پہروں بجلی نہیں ہوتی .....ہوش ربا گرانی میں سانس کی گھٹن، یہ سارے مسائل کون حل کرے گا.....؟ کون..... کون.....کون.....؟ مروت کے ذہن میں جھکڑ چلنے لگے.....

وہ گلی میں گزرتے چہروں پہ پیوست یبوست زدہ تحریریں پڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ کیا یہ چہرے زندہ ہیں .....؟ ان پر مردنی کی سی کیفیت کیوں چھائی ہے .....؟ خوف کاشت کرنے والے ہاتھوں کو قلم کیوں نہیں کر دیا جاتا .....؟ وہی ذہن کے پردوں پر رینگتا لامتناہی سوالات کا سلسلہ.....!

ان پردوں کی سلائی کرنی ہے .....

وہ ایک دم چونکا.....نقاب سے مسکراہٹ چھلکی۔

جی.....!

لیکن ذرا جلدی کیجیئے گا۔ اگلے ہفتے میری چھوٹی بہن کی شادی ہے۔

فکر مت کیجیئے .....انشاءاللہ کام سولہ آنے اور ستھرا ہو گا۔

مروت نے مشین کی ہتھی گھمائی۔ سوئی کے ناکے میں دھاگہ ڈالا۔ پنکھے کے پر ہلنے

گے اور وہ اپنے کام میں مگن ہو گیا۔

نائی نے اسے سلام کیا تو وہ چونکا۔ کیوں کہ نائی پہلی بار اس کی دکان پر آیا تھا۔ اس نے نائی کے لیے چائے کا کہا.....اور اپنے کام میں کھو گیا.....

بادشاہو.....خیر تو ہے.....آج بڑی محنت سے کام ہو رہا ہے.....یار شادی سے پہلے پہلے یہ پردے تیار کر کے دینے ہیں۔

کس کی شادی سوہنے او.....کھناں والے او.....

گاہک تھی کوئی.....میں جانتا تو نہیں۔

پر.....ہم تو جانتے ہیں نا، جی.....مروت.....جی.....مونچھوں تلے شیطانی مسکراہٹ کسمائی، مغز نہ چاٹو، جاؤ اپنا کام کرو۔

کام تو ہوتا رہے گا، نا.....میری مانو تو اسے یہ مفت میں سی دو.....

کیوں بھلا.....؟

پھر وہ تمہیں موج کرائے گی.....

مروت کو نائی سے گھن آنے لگی.....لیکن نائی کی زبان استرے کی طرح چلتی رہی۔

اوئے بادشاہو.....وہ تو گوشت اسی طرح لیتی ہے موج کرا کے.....ایک بار اس پر مرغی والے کا ادھار چڑھ گیا، جب ادھار بہت زیادہ ہو گیا ناں جی، تو مرغی والا غصے سے لال پیلا ہو گیا.....وہ مرغی والے کو ساتھ لے گئی اور سارا ادھار اتار دیا۔ وہ تو کپڑے مفت سلواتی ہے اور وہی اس کے گھر پہنچ جاتی ہے.....اس کے بچوں کی حجامت میں گھر جا کر مفت ہی بنا آتا ہوں، حرج ہی کیا ہے.....؟

مشین رُک گئی، پنکھا ساکت ہو گیا، کونے میں سر بہ زانو عفریت نے انگڑائی لی۔ مروت کا رنگ لٹھا ہوا۔ بہت سے سؤر اور کتے اس کی دکان میں گھس آئے۔ ان کی رال ٹپک رہی تھی۔ سؤروں اور کتوں نے پردے پھاڑ دیئے اور.....وہ کئی سال سے یہ ٹکڑے لیے دکانوں پر گھومتا اور پوچھتا پھرتا ہے.....ہے کوئی اللہ کا بندہ جو اِن ٹکڑوں کو جوڑ دے.....!

کنگن کی کھنک

پرویز انجم

دُنیا کے انتہائی حسین وجمیل مقامات میں ایک خطۂ ارضی جہاں ایک پہاڑی پر آباد چند گھروں کی بستی میں میرو رہتا تھا اونچی اونچی گھاٹیوں کے پس منظر میں پرشکوہ پہاروں نے بٹ منگ کے علاقے کو اپنے حلقہ میں لے رکھا تھا بٹ منگ سے اوپر پہاڑی چوٹی کی ڈھلوانی سطح پر بنے ہوئے کچے مکانات، دُور سے مٹی کے گھروندے معلوم ہوتے تھے۔ ہر گھر کے پہلو یا اس کے دامن میں زینوں کی شکل کی کھیتیاں تھیں۔ جفاکش میرو صبح سے مٹی کے ساتھ مٹی ہوا، اپنے کھیت کی کیاریاں بنانے میں جُتا ہوا تھا۔ یکایک دھوپ آسمانوں میں لوٹ گئی اور بدلیوں کی پریاں قطار در قطار جمع ہونے لگیں۔ طرح طرح کے دوپٹے اُوڑھے، اودے اودے، نیلے نیلے، پیلے پیلے پیرہن والی آب ونور کی پریاں مسکراتی ہوئی پھوار کی صورت اُس پر برس پڑیں۔ میرو کے ہاتھوں میں تیزی آ گئی اُسے جلدی جلدی کام ختم کرنا تھا آج اُس کی رسم مہندی تھی پھول پتیاں جھوم رہی تھی۔ کم سن پودوں پر پھوار کے موتی چمک رہے تھے چڑیاں ان آبی موتیوں کو اپنی ننھی ننھی چونچوں سے چُنتی، چہکتی اُڑ اُڑ کر ایک سے دوسری کیاری پر آجا رہی تھیں اور ہوا کی رگڑ سے کھیتوں میں ساز فطرت بج رہا تھا موسم کے تیور دیکھ کر میرو کا ہاتھ کُھرپی پر رُک گیا۔ اُس نے کام آدھ بیچ چھوڑا اور گاؤں کی راہ لی۔

شام ڈھلتے ہی گھروں کے چولہوں سے چاندی کی شکل کا لہراتا اُٹھتا دھواں وادی میں دلفریب منظر تھا میرو کی خوشی دیدنی تھی سگّاں جسے وہ بچپن سے چاہتا تھا بالاخر اُس کی ہونے والی تھی۔ میرو کے بوڑھے ماں باپ اکلوتے بیٹے کی شادی پر پھولے نہیں سما رہے تھے لالٹین کی نیم تاریک روشنیوں میں ڈھول تاشے کے ساتھ دولہا اور دلہن کے ہاتھوں پر مہندی

رچائی گئی اس رسم میں دونوں گھروں میں اُن کے رشتہ دار اور پڑوسی شریک تھے سروں پر رنگ برنگے سلکی رومال باندھے خواتین خوب ہنسی مذاق میں مشغول تھیں سب باری باری مہندی بھرے تھال میں حسب توفیق روپے ڈالتی جاتی تھیں۔ یہ مہندیائی کی رسم تھی پھر سگّاں کے گھر ''مصری لے جائی گئی مصری کو پھولوں اور خشک میوہ جات کے حاشیے میں سجا کر شگن کے طور پر پیش کیا گیا رات ڈھلی تو خوشبودار لکڑی کی آگ پر دہکتے ساواروں میں چائے کے دور چلے آخر میں رواج کے مطابق دولہا دولہن نے اپنے اپنے گھر کی دیوار پر مہندی لگے ہاتھ ثبت کئے۔ یوں ہتھیلی اور انگلیوں کے نشان، ارمان بھرے دلوں کی سرخیوں سمیت دیوار پر نقش ہو گئے۔

اگلے روز بارات تھی۔ لڑکے والوں کے ہاں بارات سے تھوڑی دیر پہلے اور لڑکی والوں کے ہاں رُخصتی سے کچھ دیر قبل، عورتیں زرق برق کپڑوں میں ملبوس، ایک نقشین گھڑا اُٹھائے قریبی چشمے سے پانی بھرنے جاتی ہیں۔ ''گھڑونجی'' کی اس رسم میں لڑکیاں بالیاں پیش پیش تھیں اور روایتی کشمیری پہناوے، فیرن اور قصابہ میں ملبوس عمر رسیدہ عورتیں ساتھ ساتھ لہک لہک کر گیت گاتی ہوئی جا رہی تھیں رسم و رواج، سکھ بانٹنے اور مسرت طلبی کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں بعض رسومات کے بودے پن کا فیصلہ بھی صادر کر دیا جائے تو بھی اقوام کی روایات پسندی کا رُجحان انہیں قائم رکھتا ہے۔

شہنائی کے بجتے ساز پر سگّاں میرو کی ہو گئی رات کو میرو نے اپنی سجی سنوری دلہن کا گھونگٹ اُٹھایا اور ماں کے دیئے ہوئے دونوں سونے کے کنگن اُس کی طلائی چوڑیوں والی کلائی میں پہنا دیئے۔ پریم بندھن کا یہ پہلا تحفہ تھا میرو کے روئیں روئیں میں ایک انوکھی سرشار کر دینے والی کیفیت کا جادو، ایک مٹھاس سی جگا رہا تھا دھان پان سی سگّاں والہانہ نگاہوں کی زد میں تھی اُس کے رخسار یوں تمتما رہے تھے جیسے کسی نے تانبے کو آگ پر رکھ دیا ہو۔ میرو کا ایک ایک لفظ اُسے ایک میٹھی سی شرمگیں کیفیت میں شرابور کر رہا تھا پھر شریر شریر سرگوشیوں کا سلسلہ اچانک رک گیا بالکل پہاڑی بارشوں کی مانند۔۔۔ دیئے کی لو میں فقط کنگنوں کی کھنک اور چوڑیوں کی جلترنگ باقی تھی اور کوہساروں میں گونجتے کائناتی تاثیر والے پہاڑی گیت، بے خواب رات کے کانوں میں رس گھول رہے تھے۔

نیا سورج شدید بھونچال کے ساتھ طلوع ہوا۔۔۔

میرو کی آنکھ کھلی تو وہ ملبے میں دبا تھا اُس نے پپوٹوں سے مٹی صاف کی اُوپر نیلگوں آسمان پر ہیلی کاپٹر کی گڑگڑاہٹ تھی جو پھڑ پھڑاتے پروں سے تیرتا ہوا دوسری سمت جا رہا تھا وہ ماؤف ذہن اور خالی نظروں سے دیکھ رہا تھا ہیلی کاپٹر اوجھل ہو گیا اور آہستہ آہستہ آواز بھی مدھم پڑتی گئی ـــــ

میرو کے اوسان بحال ہوئے۔ اُس نے اُٹھنے کے لئے حرکت کی درد کی تیز لہر ریڑھ کی ہڈی میں سرایت کر گئی۔ ٹانگیں ملبے کے ڈھیر میں پھنسی تھیں وہ کوشش کر کے نکلا۔ باہر دُنیا لُٹ چکی تھی اُس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ گھر، گاؤں سب غائب ـــ جہاں اُس کے ماں باپ سوئے ہوئے تھے گھر کا وہ حصہ اور گاؤں کے ملحقہ دیگر مکانات سب نشیب میں لُوھک گئے تھے پہاڑ پھٹ گیا تھا نیچے گہرائی میں تودوں کی شکل میں ایک اور پہاڑ بن گیا تھا وہ دہشت زدہ سا نئی وجود میں آنے والی خندق کے کنارے تحیر کے عالم میں کھڑا تھا۔ پیچھے چھوٹا سا ٹکڑا باقی بچا تھا جس پر باقی ماندہ کوٹھے ڈھارے بھی ملیا میٹ تھے چٹانوں کی رنگ اُڑی اُڑی کھیتیاں تباہ اور ساری چڑیاں اُڑ گئی تھیں جیسے بند آنکھوں سے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہا ہو جونہی آنکھ کھلے گی یہ خوفناک منظر پلک جھپکتے ہی غائب ہو جائیں گے مگر ایک قیامت اُس کے سامنے تھی اور تاحد نگاہ بربادیاں۔ وہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ ہوا کیا؟ ـــ اُسے یاد آیا کہ جھٹکے لگے تھے زلزلے کے جھٹکے۔

"ہائے" ـــ کوئی کراہا ـــ سَنگاں ملبے تلے دبی تھی۔ دُھول مٹی سے اَٹی۔ اُس نے شہتیر بالے ہٹائے اور کھینچتے ہوئے اُسے باہر نکالا۔ سَنگاں نے حنائی ہاتھوں سے سر پکڑے ہائے ہائے کی۔ پھر درد کی شدّت سے بے ہوش ہو گئی۔ میرو کی ایک نگاہ سَنگاں پر تھی اور دوسری اتھاہ گہرائیوں کی جانب جس میں اُس کے ماں باپ بمعہ دیوار درگور ہو گئے تھے۔ حلق میں آنسوؤں کا ایک بڑا سا گولہ اٹکا ہوا تھا وہ کمر پکڑ کر بیٹھ گیا دل زور زور سے دھڑکتا جا رہا اور زمیں بھی۔

دن اسی طرح کٹا۔ میرو کی سہاگن سامنے بے حس و حرکت پڑی تھی اور وہ لٹے ہوئے باراتیوں کی طرح پاس بیٹھا تھا۔ کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا اُس نے سنگاں کو ہوش میں لانے کی کوشش کی سر کو بغور دیکھا کوئی زخم نہیں تھا لیکن پشت سے سر اُبھرا ہوا تھا میرو نے اُسے

ہلایا جلایا تو ''آہ'' بھرتے ہوئے اُس نے کہا پانی'' بقیہ ایک چوتھائی زمین پر وہ پاگلوں کی مانند اِدھر اُدھر بھاگا۔ پہاڑی میں شگاف پڑ گئے تھے مٹی کے ساتھ چشمے بھی بہہ گئے تھے پانی کس سے مانگتا؟ مکاں بھی خاموش اور مکیں بھی۔۔۔۔خوبصورت مناظر دیکھنے والی آباد نگاہیں بے نور ہو چکی تھیں۔۔ بوڑھے ماں باپ کی الم ناک موت پر وہ شدید صدمے سے دوچار تھا۔ نظریں ارض و سما کے درمیان معلق تھیں۔صرف ہیلی کاپٹر کی آواز اُسے زندگی سے مربوط کرتی رہی۔

موسم خزاں کی ہوا تند ہو گئی تھی برگشتہ بادل اکھٹے ہو رہے تھے کالا آسماں اور امتحان لینا چاہتا تھا بلندیوں میں برق چمکنے لگی پوٹھوہار کے دیہاتیوں کے محاورہ ہے کہ ہمالیہ کی ترائیوں میں بجلی لشکے تو دودھ دوہنے سے پہلے بارش برس جاتی ہے موسلا دھار مینہ برسنے لگا۔ چوٹی پر مقیم زندہ بچے دونوں بے خانماں بھیگ رہے تھے ان برفیلی بوچھاڑوں نے سگاں کے جسم میں حرکت پیدا کر دی اُس نے اذیت سے کسمساتے ہوئے پھر ہائے ہائے کی میرو نے سر گود میں لے کر دو تین بار اُسے رندھے ہوئے گلے سے پکارا'' سگاں کیا ہوا؟ کہاں چوٹ لگی ہے؟؟؟''

دوزانوں بیٹھے بیٹھے اُس کی نگاہیں آسمان کی طرف اُٹھ گئیں اور ہاتھ بھی قدرت کیوں برہم ہو گئی بے بس نگاہیں برس پڑیں برستا ہوا پانی ہاتھ کے کٹوروں میں بھرتا جا رہا تھا۔اُس نے سگاں کو چُلّو بھر بھر پانی پلایا ہوائیں یخ ہوتی جا رہی تھیں۔ وہ اُٹھ گیا اور ربھیگے طوفانی جھکڑوں کے رُخ پشت کئے چت لیٹی سگاں کے پاس کھڑا ڈھال بنا رہا۔آسمان کچھ دیر بعد خالی ہو گیا مگر میرو کی آنکھوں کے کٹورے بھرے رہے تاریکی پھیل گئی اُس نے چوٹی سے دُور نشیبی آبادیوں کے طرف نظر دوڑائی جہاں رات کے سناٹے میں قصبے کے برقی قمقمے یوں جگمگایا کرتے تھے جیسے کوہساروں میں جگنوؤں کی بارات رُکی ہو مکانوں کی آنکھیں بجھ گئی تھیں۔رات کا رنگ اور کالا ہو گیا تھا انسانوں کی اتنی شدید ضرورت اس بات کا اُسے آج احساس ہوا۔

سگاں کی حالت غیر تھی میرو نے اپنے مسمار نشیمن پر الوداعی نظر ڈالی اور سگاں کو پیٹھ پر لاد کر مردہ روشنیوں کی طرف چل پڑا مگر کمر کی تکلیف کے باعث تھوڑی دور جا کر ڈگمگا گیا لیکن سگاں کی زندگی کے لئے نیچے وادی تک کا سفر اُس پر لازم تھا اُس نے ہمت مجتمع کی اور تاریک ڈھلوانی گھاٹیوں کی جانب اُترنے لگا۔

راہیں اور پگڈنڈیاں دراڑوں کا روپ دھار چکی تھیں اندھیرا ہر طرف قابض تھا اور

گرد ونواح میں ہولناک رات مسلط تھی وقت جیسے لنگڑاتے ہوئے چل رہا تھا سگاں کی جھولتی کلائی میں کنگن کی کھنک ساری رات اُس کی ہمسفر رہی ۔ تحفے ،نشانیاں ،یادگاریں محبت کرنے والوں کے تعویز ہوتے ہیں کنگن کی صدا اُس میں نئی روح پھونکتی رہی گیلی آنکھوں سے وہ تمام شب کٹی پھٹی دھرتی پھلانگتا رہا۔

دوسری بے مہر صبح طلوع ہوئی ۔ نیا دن ،نئی داستانیں لے کر آیا۔ پہاڑ اجنبی اور خود سر معلوم ہورہے تھے زمین کے باطن میں آگ کھول رہی تھی زمین وقفے وقفے سے ہلتی رہی میر وعروسی بدن اُٹھائے سنگ ریزوں پر چلتا رہا۔ بلکہ رینگ رہا تھا۔ گونڈھال تھا مگر پُرعزم ۔ سگاں کو دوبار ہوش آیا اُس نے پانی مانگا ۔بہتی چاندی والی آبشاریں جانے کیا ہوئیں پرندوں کی قطاریں ٹوٹ گئی تھیں۔ آبادیاں اُجاڑ بیاباں ۔۔۔سڑکیں اُدھڑی ہوئیں ۔ جہاں گھوڑے فاختاؤں کی طرح اُڑتے جاتے تھے وہ راستے مسدود شاعروں کے محبوب بہشتی نظارے جہنم بن گئے تھے۔ فصلیں برباد، کوّے کائیں کائیں کررہے تھے چیلیں چھلور بھر رہی تھیں۔ گدھ منڈلا رہے تھے ۔بستیوں میں اُس کے درد کا درماں کوئی نہیں تھا۔ جگہ جگہ لوگ ستاتے ،سسکتے دکھائی دے رہے تھے ۔ پہلے ہر مقام پر دو چار نظر آتے تھے مگر اب چھوٹے چھوٹے قافلوں کی شکل اختیار کرتے جارہے تھے جو زخمیوں کو اُٹھائے ۔ بدحالی کی تصویر بنے شہروں کی جانب گامزن تھے آدمی مرنے سے پہلے ہی مر گئے تھے ۔ دیدہ داروں کے لئے سمجھنا آسان تھا کہ موت کا نظر انداز کیا ہوا لمحہ زندگی ہے یا یوں کہیے زندگی موت کی رعایت ہے مضافات میں لاشوں کی تعداد متواتر بڑھ رہی تھی گلی سڑی بے گوروکفن لاشیں ۔ ہر طرف موت دھاڑ رہی تھی۔

قحط التفات کے لوگ آنکھیں چُرا رہے تھے کسی کی آنکھ کو کوّا کھا گیا کسی کے گال گیڈر نوچ لے گئے اور کسی پر گدھ اس طرح چھاپا مارے ہوئے تھے کہ مردہ کہیں نظر ہی نہیں آ رہا تھا زمین پر گدھ سینہ تانے اُچھلتے کودتے پھر رہے تھے کالے کالے پروں سُرخ سُرخ سینوں والے جن پر لال ٹول کھیس داڑھی کی طرح لٹک رہی تھی جیسے سینکڑوں کالی کی مورتیاں زبانیں نکالے ناچ رہی ہوں۔ اناروں چناروں کے سرزمین پر اب گدھوں کا قبضہ تھا۔

سارا خطہ کھنڈر تھا مگر راستے میں پڑتا تھا میر و بدترین مناظر سے رہا اُس نے جانے

کتنے گھاؤ لگے مگر حوصلے کا کوئی کنارہ نہیں ہوتا۔ فاصلے ارادے کی دوری پر ہوتے ہیں لازم نہیں کہ حادثات انسان کو مایوس کریں انسان کا معاملہ بھی عجیب ہے۔لَو کی ایک لہر اُسے بددل اور بدحواس کرسکتی ہے اور چاہے تو آدم زاد وسیع وعریض مصیبتوں میں بھی ڈٹ جائے۔ عظمتیں ہمیشہ آزمائش کے باطن سے طلوع ہوتی ہیں۔ زندگی کی تخلیق آزمائش سے مشروط ہے اور آزمائش دائمی ہے۔

میرو رات دن کی کٹھن مسافت کے بعد سرِ شام جب مظفر آباد پہنچا تو دریائے نیلم کے پانی کا شور مدھم اور غمگین تھا۔ شہر ریزہ ریزہ ہو چکا تھ۔ چہار سو مسمار عمارتوں کا انبار۔۔۔ جیسے کوئی بدی کا دیو بِھر گیا ہو جہاں اُس کا پاؤں پڑا ہو وہاں سب تلپٹ۔۔عرش کی سیدھ میں اُٹھے گنبد سر بریدہ زمین کی پہنائیوں میں لُوھکے پڑے تھے جن گلیوں میں کشمیری کُلچوں کی سوندھی سوندھی باس اُٹھتی تھی وہ بازار لاشوں سے پٹے تھے چہکتے بولتے کمرے منہدم تھے کرچی کرچی لواحقین کے اُوپر کوئی سائبان نہیں تھا۔ شہ نشینوں والے لکڑی کے نقشین گھر پیوند زمین ہو چکے تھے گل رُخ چہرے اپنے ہی گھروں کی دیواروں نے مسل دیئے مستقبل کے خوبصورت سہانے خواب زلزلے کے جھٹکوں میں کچلے گئے اور بے شمار ادھ کھلے پھول کنکریٹ کے تودوں تلے مرجھا گئے۔ وادی میں لالے کے پھول تو اب بھی کھلے تھے مگر یوں لگ رہا تھا جیسے پھول نہیں بے شمار آنکھیں دیکھ رہی ہوں۔ چیخیں، بین، سیاپے......

غروب آفتاب کے اس دلآویز منظر میں پربتوں پر شام الم بپا تھی شہر میں کوئی طبیب نہ حبیب ہر آدمی اکیلا تھا۔ میرو نے کاندھے پر لدی سگاں کو تاروں میں اُلجھے پڑے ایک کھمبے سے پرے، تاریکی کی اوٹ میں لٹا دیا ہاتھ پاؤں سوجھے ہوئے، کمر میں ٹیسیں، پیروں میں دُکھن میرو زمین پر بیٹھ گیا سگاں غشی کی سی کیفیت تھی آنکھیں دھنسی ہوئی، گال بیٹھے ہوئے پیٹ پچکا ہوا میرو کے دل کو دھچکا سا لگا۔ گدھ منڈلا منڈلا کر اونچے درختوں پر آ آ کر بیٹھ رہے تھے وہ بے وسیلہ لوگوں کو ادھر اُدھر آتا جاتا دیکھ رہا تھا اچانک فضا میں ہیلی کاپٹروں کی آواز گونجی سب اُس طرف بھاگے، گرتے پڑے زخمیوں کو اُٹھائے ہوئے پھیلے ہوئے آفت زدگان سمٹ رہے تھے جونہی آرمی ہیلی کاپٹروں کی ٹولی نے گراؤنڈ پر لینڈ کیا۔ زندہ لاشوں کا جمِ غفیر اُن آسمانی فرشتوں کی جانب کود پڑا چیخ و پکار کا عالم تھا۔ تازہ کڑک وردیوں والے مستعد

فوجی جوان پُر ملال آنکھوں سے تسلی اور صبر کی تلقین کر رہے تھے بار بار دہرا رہے تھے" مدد آ رہی ہے" صبر صبر۔ میڈیکل ٹیمیں پہنچ رہی ہیں۔ زخمیوں کو جلد پنڈی لے جایا جائے گا۔ بس صبر......"

ایک اعلیٰ فوجی افسر جلدی جلدی ہدایات جاری کر رہا تھا" انتظامیہ کو ایکٹو کرو......عوام کے نمائندے کدھر ہیں اُن کو دیکھو۔ اُن کو کنٹیکٹ میں لاؤ۔۔۔روٹی بھی کپڑا بھی مکان بھی......آج اشد ضرورت ہے ان چیزوں کی......

فوجی چیتوں کی سی پھرتی سے متحرک ہو گئے۔ ہنگامی بنیادوں پر ریلیف کا کام شروع ہو گیا تھا سوائے ہیلی کاپٹروں کی روشنیوں کے کوئی اور انتظام نہیں تھا۔ اندھیر نگری میں لنگر خانے کھل گئے۔ نفسا نفسی کا سماں تھا بار بار آوازیں بلند ہو رہی تھی۔" لائن بناؤ"" لائن بناؤ"

ایک طرف دودھ بسکٹ گلوکوز تقسیم ہو رہا تھا دوسری جانب دال روٹی بٹ رہی تھی قطار آہستہ آہستہ لنگر کی طرف بڑھ رہی تھی لوگ طرح طرح کے برتن لے لے کر آ رہے تھے۔ ٹوٹے پھوٹے، المونیم کے، مٹی کے پیتل، تانبے کے، سٹیل کے جن کی صورت اپنے مالکوں کی صورتوں کی طرح مسخ ہو چکی تھی۔ بہتوں کو تو روٹی بھی نہیں مل پا رہی تھی۔ بوڑھے مرد، عورتیں اور بچے تو پہنچ ہی نہیں پا رہے تھے اور جن کو ملی تھی اُن میں سے اکثر کے معدے فاقے کرتے کرتے اتنے سوکھ گئے تھے کہ کھانے کا بوجھ ہی برداشت نہیں کر پا رہے تھے۔

دو دن سے بھوکے میرو کی بھوک چمک اُٹھی۔ وہ بھی بھیک منگوں کی قطار میں شامل ہو گیا۔ نظریں دال روٹی پر جمی تھیں۔ وہ بھول گیا کہ کچھ فاصلے پر سگاں کو بے یار و مددگار چھوڑ آیا ہے آہستہ آہستہ وہ لنگر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ٹخنے ٹخنے کیچڑ تھی۔ سو گز کے فاصلے پر لنگر خانہ تھا اُس سو گز کے فاصلے میں ہزاروں بھوکے پیٹوں کا فاصلہ تھا۔ ایک بھیڑ پیچھے چلی آ رہی تھی اُس کی نگاہ ایک انتہائی لاغر بوڑھے پر پڑی جو لنگر حاصل کئے واپس آ رہا تھا، بازو پر لٹکتی شال سنبھالتا ہوا۔ پلیٹ میں گرم گرم دال سے بھاپ اُٹھ رہی تھی۔ میرو کو اُس ہڈی ہڈی ڈھانچے پر رشک آ رہا تھا۔ اتنے میں پیچھے سے دو مشٹنڈے آئے ایک اُس پر جھپٹا اور شال اُڑا لے گیا۔ دوسرے آدمی نے دال بھر پلیٹ اپنی طرف کھینچنا چاہی۔ بوڑھا اُسے حاصل نہیں کرنے دے رہا تھا۔ پورا زور لگا رہا تھا۔ اس وقت دو بھوکے پیٹ لڑ رہے تھے۔ قطار سے نکل کر کچھ اور

لوگ بھی اس چھینا جھپٹی میں شامل ہو گئے۔ اُدھم مچ گیا۔ ناتواں بوڑھا گر پڑا اور پیچھے کے لوگ اُسے روندتے گزر گئے۔ دو تین کراہوں کی آواز آئی اور بس۔۔۔

بوڑھا نیچے سسکا پڑا تھا۔ جرم ضعیفی سے بڑا کوئی جرم نہیں۔ اس قدرتی آفت نے نہ محض لوگوں کے جسم مسخ کئے تھے بلکہ اُن کے اخلاق و کردار اور روحیں بھی مسخ کر دی تھیں۔ بحران افراد اور اقوام کو بے نقاب کرتے ہیں۔ میرو اس دھکم پیل سے نکل آیا۔

نیم خستہ سا وہ سگّاں کی جانب بڑھ رہا تھا ابھی کچھ فاصلے پر تھا کہ اُدھر سے دو ہیولے سے دکھائی دیئے جو سگّاں کے پاس منڈلا رہے تھے میرو کے قدموں میں تیزی آ گئی۔ اُس نے دور سے پہچان لیا وہی دونوں مشٹنڈے راہزن تھے۔ ایک نے جھک کر سگّاں کا جائزہ لیا۔ میرو کا دل لرزا۔ اُس نے اونچی آواز میں پکارا" کون ہے؟" اور ساتھ ہی دوڑ پڑا اسی اثناء میں سگّاں کی دلدوز چیخ بلند ہوئی اور وہ بری طرح کلبلائی۔ میرو پوری طاقت سے للکارا" ٹھہرو۔۔۔ کون ہو؟" اُسے سر پر پہنچا دیکھ کر ایک نے عجلت سے دوسرے سے کہا" اوئے یہ لو۔۔۔ پکڑو اور بھاگو" دوسرے نے کوئی چیز شال میں لپیٹی اور دونوں بھاگ گئے۔ میرو بھی بھاگا مگر وہ دور گھاٹی کی تاریکیوں میں غائب ہو گئے۔ میرو پیچھے بھاگتا ہوا پھسل پڑا۔ اُٹھا گندے پانی سے لت پت اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ بے سود تھا۔ سانس بحال ہوئی تو اُسے خیال آیا کہ اُن کے پاس تو تن پر اوڑھے کپڑوں کے علاوہ کوئی اور شے تھی ہی نہیں۔ وہ واپس آ گیا۔ سگّاں آڑھی ترچھی ادھ موئی پڑی تھی۔ اُس نے فکر مندی سے چہرہ سر چھو کر دیکھا" مگر یہ اتنا زور سے کیوں چیخی تھی؟ اُس نے خود کلامی کی۔ گردن کی رگوں پر ہاتھ رکھا۔۔ نبض چل رہی تھی۔

" کون ہے ادھر؟ " ایک بارعب آواز پر یکلخت اُس نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک وجیہہ آرمی آفیسر اُسے تنقیدی نظروں سے کھڑا دیکھ رہا تھا۔

" جی۔۔۔ جی یہ میری بیوی ہے" میرو نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

" کیا ہوا اسے۔۔۔۔؟ " اُس نے دوسرا سوال کیا۔

" اس کے سر پر گہری چوٹ لگی ہے۔ دو دن سے بے ہوش ہے۔"

" تم نے کسی آرمی یونٹ سے رابطہ کیا؟"

میرو کھڑا ہو گیا'' جناب میں بٹ منگ کی پہاڑی سے دو دن کے سفر کے بعد اس کو اُٹھا کر یہاں لایا ہوں'' اُس کی آواز بیٹھ گئی۔

''اوہ......آفیسر نے تاسف کا اظہار کیا۔

وہ مترحم نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''اسے اُٹھاؤ اور اُس ہیلی کاپٹر میں ڈالو'' دور اشارہ کرتے ہوئے اُس نے کہا اسے فوری طبی امداد کی ضرورت ہے''

یہ کہہ کر آرمی آفیسر پلٹ گیا۔ میرو کو جیسے زندگی کا پروانہ مل گیا ہو۔ جلدی سے اُسے اُٹھایا اور آفیسر کے پیچھے پیچھے چل پڑا اُس میں یکدم ڈھیروں توانائی آ گئی تھی۔ مگر سگاں کی گردن بار بار ڈھلک رہی تھی اُسے سنبھالنے میں دقت پیش آ رہی تھی فوجی کیمپ کے ایریا میں داخل ہوتے ہوئے آفیسر نے آواز لگائی۔'' آؤ بھئی جلدی کرو۔۔'' میرو جلدی جلدی قدم اُٹھانے لگا۔ ہیلی کاپٹر چند قدموں کی دوری پر تھا۔ ذہن میں پچھلی رات کے سفر کی بازگشت تھی جب وہ سگاں کو اُٹھائے ہوئے کھنکتی چوڑیوں کے دوش پر دشوار گزار سناٹے عبور کر رہا تھا۔ چلتے چلتے میرو یکلخت چونک گیا۔ قدم سست پڑ گئے۔ اس بار وہ جلترنگ......بے اختیار میرو کا ہاتھ سگاں کے کاندھے پر گیا۔ کاندھے سے سرکتا ہوا کہنی پر اس کے بعد خلا۔۔۔اُس کے حلق سے صرف اس قدر نکلا'' ہیں یہ کیا؟''

زمین جھول رہی تھی۔ وہ گھٹنوں بیٹھ گیا۔ ایسے جیسے کسی پلاسٹک کے گڈے کا اندر کا دھاگا ٹوٹ جائے اور اعضاء بکھر کر لٹک گئے ہوں۔ طلائی چوڑیوں والی کلائی کٹ گئی تھی اور کنگن کی کھنک، وادی میں ڈوبتی اُبھرتی سسکیوں میں معدوم ہو گئی تھی۔

ایک گمشدہ لوری کی بازیافت

عاطف علیم

''پانی......''

پہچان میں واپسی پر یہ پہلا اسم تھا جو اس پر تب ظاہر ہوا جب اس کی پیاس سے پتھرائی زبان نے ریت میں موجود نمی سے ٹھنڈک پائی۔

یہ گذرے جنموں میں کھوئے گئے آج کی بات تھی کہ وہ ایک مہربان آغوش میں سمٹا، نرم ہاتھ کی تھپکیوں اور خواب آگیں لوری کے کیف میں مست نیند کے ہلکورے لے رہا تھا کہ وقت کے کسی کڑے لمحے میں ماس کی جلن پر اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے دیکھا کہ وہ لوہے کے ایک تپے ہوئے بنچ پر پڑا تھا اور اس کے نومولود برہنہ جسم کو سورج کی آگ چاٹ رہی تھی جبکہ ریت کے بکھرتے ہوئے ٹیلے کا سایہ سرکتے ہوئے کہیں دور جا چکا تھا۔

''ماں؟......''

''ماں کہاں گئی؟............اور یہ میں کہاں ہوں؟............یہ کون سے وقت، کون سے دیس میں؟''

وہ کچی نیند سے جگائے جانے کی جھنجلاہٹ میں تھا اور ماں کی گرم آغوش میں سمٹ کر گہری نیندوں سونے کی خواہش اسے پاگل کئے دے رہی تھی۔۔لیکن ماں؟۔۔اس کے انگ انگ سے پھوٹتی خواب آگیں لوری؟

اس نے عالم حیرت میں بدن کو ٹٹول کر اپنے ہونے کو جانا اور انگارہ سے دھکتے بنچ پر سوختہ جلد کی چپیاں چھوڑ اپنے قدموں پر کھڑا ہو گیا اسے ماں کی تلاش کے سفر پر روانہ ہونا تھا جبکہ اس کے سامنے وقت کی لاانتہاد وسعتوں تک ریگستان پھیلا ہوا تھا جس میں بنتے

بگڑتے ٹیلوں کے سرکتے سائے تحرک کے واحد صورت تھے۔

وہ جولاوقت کی قید سے وقت کی قید میں جبری منتقلی کے دوران علم الاسماء سے کٹ گیا تھا اور جس کی پسلیوں سے جما وجود کھویا گیا تھا اس کی پشت پر جگہ جگہ سے جلد اکھڑنے سے بننے والے زخموں میں بھرے ریت کے ذرے اسے کاٹے دے رہے تھے۔ وہ اپنے بدن پر جلن اوڑھے اور پتھر زبان پر پیاس اور پیٹ میں بھوک کی بھڑک لئے اٹا ٹوٹ تنہائی اور سناٹے میں سرکتے سایوں کی ہمراہی میں تھکے تھکے قدموں چلتا رہا۔

''ماں تم اچانک سے کہاں چلی گئیں؟............تم ہی تو میری امان ہو۔ اب مجھ کو دودھ کون پلائے گا؟............لوری کون سنائے گا۔

کچی نیندوں جاگنے کی اذیت ناک بوجھلتا کے باوجود ریگستان کے بھید بھرے سکوت اور جھلتی ہوئی وسعتوں کے بیچوں بیچ وہ چلتا رہا کہ اس کے سامنے ایک سراب کی جھلملاہٹ تھی جس سے اُٹھتی ہوئی نمی کی ٹھنڈک ماں کے دودھ کی پر اشتہا باس سے بوجھل تھی اور جس کے بھیتر سے گم گشتہ لوری کی مدھم سی ڈوبتی ابھرتی گنگناہٹ ناگزیر بلاوے بلاتی اسے ورغلا رہی تھی۔ وہ نخلستان جیسی کسی چیز سے تو آشنا نہ تھا لیکن لمبے لمبے ڈگ بھرتے کچھ ایسا جانفزا منظر اپنے ذہن میں جما رکھا تھا جیسے کہ مثلاً۔۔ کسی بڑے ٹیلے کے دور تک پھیلے ہوئے سائے تلے ٹھنڈے ٹھار، بے رنگ سیال کا بہاؤ، نیم گرم میٹھا میٹھا دودھ، ڈھیروں ڈھیر ایسی چیزیں جن میں بے تاب دانت گاڑ کر انہیں پیٹ میں اُتارا جا سکے اور پھر وہیں کہیں لوری گنگناتے کسی وجود کے ہاتھوں کی نرم نیند آور تھپک۔

وہ بے تاب طلب کے ساتھ یوں چلتا رہا اور تھکن اس کی پنڈلیوں کو پتھراتی رہی مگر سامنے والا منظر بھی ایک چالاک تھا جو اس ترس کھائے بغیر اسے اپنے پیچھے لگائے رہا۔

وہ کچھ بھی بھولا نہیں تھا کہ ابھی تو اسے اپنے ہونے جیسا ادق مسئلہ حل کرنا تھا لیکن پیاس سے پتھرائی زبان اور بھوک سے کٹتے شکم کے ساتھ فیلسوف تو نہیں بنا جا سکتا سو اس نے اپنی فکری احتیاج کو تب تک کے لئے اُٹھا رکھا جب تک وہ اس کم بخت ہاتھ نہ آنے والی جھلملاہٹ کو پورم پور حلق سے نہ اُتار لے۔

''تب لوری کی نرم تھپکیوں میں نیند لے ہلکورے لیتے جسم کے ہونے یا نہ ہونے

کے بارے میں ذرا جم کر سوچا جائے گا۔'' وہ چلتے ہوئے نہیں سیانپ کے ساتھ الفاظ سے تہی خیال سے خود کو بہلاتا رہا۔

خود کو بہلاتے پھسلاتے بہت سے جیون، کئی جنم اور کتنے یگ اسی بھاگم دوڑ میں بیت چکے تب کہیں جا کر اسے رتیلے افق پر کیکٹس نما ایک دیو قامت جھاڑی نمودار ہوتی دکھائی دی جس کے پس منظر میں موجود پگھلی ہوئی چاندی سا جھلملاتا منظر اس میں تحلیل ہو کر اپنا وجود کھو رہا تھا۔

اس کے تحت الشعور میں یہ منظر ہمیشہ کیلئے نقش ہونے والا تھا کہ وہاں تک پہنچتے پہنچتے وہ بے دم سا ہو کر آنکھیں موندھے پڑا تھا کہ کیکٹس نما جھاڑی جو ابتدائے آفرینش کی سفاک وسعتوں بیچ زندہ ہونے میں اس کی واحد ساجھے دار تھی جھک کر اپنے چاندی سے پتوں اور نرم کانٹوں کے ساتھ اس کے جسم کو ایک پر ترغیب مسکان سے سہلایا۔ اس جنسی لذت میں بھیگی کھلی ترغیب پر اس نے مشکلوں سے اپنے پپوٹے کھول کر ہاتھ بڑھایا اور پھر تمام تر بچی کھچی بے تابی کو سمیٹتے ہوئے جھپٹا سا مار کر اسے کچر کچر پیٹ میں اُتارنے لگا۔

وہ اس کیکٹس نما کے زہر کو جڑوں تک پیٹ میں اُتار چکا تھا مگر بھوک کی جلن ابھی باقی تھی تب اس نے جڑوں کی جگہ رہ جانے والے گڑھے میں سر ڈال دیا اور پتھر زبان سے ریت کو چوسنے لگا۔

''پانی!۔۔۔'' اس نے ریت میں موجود نمی سے زبان پر ٹھنڈک سرسراتے محسوس کی تو وہ ایک شیزوفرینک ہنسی ہنسا اور اپنے ہونے کے بعد کا پہلا اسم کہا۔

اس کے دماغ کے عقبی پھیلاؤ میں موجود وقت کی طرح لاانتہا ریگستان میں مدارات کا یہ پہلا لمحہ تھا وہ اس لمحے میں اپنے انداز کی خوشی سے بے حال دونوں ہاتھوں سے ریت اُڑاتا اور بے تاب گڑھے کو چاٹتا اسے گہرے سے گہرا کرتا رہا۔ تب بہت سی ریت پیٹ میں اُتار چکنے پر اس نے دیکھا کہ گڑھے کے بیچ وہ پگھلی ہوئی عیار چاندی جھلملا رہی تھی جس میں کھلی لوری کے تعاقب میں وہ بھٹکتا پھرا تھا۔

اس کی نوک زبان کو چھوتے ہوئے پانی نے ریت کے بنجر پن سے رہائی پائی تو اس نے ایک آسودہ حیرت سے سنا کہ ریگستان کی وسعتوں میں بے سمت پھیلی گنگناہٹ جسے

چھونے کے پاگل پن میں وہ پور پور تھک چکا تھا پانی کی گہرائیوں سے ڈوب ڈوب کر ابھر رہی تھی جیسے وہیں کہیں کوئی ماں نیند کے بوجھل خمار میں ڈوبی اپنے بچے کو لوری سنا رہی ہو۔

کیکٹس نما اور ریت سے اپنے معدے بھر لینے کے بعد یہ وقت تھا کہ وہ آسن جما کر اپنے ہونے کی نوعیت جانے میں جت جاتا مگر یہ آواز؟۔۔۔۔

وہ خود کو بھولا، پانی میں نظریں جمائے گنگناہٹ کو تلاش کرتا رہا۔ خود کو نرم ہاتھوں سے آہستہ آہستہ تھپتھپائے جانے کی بے پناہ خواہش نے اس پر غلبہ پالیا۔ اس جھاڑ جھنکار داڑھی والے شیزوفرینک بچے نے جو لوہے کے ایک دھکتے ہوئے بنچ پر پیدا ہوا تھا اور جس کی صحرائی سورج کی آگ سے جھلسی، کٹی پھٹی جلد میں ریت کی کاٹ بھری تھی ماں کی چھاتیوں سے چمٹ کر سو جانے کی خواہش سے بے حال ہو کر ایک بے تاب کلکاری بھری اور بازوؤں کی اضطراری حرکت سے پانی میں چپو چلاتے ہوئے بلاوے بلاتی اس آواز کے تعاقب میں سحرزدہ سا گہرائیوں میں اتر گیا۔

وہ ایک ناپید کنار اور نامعلوم اتھاہ کے سمندر میں تھا اور گنگناہٹ کی نغمگی سے بے خود بازوؤں اور ٹانگوں کے پرزور جنبش سے زیریں لہروں کو کاٹتا مزے سے گہرائیوں میں اترتا جا رہا تھا سورج کی روشنی نے تھوڑی دور تک اس کا ساتھ دیا جس کے بعد قسما قسم کی مخلوق اور سمندری چٹانوں کے دراڑوں سے پھوٹے ہوئے، لہروں کی حرکت کے ساتھ لہراتے پودوں کو ان کے اندر کی مدہم سی روشنی سے نیم روشن ہونے کے باوجود سایہ سا دیکھ سکتا تھا راستے میں کتنے ہی ڈریگون، آکٹوپس، نیلی شارکس اور جنے کون کون سی نسل کے چیڑ پھاڑ کے شوقین اس پر لپکے مگر اسے کھایا ہوا وجود جان کر کر مجوب سے پلٹ گئے فقط جگنوسی روشن چھوٹی چھوٹی رنگا رنگ مچھلیوں کا ایک غول تھا جو گنگناہٹ کی راہ پر اسے حفاظتی گھیرے میں لئے رہا۔

وہیں کہیں بیچ راہ اس میں لڑھکنے کی حالت میں موجود چٹانوں میں پھنسے ہوئے ایک غرقاب جہاز کو دیکھا تو ذرا کی ذرا دم لینے کو اس پر اتر گیا اس کائی اور تعفن میں لپٹے عظیم الحبثہ جہاز میں افزائش نسل کی فکر میں غلطاں اور وجود کی گرم باس سے مستائے ہوئے آکٹوپس کے ایک جوڑے کے سوا کوئی ذی روح موجود نہ تھا جبکہ اس کا ریڈیو یونہی بیکار میں ایس وایس کے سگنل نشر کئے جا رہا تھا۔ اس نے سمندر اور وقت کی مار کھائے جہاز کے گلتے سڑتے

ڈھانچے کو گھوم پھر کر دیکھنا چاہا لیکن وہاں دیکھنے کو رکھا کیا تھا؟ بجز یہ کہ وہاں ہر کہیں جوڑا جوڑا
جانوروں اور پرندوں کی حنوط شدہ لاشیں تھیں جن سے جھڑتے ناقص مسالے تلے جھانکتے
ہوئے گلے گلائے ماس سے تعفن پھوٹ رہا تھا۔ انہیں کے درمیان مذہبی دیو مالا میں مذکور ایک
طویل قامت برہنہ شخص بانہیں کھولے اوندھے منہ پڑا تھا۔ اپنی موت کے وقت سے تب تک
بڑھتی اس کی سفید گھنی داڑھی گزوں پھیل کر مادہ لوگوں کے لئے انڈے بچے دینے کی ایک خفیہ
اور محفوظ پناہ گاہ بن چکی تھی۔

اس نے جانا کہ وہ کوہ ارارات کے نواح میں ہے۔ سو اس نے تمام مرحومین کیلئے یک لحظہ
رکی ہے گریہ کیا اور کارلائنات میں مداخلت سے جا بجا حاصل آ کنوپس کی خشمگیں نگاہ کے جواب
میں اسے آنکھ مارتا، راہنما مچھلیوں کے جلو میں گنگناہٹ کے تعاقب میں روانہ ہو گیا۔

وہ بیچ راہ حائل ہونے والے غرقاب جہازوں کے اکھڑے ہوئے آوارہ تختوں اور
بکھری بھری لاشوں سے الجھتا وہاں پہنچا تو جگنوؤں جیسی رنگا رنگ مچھلیوں نے اس کے گرد
الوداعی طواف کیا اور واپس پلٹ گئیں۔ اب وہ سمندر کی لامحدود تاریکی میں موجود ایک تنہا
آدمی تھا اور اس کے سامنے ایک زیر آب شہر پھیلا ہوا تھا۔

وہاں پہنچ کر اس نے دیکھا کہ اس کے عین سامنے شہر کے بھید چھپائے ہوئے
ایک دیو قامت آہنی پھاٹک ایستادہ تھا جو کبھی پر ہیبت رہا ہو گا لیکن اب اس پر بھی کائی کے
دبیز تہہ نے اسے کسی سالخوردہ مسکین کا پیکر دے رکھا تھا۔ اس نے مارے تجسس کے بڑھ کر پھاٹک
کو دھکیل کر کھولنا چاہا تو ذرا سا زور لگانے پر وہ ایک گڑگڑاہٹ کے ساتھ کیلوں، قبضوں سمیت
نیچے آ رہا۔ وہ بھی اپنی جھونک میں اس کے ساتھ ہی زمین بوس ہوا تھا لیکن سرت بحال ہونے
پر اس نے اپنے آپ کو زندہ پایا تو منہ سر سے کائی کو پونچھتا اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے نگاہ کی تو اس
کے سامنے بے در مکانوں اور ایک دوسرے کو کاٹتی گلیوں کی پیچیدگی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ شہر کا طول
و عرض تو نہ جان پایا مگر اس نے دیکھا کہ اس قدیمی شہر کی دیواروں، دہلیزوں، چھتوں اور گلیوں
میں بھی کائی نے اس کے تمام نقش یک رنگی تلے چھپا دیے تھے یوں کہ کسی ایک مکان یا کسی
ایک گلی کو الگ سے پہچاننا ممکن نہیں رہا تھا۔

اس نے ایک گلی کے پھسلواں فرش پر ایڑیاں گاڑ کے اپنا توازن درست کیا اور ایک

ڈھانچے کو گھوم پھر کر دیکھنا چاہا لیکن وہاں دیکھنے کو رکھا کیا تھا؟ بجز یہ کہ وہاں ہر کہیں جوڑا جوڑا جانوروں اور پرندوں کی حنوط شدہ لاشیں تھیں جن سے جھڑتے ناقص مصالحے تلے جھانکتے ہوئے گلے گلائے ماس سے تعفن پھوٹ رہا تھا نہیں کے درمیان مذہبی دیو مالا میں مذکور ایک طویل قامت برہنہ شخص ٹانگیں کھولے اوندھے منہ پڑا تھا اپنی موت کے وقت سے تب تک بڑھتی اس کی سفید گھنی داڑھی گزوں پھیل کر مادہ لوگوں کے لئے انڈے بچے دینے کی ایک خفیہ اور محفوظ پناہ گاہ بن چکی تھی۔

اس نے جانا کہ وہ کوہ ارادات کے نواح میں سو اس نے تمام مرحومین کیلئے یک لحظہ رسمی سے گریہ کیا اور کارلذت میں مداخلت بے جا پر فاعل آکٹوپس کی خشمگیں نگاہ کے جواب میں اسے آنکھ ٹکا، راہنما مچھلیوں کے جلو میں گنگناہٹ کے تعاقب میں روانہ ہو گیا۔

وہ بیچ راہ حائل ہونے والے غرقاب جہازوں کے اکھڑے ہوئے آوارہ تختوں اور چکراتی پھرتی لاشوں سے الجھتا وہاں پہنچا تو جگنوسی چمکتی رنگا رنگ مچھلیوں نے اس کے گرد الوداعی طواف کیا اور واپس پلٹ گئیں۔ اب وہ سمندر کی لامحدود تاریکی میں موجود ایک تنہا آدمی تھا اور اس کے سامنے ایک زیر آب شہر پھیلا ہوا تھا۔

وہاں پہنچنے پر اس نے دیکھا کہ اس کے عین سامنے شہر کے بھید چھپائے ہوئے ایک دیو قامت آہنی پھاٹک ایستادہ تھا جو کبھی پر ہیبت رہا ہو گا لیکن اب اس پر جمی کائی کے دبیز تہہ نے اسے کہن سالہ مسکینی کا ٹیکسچر دے رکھا تھا اس نے مارے تجسس کے بڑھ کر پھاٹک کو دھکیل کر کھولنا چاہا تو ذرا سا ذور لگانے پر وہ ایک گڑگڑاہٹ کے ساتھ کیلوں، قبضوں سمیت نیچے آ رہا۔ وہ بھی اپنی جھونک میں اس کے ساتھ ہی زمین بوس ہوا تھا لیکن سرت بحال ہونے پر اس نے اپنے آپ کو زندہ پایا تو منہ سر سے کائی کو پونچھتا اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے نگاہ کی تو اس کے سامنے بے در مکانوں اور ایک دوسرے کو کاٹتی گلیوں کی پیچیدگی پھیلی ہوئی تھی وہ شہر کا طول وعرض تو نہ جان پایا مگر اس نے دیکھا کہ اس قدیمی شہر کی دیواروں، دہلیزوں، چھتوں اور گلیوں میں جمی کائی نے اس کے تمام نقش یک رنگی تلے چھپا دیئے تھے یوں کہ کسی ایک مکان یا کسی ایک گلی کو الگ سے پہچاننا ممکن نہیں رہا تھا۔

اس نے ایک گلی کے پھسلواں فرش پر ایڑیاں گاڑے اپنا توازن درست کیا اور ایک

فاتحانہ طمانیت سے جانا کہ جس بلاوے بلاتی لوری نے اس تھکا دیا مارا تھا وہ یہیں کہیں سے ٹرانسمٹ ہو رہی تھی۔ اس نے ایک آسودہ سانس کھینچی اس کا سفر تمام ہوا تھا اور اب وہ اپنا تھکا ماندہ وجود اس لوری کو سونپ کر شانت سو سکتا تھا۔

وہ لوری کی ٹھیک ٹھیک جائے موجودگی کی تلاش میں گلیوں گلیوں پھسلتا چلا گیا اس نے شہر نوردی کے دوران دیکھا کہ وہاں ہر گلی کے اندر اور ہر بے در مکان کی اوٹ میں زندگی مخلوط شبیہوں، مبہم علامتوں، کٹی پھٹی مسخ شدہ امیجری اور نہایت بد وضع ہیتوں سے مل کر تخلیق کئے گئے ایک بڑے موزیک سی دکھائی دے رہی تھی وہاں جو کچھ بھی تھا اس کا خوب دیکھا بھالا تھا کہ یہی سب کچھ تو تھا جو اس کے وحشی خیالوں اور بے تکے خیالوں میں ہمہ وقت مضحکہ خیز دہشت کے حامل ناٹک کھیلا کرتا تھا۔

تبھی جانے پہچانے، مخلوط اور بے شکل منظروں سے الجھتے، بچتے، ڈرتے، بھاگتے، اور ہانپتے ہوئے وہ ایک بوڑھی عورت کھڑی کسی کی راہ دیکھ رہی تھی۔ یوں تو وہ مکان حقے کی گڑ گڑ، غصیلی نفرتوں، کٹیلے لفظوں، گالیوں، سسکیوں، اور ایسی ہی ان گنت فراموش کردہ آوازوں سے آباد تھا۔ لیکن شاید اس عورت نے ان آوازوں سے اپنا ناطہ توڑ رکھا تھا کہ وہ اپنے لوکیل سے لا پرواہ اور کٹی ہوئی دکھائی دیتی تھی لگتا تھا کہ وہ کسی کھوئے ہوئے کے خیال میں خود کھوئی گئی ہ۔

اس سفید بالوں اور اجڑے حالوں والی عورت کی چھاتیوں میں، وہ خیال کر سکتا تھا کہ وہ دودھ کب کا ہمک ہمک کر پھٹ چکا تھا جو کبھی نہ پیا گیا تھا اس نے اپنی تلاش کی تکمیل پر رلا دینے ولی اداسی سے بھرے وجود کے ساتھ سنا کہ اس عورت کی پور پور سے ایک اداس نغمگی میں لپٹی لوری پکار بن کر نکل رہی تھی۔

"ماں......"

اس نے اپنے کھوئے ہوئے اور ہچکیاں لیتے وجود کو اس کے عین سامنے لاتے ہوئے آنسوؤں سے بوجھل آواز میں پکارا۔

"ماں......" دیکھو میں آ گیا ہوں............

"میری طرف دیکھو ماں! مجھے پہچانو، یہ میں ہوں تمہارا لاڈلا......

"میں نان جیتے جیتے تھک گیا ہوں ۔آؤ مجھے چھاتی سے لگا کر لوری سناؤ اور تھپک تھپک کر سلا دو۔میں سونا چاہتا ہوں .... ماں؟ ....پلیز!"

اس نے آنسوؤں کی دھند سے پرے دیکھا کہ اس بوڑھی عورت کے چہرے پر پہچان کا کوئی رنگ نہ تھا۔

"تو کیا ماں مر چکی؟" اس نے لرز کر سوچا اور چاہا کہ بڑھ کر ماں کو جھنجھوڑے اور اپنے اور اس کے ہونے کا یقین حاصل کرے۔

اس نے جیسے ہی ماں کو چھوا، تر یک کر کائی میں لپٹی دیوار کے ساتھ جالگا وہ اس کے چھوتے ہی اپنے قدموں میں ریزہ ریزہ بکھر گئی۔

پاگل خانے کا وارڈ جہاں زندگی اپنی مضحک ترین صورتوں میں موجود اپنے ہونے پر شرمندہ سی پتھرائی پڑی تھی وہ برہنہ بدن بیٹھا اپنے وجود سے چمٹی ریت اور کائی کو کھرچے جا رہا تھا اور عالم حیرت میں کسی انجانے خیال کو اپنے ذہن کے بکھراؤ میں سمیٹنے کے جتن کیے جا رہا تھا۔

وہاں مختصر وقفوں میں کہیں قریب سے کوئی شیزوفرینک ہنسی چیختا یا کوئی جنونی قہقہہ بلند ہوتا اور کوئی ڈنڈہ بردار کسی کو ڈانٹتے پھٹکارنے کے فریضے سے فارغ ہو کر اسے گھوری ڈالتا ہوا گذر جاتا تھا لیکن وہ اپنے لوکیل کی وحشت ناکی سے بیگانہ کٹے پھٹے منظروں سے الجھا کوئی انجان خیال سوچتا خود کو کھجلاتا رہا۔

تبھی آسمان پر سیاہ بادلوں کی روشن جھالروں کی اوٹ سے پورن ماشی کا پورا چاند نکل کر عین اس کے سامنے آ گیا۔وہ پورے قدموں کھڑا اس عظیم الشان اور پر ترغیب چاند کو مبہوت سا تکنے لگا پورن ماشی کے اس پورے چاند سے نکلتی مقناطیسی لہریں اس کے لہو کو بلو رہی تھیں۔وہ اس کے اتنا قریب تھا کہ ایک جھپٹے میں اسے اپنے بازوؤں میں بھینچ سکتا تھا تب اس نے سحر زدگی کے دوران غور سے دیکھا کہ وہی بوڑھی عورت وہاں چرخا کاتتے ہوئے ایک اُداس نغمگی کے ساتھ ناگزیر بلاوے بلاتی لوری گنگنا رہی تھی اس نے یہ بھی دیکھا کہ اس بوڑھی عورت کی آنکھیں تکلے میں پروئی ہوئی تھیں اور اس کی چھاتیوں میں بے مصرف دودھ پھٹ چکا تھا۔

وہ ہر بار کی طرح اس بار بھی پورے چاند کے مقابل لوری کی لپیٹ میں لپٹا مسحور سا کھڑا دیکھتا رہا اور سنتا رہا اور پھر یونہی دیکھتے، سنتے ہوئے اس کے بلوتے ہوئے لہو نے یکا یک ایک پاگل خواہش اچھالی۔ اس پر وہ آسمان کی طرف سر اُٹھا کر ایک شیزوفرینک ہنسی چیخا اور چاند کی اور دوڑ لگا دی۔

جب وہ ایک بڑی ہزبونگ کے بعد دوبارہ جکڑا گیا تو وہ اپنی پاگل خواہش کے نشے میں مست لوری کی تال کے ساتھ اپنی شیزوفرینک ہنسی کی تال ملائے جا رہا تھا۔

وہ کھونٹے سے باندھے جاتے وقت بھی اپنے انداز کی خوشی میں بے تحاشہ خوش تھا۔ شاید اسے گیان ہو چکا تھا کہ اب اسے زیادہ دیر اسے لوری کی آغوش میں میٹھی، شانت نیند سونے سے نہیں روکا جا سکتا تھا۔

کہانیاں

اندر سے بھی باہر سے بھی

امین کامل

ترجمہ حیدر جعفری سیّد

امین کامل (محمد امین کام) (سال ولادت 1924) نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز اردو شاعر کی حیثیت سے کیا تھا لیکن 1952ء سے وہ کشمیری زبان کی جانب راغب ہو گئے۔ وہ کشمیری کے نہ صرف ایک ممتاز شاعر، بلکہ ڈرامہ نگار، افسانہ نگار، اوران کے ناول ''گٹھی منز گاش'' کو ریاستی ثقافتی اکادمی، سری نگر کی جانب سے اعزاز کے لئے منتخب کیا گیا تھا۔ ان کی شاعری کے مجموعے کو مرکزی ساھیتہ اکادمی نے اعزاز سے نوازا تھا۔ انہوں نے ٹیگور کے دو ڈراموں کو کشمیری زبان میں منتقل کیا ہے۔

گل جان غیر شادی شدہ تھا۔ وہ ایک چھوٹے سے دو منزلہ مکان میں رہتا تھا جو اس کی ضرورت سے بہت بڑا تھا۔ بالائی کمرہ سونے کے لئے اور نیچے کا کمرہ رہائش اور باورچی خانے کے طور پر۔

اکیلی ذات کے لئے کھانے پکانے کا کوئی زیادہ کام نہیں تھا۔ اس نے ایک بار نیپالی نوکر رکھا جس نے اُسے اس طرح لوٹ لیا کہ بس کیا بتایا جائے۔

کیونکہ وہ اکیلا رہتا تھا اس لئے سارہ اندر آ سکتی تھی۔ لیکن وہ بھی بس علی الصبح ہی ہمت کرتی۔۔ وہ بھی بہت احتیاط سے، لوگوں کی نگاہ سے بچتی بچاتی۔ اس لمحہ تک اس نے اس کی دہلیز پر قدم نہیں رکھا تھا اور دہلیز پار کرنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا اس کی اچانک دلیرانہ

آمد سے گل جان اندیشوں میں مبتلا ہو کر سوچنے لگا" امید ہے کسی نے اُسے اندر آتے ہوئے نہیں دیکھا ہو گا۔ وہ ماں کی دلال در در گھومتی ہے۔ گوبر کا ڈھیر ہے۔ اگر کسی نے دیکھ لیا تو بس مجھ پر قیامت ہی ٹوٹ پڑے گی۔

سارہ خود اعتمادی کے ساتھ اس کے پاس بیٹھ گئی۔ آج وہ گل جان سے حتمی طور پر طے کرنے آئی تھی اور اس کے بولنے کا انتظار کر رہی تھی لیکن جب اس نے ایک لفظ بھی نہیں کہا تو وہ مہر خاموشی توڑنے پر مجبور ہو گئی۔

"تم گونگے کیوں بن گئے۔۔۔کچھ کہو۔۔۔یا تم اپنی زبان اپنے دفتر میں ہی چھوڑ آئے ہو؟ میں یہاں تمہارے گھر کے در و دیوار دیکھنے نہیں آئی ہوں""میں گونگا نہیں ہو گیا ہوں..........." گل جان نے کہا اور اس کی تیوری پر ہلکے بل پڑ گئے" تم بھلا اس وقت یہاں کیوں آئی ہو۔ اگر کسی نے دیکھ لیا ہو..........."

"کیا یہ ہی وجہ ہے؟" سارہ طنزیہ طور پر بڑبڑائی" کیا اسی لئے تمہاری عقل رخصت ہو گئی۔۔کسی نے بھی مجھے آتے ہوئے نہیں دیکھا۔۔۔کم از کم اتنی عقل تو مجھ میں ہے"

گل جان کے ہونٹوں پر جواب کپکپایا اس کا اظہار اُس نے اپنے آپ سے ہی کیا "اوہ" ہاں کیوں نہیں۔۔۔۔دنیا میں بھلا کون ہے جو عقلمندی میں اس کا مقابلہ کرے۔ اس کا ثبوت تو اُس ہی دن مل گیا تھا جب راستے میں پڑوسی نے ہم کو چھیڑا تھا۔۔میں نے غصے میں یہ کوشش کی کہ وہ آگے نکل جائے تا کہ اسے یہ اندازہ نہ ہو کہ ہم ساتھ ساتھ جا رہے تھے لیکن یہود۔ اس کی موٹی عقل یہ بات سمجھ نہ سکی!

"تم کن خیالوں میں گم ہو گئے..................." سارہ نے اُسے چھیڑا" اگر تم اسطرح بات کرو گے تو میں چلی جاؤں گی"

"اس طرح کی بات کس نے کہی؟"

گل جان میں کچھ تبدیلی آ گئی اور اس کا لہجہ ملائم ہو گیا۔ وہ ابھی ابھی کام سے واپس آیا تھا اور رات کا کھانا پکانے کے لئے آلو چھیلنے کی تیاری کر رہا تھا۔

"میں سوچ رہا تھا ....دراصل کوئی خاص بات نہیں...........اُن تمام تجاویز کے بارے میں جو میرے پاس آئی تھیں...........بہت سے رشتے لیکن بھلا مجھے ان سے کیا لینا

دینا۔تم ہی تو میری جان ہو!''

سارہ نے اس سے چاقو لے کر ایک آلو اُٹھایا۔ وہ سوچ رہی تھی ''اُس کی لن ترانیاں تو سنو'' یہ کسے مرغوب کرنے کی کوشش کر رہا ہے میں اس قسم کی بیوقوف نہیں ہوں ....بھلا اس طرح کے مردوں کو کون رشتہ دے گا۔

اس کی بہن ایک نیپالی نوکر کے ساتھ بھاگ گئی......کتیا......جیسے کہ اُسے دنیا میں کوئی اور نہ ملتا۔

گل جان نے اس کے چہرے، آنکھوں، رخساروں، ناک اور ہونٹوں پر ایک بھر پور نگاہ ڈالی۔

اور اسکی آواز ملائم ہو گئی۔''تم مجھے مورد الزام ٹھہرا رہی ہو لیکن تمہارے اپنے خیالات تمہیں کہیں اور لے گئے۔''

''میں بھلا کہاں جاؤں گی'' اس نے غمگین آواز میں کہا'' میں اپنی زندگی میں کتنی خوش تھی .... مطمئن تھی حتیٰ کے تم نے آ کر میرا سکون غارت کر دیا۔ تمہیں ایک دن بھی نہ دیکھوں تو لگتا ہے میرا دل چور چور ہو جائے گا۔''

گل جان ہنسنا چاہتا تھا لیکن اس نے ہنسی روک لی اور اپنے اور اس سے مخاطب ہوا ''میں جانتا ہوں کہ استانی نے ان ہی الفاظ سے کتنوں کو اپنی زلفوں کا اسیر بنانے کی کوشش کی ۔لیکن کوئی بھی اس کا شکار نہیں بنا۔ لیکن سچائی نے اسے راستے سے نہیں بھٹکایا۔''

سارہ نے چاقو نیچے رکھ کر گل جان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا'' میں وہ ہوں جس کی ہر چیز گم ہو گئی ہے۔ اللہ نے تم چرب زبانی سے نوازا ہے۔ کبھی کبھی میں تمہاری سنگدلی اور موٹی کھال کے بارے میں حیران ہوتی ہوں''

''کیا یہ بات ہے؟'' گل جان مسکرایا'' مجھے نہیں معلوم کہ کس نے تمہارے کانوں میں زہر گھولا ہے ان کے بارے میں کیا خیال ہے جو میری خوبیوں پر فریفتہ ہو کر میرے قدموں پر گرنے کے لئے تیار ہو گئے ۔ میں نے ان سب کو مسترد کیوں کر دیا۔ کیونکہ مجھے تم سے محبت تھی''

سارہ نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور اپنے دل میں اس سے کہا'' اوہ ہاں، واقعی! تم اور

تمہاری خوبیاں! تمہاری بہن کے فرار نے تمہیں کس طرح چھپنے پر مجبور کر دیا۔ چار مہینوں کی لمبی چھٹی، تم میں اتنی ڈھٹائی تھی کہ اپنے دفتر میں اپنا منہ دکھا سکو۔ تمہاری ماں کس گمنام سے گاؤں کی ایک گنوار کسان کی عورت تھی جو قصبے میں چلی آئی تھی۔ اللہ جانے کس بھوک کی وجہ سے۔"

""تم مجھ پر اعتماد نہیں کرتی نا! صرف تمہاری وجہ سے میں نے کتنوں کو انکار کر دیا"

""میں اس وجہ سے خاموش نہیں ہوں۔۔۔۔۔" سارہ نے جواب دیا "تمہیں معلوم ہے کہ آج صبح کیا ہوا۔ ہاں میں بھلا تم سے کیوں چھپاؤں؟""

""کیوں، کیا ہوا؟" گل جان پریشان تھا۔ اس جنجال میں پھنسنے سے خوفزدہ تھا" تم خوفزدہ کیوں ہو؟ ایسی کوئی بات نہیں" سارہ نے اطمینان دلایا۔ "میں نے اشاروں ہی اشاروں میں اپنی ماں کو تمہارے بارے میں بتایا۔ لیکن وہ بہت عقلمند ہیں۔ وہ فوراً سمجھ گئیں کہ کیا معاملہ ہے۔ انہیں اس کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔ تمہاری متقی والدہ سے ان کی بہت خوشگوار تعلقات تھے۔ دراصل انہوں نے مجھ سے صاف صاف کہا "بیٹی وہ گل جان ہے تو میری مکمل رضامندی تمہارے ساتھ ہے""

گل جان نے اپنے میں اس سے کہا "میں یقینی طور تمہاری ماں کے لئے بھی ایک اچھا شکار ثابت ہوں گا۔ آہ! آج تج اس کی کتنی منگنیاں ٹوٹ چکی ہیں۔ کیا اس قسم کی کہانی راز رہ سکتی ہے۔ وہ حرافہ کب سے اس دن کا انتظار کر رہی ہوگی کہ بیٹی کو میرے دامن سے باندھ دے اور گھوڑے بیچ کر سوئے۔"

سارہ نے اسے ہولے دے دھکا دیا تو گل جان گھبرا گیا اور پھر وہ دل کھول کر ہنسنے لگا "کیا میں دیواروں سے ہم کلام ہوں۔ تم کہاں کھو گئے؟"

""تم نے میری ماں کا ذکر کیا............ وہ تو پہلے ہی دن سے تم پر فدا تھیں" گل جان نے کہا "ہم دونوں کے ہم عمر ہونے کے وجہ سے انہیں یقین ہو گیا تھا کہ ہماری جوڑی خوب جمے گی............ غٹرغوں کرتے کبوتروں کی جوڑی" اس بات سے سارہ نے غصے میں آ کر اپنے ہونٹ کاٹ لئے، یہ بوڑھا بیل اب بھی اپنے آپ کو نوجوان سمجھ رہا ہے۔ کیا میں اس کی عمر کی ہوں۔۔۔ بڈھا کہیں کا...... وہ مجھ سے کم از کم آٹھ سال بڑا ہوگا یا اس سے بھی زیادہ" "میں

سوچتا ہوں۔۔۔۔۔گل جان نے اپنی بات کی مزید وضاحت کی'' میری والدہ کی پسند ہی ہم دونوں کوایک دوسرے کے قریب لے آئی ہے۔''

''ہاں ضرور وہ متقی خاتون جب بھی مجھے دیکھتیں تو ان کا دل خوشی سے باغ باغ ہو جاتا۔۔۔۔'' سارہ نے اپنے جسم کو ذرا سی جنبش دی'' کیا کوئی سمجھتا نہیں ہے۔ وہ مجھے پکڑ کر میری بھنوؤں کے کم از کم آدھا درجن بوسے لیتیں''

گل جان اس بات پر آگ بگولہ ہو گیا اور وہ اپنے دل ہی دل میں چیخا'' میری والدہ۔۔۔ اور اسے چومیں گی۔ وہ یہی دن ہمیشہ گنگناتی تھیں ۔۔۔۔۔۔ جاناں میں تمہیں آگاہ کرتی ہوں ۔۔۔۔اس سانپ کو اپنے راستے نہ کاٹنے دینا کیا کوئی ایسا ہے کہ جس کے ساتھ اس کا نام وابستہ نہیں رہا۔ کتنا نام ہے اس کا میں ان کی وفات پر کس قدر مغموم ہوئی تھی'' سارہ کی آواز گلوگیر ہونے لگی'' کاش یہ میری قسمت میں ہوتی''

''یہ کیسے ممکن ہے کہ تم ان کا غم نہ کرو'' گل جان نے اُسے تسلّی دینے کے لئے اس کے شانوں کو اپنے بازوؤں کے گھیرے میں لے لیا'' بیوقوف لڑکی! کیا انہوں نے تمام لڑکیوں میں سے تمہارا انتخاب نہیں کیا تھا صرف انہوں نے نہیں بلکہ میرے والد بزرگوار نے بھی۔ بس یہ کہ وہ کچھ زیادہ بر باد تھے۔۔۔ بہت گہرے۔۔۔۔۔۔اپنے جذبات کا اظہار نہ ہونے دیتے تھے''

سارہ ایکدم پھٹ پڑی، بزرگوار؟ کیا وہ بزرگ تھے۔ اللہ رحم کرے! وہ چور چوہا کھتری کی دوکان پر خاکروب تھا، چائے اور چینی کی بوریوں میں سوراخ کر دیتا تھا۔اس نے اس غریب آدمی کا مال کس طرح پار کیا اپنے والد کی حرام کمائی پر پھل پھول کر کسی طرح ہیڈ کلرک کی ملازمت حاصل کی جبکہ اس کے پاس اس کی لیاقت بھی نہ تھی۔ وہ وہاں اس پر پگھلا ہوا سیسہ ڈال رہے ہوں گے۔

''میرا خیال ہے کہ انہوں نے اپنے دل کی بات ماں سے کہی ہوگی'' گل جان نے اپنی بات کی تشریح کی'' اسی لئے میری والدہ تمہیں ذوق شوق سے دیکھا کرتی تھیں''

''میرا خیال ہے کہ انہوں نے اپنے دل کی بات ماں سے کہی ہوگی'' گل جان نے اپنی بات کی تشریح کی'' اسی لئے میری والدہ تمہیں ذوق شوق سے دیکھا کرتی تھیں''

''وہ کتنی عیاری سے اپنی بات کہے جا رہا ہے۔کیا وہ ان معاملوں میں مجھے بالکل اناڑی سمجھ رہا ہے، سارہ نے اپنا سر جھٹکا'' جیسے کہ میں تمہارے والد کونہیں جانتی! وہ کتنے شفیق تھے۔اللہ ان کی قبر کونور سے بھردے۔ وہ ہر ملنے والے کو کتنی گرم جوشی سے سلام کرتے۔ خواہ وہ اعلیٰ ہو یا ادنیٰ۔''

گل جان غصے میں تھا شیطان اس بدمعاش لڑکی کو اڑا لے جائے۔میں نے صرف ایک لفظ کہا اور اس نے اسے بھی نہیں چھوڑا۔ بے دماغ مخلوق۔میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ اسکول میں کیا پڑھاتی ہو گی صرف اپنی خالی کھوپڑی اور کچھ بھی نہیں میں اس سے پوچھ سکتا ہوں کہ کتنی عمر کی تھی جب ان کا انتقال ہوا شائد پاؤں چلنے والا بچہ۔میرا خیال ہے لیکن وہ اس معاملے میں اپنے والد کی پیروی کرتی ہے ۔ وہ نکما آدمی کچھ بھی نہیں کرتا تھا علاوہ دفتر میں دوسروں کی سگرٹیں پینے اور گپیں مارنے کے ۔۔۔۔ یا پھر بکواس کرتا رہتا تھا۔مسخرہ اس کے دفتر کے ساتھیوں کو اس کی کہانی سننے میں کتنا مزہ آتا تھا۔

''میں اب جا رہی ہوں'' ۔۔۔۔ورنہ مجھے اب دیر ہو جائے گی'' سارہ نے کھڑکی پر نظر ڈالی'' ڈرنا نہیں ۔۔۔۔ میں چلی جاؤں گی اور کوئی مجھے جاتے ہوئے دیکھ نہ سکے گا''

''ٹھیک ہے ۔ جاؤ لیکن پہلے ایک بات بتاؤ۔۔۔۔۔تم کبھی پہلے کیوں نہیں آئیں۔آج یہ کیسے ہو گیا میں تم سے ایک سیدھا سوال پوچھ رہا ہوں میرے لئے اس کا جواب سچائی سے دو''

سارہ نے اسے معنی خیز نگاہوں سے بچ کر سڑکوں پر کب تک ملتے رہیں گے اس سے بھلا نہ ہوگا میں تم سے کہہ رہی ہوں کہ حتمی فیصلہ کرلو۔تمہارا کیا ارادہ ہے؟''

''کس بارے میں؟'' گل جان نے سارہ کو اپنی طرف کھینچا'' احمق لڑکی'' شادی اگلے مہینے ہوگی۔تمہارے علاوہ بھلا میرا کون ہے؟''

اور اس طرح ایک مہینے کی مدت میں دو انسان ایک ہو گئے۔۔۔۔اندر سے بھی باہر سے بھی۔

امریکہ کا کوئی وجود نہیں

پیٹر بخسل

ترجمہ: منیر الدین احمد

میں نے یہ کہانی ایک آدمی سے سنی ہے جو پیشہ ور قصے سنانے والا ہے میں نے اسے کئی بار کہا ہے کہ میں اسکی کہانی کو نہیں مانتا۔
''آپ جھوٹ بولتے ہیں'' میں نے کہا'' آپ دھوکہ بازی کرتے ہیں۔ آپ بڑ ہانکتے ہیں۔ آپ الو بناتے ہیں''
اس بات سے وہ ذرابرابر مرعوب نہ ہوا۔ وہ اطمینان سے کہانی سناتا رہا اور جب میں نے للکار کر کہا'' جھوٹے، دغاباز، بڑمار، دھوکہ باز'' تو اس نے نظر اُٹھا کر کے میری طرف دیکھا سر کو ہلایا اور مسکرایا ایک اُداس مسکراہٹ پھر اس قدر دھیمے سے کہا کہ میں شرما سا گیا
''امریکہ کا کوئی وجود نہیں''
میں نے اس کا دل رکھنے کی خاطر اس کی کہانی کو لکھنے کا وعدہ کیا۔
اس کی ابتداء پانچ سو برس ادھر ایک بادشاہ کے دربار میں ہوتی ہے سپین کے بادشاہ کے ہاں، محل ابریشم اور مخمل، سونا چاندی، ڈاڑھیاں، تاج، شمعیں، نوکر چاکر اور لونڈیاں، درباری جو منہ اندھیرے ایک دوسرے کے پیٹوں میں چھُرے گھونپتے تھے وہی جنہوں نے اس سے پہلی شام ایک دوسرے کو چیلنج کیا ہوتا تھا۔ میناروں پر بگل بجانے والے محافظ، ایلچی جو گھوڑوں پر سے چھلانگ لگا کر اُترتے ہیں اور ایلچی جو جست لگا کر کاٹھیوں پر جم جاتے ہیں۔ بادشاہ کے خیر خواہ دوست اور بناوٹی یار۔ عورتیں خوبصورت اور فاتن، شراب اور محل کے گردا

گرد عوام جنہیں سوائے اس کر و فر کی قیمت ادا کرنے کے اور کوئی بات نہ سوجھتی تھی۔

مگر بادشاہ کو بھی اور کوئی بات نہ سوجھتی تھی سوائے اس طرح کی زندگی بسر کرنے کے اور انسان چاہے کیسی ہی زندگی کیوں نہ بسر کرے عیاشی کی یا غربت کی ، میڈرڈ میں ، بارسلونا میں یا کسی اور جگہ بلا آخر روز روز کا معمول ایک سا ہوتا ہے اور انسان کا دل اُچاٹ ہونے لگتا ہے اس لئے لوگ جہاں کہیں بھی وہ رہتے ہیں بارسلونا کا خوبصورت ہونا تصور کرنے لگتے ہیں اور بارسلونا کے باسی کسی دوسرے مقام کی طرف سدھارنے کے خواہشمند ہوتے ہیں۔

غریب لوگ بادشاہوں کی طرح زندگی بسر کرنے کو خوبصورت تصور کرتے ہیں اور انہیں یہ بات بھتی ہے کہ بادشاہ سمجھتا ہے کہ غریب لوگوں کیلئے غربت ہی مناسب حال ہے۔

صبح دم بادشاہ بیدار ہوتا ہے۔ شام کے وقت بادشاہ استراحت کرتا ہے اور دن بھر وہ بور ہوتا رہتا ہے اپنے مسائل کی بدولت اپنے نوکروں ، اپنے سونے چاندی ، مخمل ، اپنے ابریشم ، اپنی شمعوں کی وجہ سے اس کا پلنگ ٹھاٹھ باٹھ والا ہے مگر انسان اس میں بھی سوائے سونے کے اور کچھ نہیں کرسکتا۔

نوکر چاکر سویرے جھک کر کورنش بجالاتے ہیں۔ ہر صبح ایک جتنی کمر خمیدہ کرکے بادشاہ اس کا عادی ہو چکا ہے اور وہ ایک نظر تک اُٹھا کر نہیں تکتا۔ کوئی شخص اس کو کانٹا پکڑاتا ہے کوئی اسے چھڑی دیتا ہے۔ کوئی اس کی کرسی دُرست کرتا ہے اور لوگ جو اس سے بات کرتے ہیں کہتے ہیں بادشاہ سلامت اور دوسرے بہت سے خوبصورت الفاظ اور بس۔

کوئی اسے نہیں کہتا "ارے بدھوارے گاودی" اور جو کچھ وہ اسے آج کہتے ہیں وہ اسے کل کہہ چکے ہوتے ہیں۔

بس یہ حال ہے۔

اس وجہ سے بادشاہ درباری مسخرے رکھتے ہیں۔ انہیں کھلی چھٹی دیتے ہیں۔ بادشاہ کو ہنسانے کے لیے جو چاہیں کرنے کی اور کہنے کی جو ان کے دل میں آئے۔ اور جب اس کو ان کی باتوں پر ہنسی نہیں آتی تو وہ انہیں مروا دیتا ہے۔ وغیرہ

اس طرح اس کا ایک زمانے میں ایک مسخرہ تھا جو لفظوں میں ردّ و بدل کرتا تھا بادشاہ

کو بات بھاتی تھی۔سات جولائی کے دن تک جب وہ آٹھ تاریخ کو بیدار ہوا اور مسخرہ آیا اور اس نے کہا "صبح بخیر بادشاہ سلامت" تو بادشاہ نے کہا میری جان چھڑاؤ اس مسخرے سے"

ایک دوسرا مسخرہ ٹھگنا اور موٹا جس کا نام پیپے تھا، بادشاہ کو صرف چار روز تک پسند آیا۔ وہ بادشاہ کو اسطرح ہنساتا تھا کہ وہ عورتوں اور مردوں، راجوں، نوابوں، خان بہادروں اور جرنیلوں کی کرسیوں پر شہد لگا دیتا۔ چوتھے روز اس نے بادشاہ کی کرسی پر شہد لگا دیا اور بادشاہ کو ہنسی نہ آئی اور پیپے کی مسخرے پن سے چھٹی ہو گئی۔

اب بادشاہ نے دنیا بھر کے بدترین مسخرے کو خریدا۔ وہ بدشکل تھا بیک وقت دُبلا اور موٹا، لمبا اور ٹھگنا اور اس کی ایک ٹانگ ٹیڑھی تھی کسی کو علم نہیں تھا کہ آیا اسے بولنا آتا تھا اور وہ جان بوجھ کے نہیں بولتا تھا یا یہ کہ وہ گونگا تھا اس کی نظر فاسدانہ تھی اس کا چہرہ مرجھایا ہوا۔ صرف ایک اچھی چیز اس میں پائی جاتی تھی اور اس کا نام تھا میاں مٹھو۔

سب سے زیادہ وحشت ناک اس کی ہنسی تھی وہ شروع ہوتی ہلکی آواز میں کانچ کے بجنے کی طرح پیٹ کی گہرائیوں میں سے۔ غرغراتی ہوئی اوپر کو چڑھتی، آہستہ آہستہ ڈکار میں بدل جاتی اور میاں مٹھو کے سر کو لال بھبوکا بنا دیتی۔ اس کا سانس قریب قریب رُک جاتا۔ یہاں تک کے وہ دھماکے سے جیسے پھٹ جاتا۔ گڑگڑاتا، چیخ مارتا، پھر پاؤں کو زمین پر دے مارتا، ناچتا، اور ہنستا تھا صرف بادشاہ اس پر خوش تھا دوسرے زرد پڑ جاتے، کانپتے اور ڈرنے لگتے۔ اور جب محل کے گردونواع کے لوگ ہنسی کو سنتے تھے تو وہ دروازے اور کھڑکیاں بند کر لیتے تھے۔ بلکہ کھڑکیوں کے حفاظتی کواڑ بھی بھیڑ لیتے تھے۔ بچوں کو بستر میں گھسیڑ دیتے اور اپنے کانوں میں موم ڈال لیتے تھے۔

میاں مٹھو کی ہنسی تمام چیزوں سے جو پائی جاتی ہیں بڑھ کر ہولناک تھی۔

بادشاہ خواہ کچھ ہی کیوں نہ کہتا تھا۔ میاں مٹھو ہنستا تھا۔

بادشاہ ایسی باتیں بھی کہتا تھا جن پر کوئی شخص نہیں ہنس سکتا۔ مگر میاں مٹھو ہنستا تھا۔ پھر ایک روز بادشاہ نے کہا "میاں مٹھو میں پھانسی کی سزا دیتا ہوں"

اس پر میاں مٹھو ہنسنے لگا۔ بالکل پھٹ پڑا اور ایسا ہنسا جیسا وہ کبھی نہ ہنسا تھا۔

تب بادشاہ نے فیصلہ کیا کہ میاں مٹھو کو صبح سویرے پھانسی پر لٹکایا جائے اس نے

پھانسی کو چوکھٹا بنوایا وہ اپنے فیصلے کے بارے میں سنجیدہ تھا وہ میاں مٹھو کو پھانسی کے چوکھٹے کے سامنے ہنستا دیکھنا چاہتا تھا اس نے سب لوگوں کو اس وحشیانہ تماشے کو دیکھنے کا حکم دیا۔ مگر لوگ چھپ گئے۔ انہوں نے اپنے دروازوں کی کنڈیاں لگا دیں۔ صبح کے وقت بادشاہ جلاد اور نوکر چاکروں سمیت اور ہنستے ہوئے میاں مٹھو سمیت اکیلا کھڑا تھا۔

اس نے اپنے نوکروں کو ڈانٹ کر کہا: لوگوں کو میرے حضور لے کر آؤ" نوکروں نے سارا شہر چھان مارا اور انہیں کوئی نہ ملا۔ بادشاہ غصے سے پھول رہا تھا اور میاں مٹھو ہنستا جا رہا تھا۔

بلا آخر نوکروں کو ایک چھوکرا ہاتھ لگا۔ وہ اسے کھینچ کر بادشاہ کے پاس لے گئے چھوکرہ ٹھگنا سا تھا زرد اور شرمیلا۔ بادشاہ نے پھانسی کے چوکھٹے کی طرف اشارہ کیا اور اسے دیکھنے کا حکم دیا۔

چھوکرے نے پھانسی کے چوکھٹے کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ اور مسکرا نے لگا ہاتھ پر ہاتھ مارا کچھ ٹھٹکا اور کہنے لگا۔ آپ یقیناً ایک نیک دل بادشاہ ہیں کیونکہ آپ نے کبوتروں کے لئے ایک مچان بنا دی ہے دیکھیں تو سہی دو کبوتر اس پر آن بیٹھے ہیں"

"تم بدھو ہو" بادشاہ نے کہا" کیا نام ہے تمہارا؟"

"میں بدھو ہوں۔ بادشاہ صاحب اور میرا نام کولبو، میری ماں مجھے کولمبین کہہ کر پکارتی ہے"

"ارے بدھو" بادشاہ نے کہا یہاں پر ایک شخص کو پھانسی پر لٹکایا جائے گا"

"کیا نام ہے اُس کا؟" کولمبین نے پوچھا اور جب اس کا نام سنا تو کہنے لگا" خوبصورت نام۔ اچھا تو میاں مٹھو کہتے ہیں اس کو بھلا ایسے خوبصورت نام والے انسان کو کیسے پھانسی پر لٹکایا جا سکتا ہے؟"

"اس کی ہنسی بہت ہولناک ہے" بادشاہ نے کہا اور اس نے میاں مٹھو کو ہنسنے کا حکم دیا اور میاں مٹھو پہلے روز سے دوگنا ہولناک آواز سے ہنسا"

کولمبین کو حیرت ہوئی۔ تب اس نے کہا: بادشاہ صاحب کیا آپ اس کو ہولناک ہنسی سمجھتے ہیں؟" بادشاہ حیرت کے مارے کوئی جواب نہ دے پایا پھر کولمبین نے آگے کہا"

مجھے اس کی ہنسی کچھ ایسی پسند نہیں آئی ہے مگر کبوتر آب بھی پھانسی کے چوکھٹے پر بیٹھے ہیں
۔اس نے انہیں بالکل خوفزدہ نہیں کیا۔انہیں اس کی ہنسی کچھ ایسی ہولناک نہیں لگتی۔کبوتروں کی
حس سماع بہت تیز ہوتی ہے۔میاں مٹھو کی جان بخشی کر دینی چاہیے۔
بادشاہ نے کچھ دیر سوچا اور پھر کہا: ''میاں مٹھو جاؤ تم بھاڑ میں''
اور میاں مٹھو نے پہلی بار ایک لفظ کہا اس نے کولمبین سے کہا ''شکریہ'' اور مسکرایا اور
ایک خوبصورت انسانی آواز ہنسا اور چلا گیا۔
بادشاہ کے پاس اب کوئی مسخرہ نہیں تھا۔
''میرے ساتھ آؤ'' اس نے کولمبین سے کہا۔
بادشاہ کے نوکر چاکر اور لونڈیاں ، نواب ، اور باقی کے سب لوگوں نے سمجھا کہ
کولمبین نیا درباری مسخرہ تھا۔
مگر کولمبین ذرہ بھر ہنس مکھ نہ تھا۔ وہ بس کھڑا رہتا اور حیران ہوا کرتا تھا۔ بہت کم
بولتا اور ہنستا بالکل نہیں تھا وہ محض مسکراتا تھا اور کسی دوسرے آدمی کو تو بالکل نہیں ہنساتا تھا۔
''یہ شخص مسخرہ نہیں تھا۔ یہ تو بدھو ہے'' لوگ کہتے ہیں اور کولمبین جواب دیتا تھا''
میں مسخرہ نہیں ہوں میں بدھو ہوں''
اور لوگ اس کا مذاق اُڑاتے تھے۔
اس بات کا پتہ اگر بادشاہ کو چل جاتا تو وہ ناراض ہو جاتا ۔مگر کولمبین اسے بتاتا ہی
نہیں تھا۔اس وجہ سے کہ اسے اس بات کی پرواہ نہ تھی کہ اس کا مذاق اُڑایا جائے۔
دربار میں طاقت ور لوگ ہوتے تھے اور عقلمند بادشاہ بادشاہ تھا۔عورتیں خوبصورت
تھیں اور مرجیدار، پادری خدا ترس تھا اور باورچن محنت کش ،صرف کولمبین ۔کولمبین کچھ بھی نہ تھا۔
اگر کوئی شخص کہتا تھا: ''کیا تم ندی میں چھلانگنے کی ہمت رکھتے ہو؟ تو کولمبین کہتا
''نہیں میں اس کی ہمت نہیں رکھتا۔
اور اگر بادشاہ پوچھتا تھا'' کولمبین تو کیا بننا چاہتے ہو تو '' کولمبین جواب دیتا'' میں
کچھ نہیں بننا چاہتا میں کولمبین ہوں۔
بادشاہ نے کہا'' تمہیں ضرور کچھ بننا چاہیے'' اور کولمبین نے پوچھا'' انسان کیا بن سکتا

ہے"

بادشاہ نے کہا" وہ داڑھی والا شخص، بھورے چمڑے جیسی شکل والا۔ وہ ملاح ہے۔ وہ ملاح بننا چاہتا تھا اور ملاح بن گیا ہے۔ وہ سمندروں کو پار کرتا ہے اور اپنے بادشاہ کے لئے سرزمین دریافت کرتا ہے"

"اگر تم چاہتے ہو میرے بادشاہ" کومبین نے کہا" تو میں ملاح بنوں گا"

اس پر سارے دربار کو ہنسی آ گئی۔

اور کومبین بھاگ نکلا چلاتا ہوا دربار سے باہر" میں ایک سرزمین دریافت کروں گا میں ایک سرزمیں دریافت کروں گا"

لوگوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور سر ہلانے لگے۔ کومبین محل سے نکلا اور شہر میں سے گزرا، کھیتوں میں سے، کسانوں کو، جو کھیتوں میں کھڑے تھے اور اس کی طرف دیکھ رہے تھے اس نے چلا کر کہا" میں ایک سرزمیں دریافت کروں گا۔ میں ایک سرزمیں دریافت کروں گا"

وہ ایک جنگل میں پہنچا اور ہفتوں تک جھاڑیوں کے پیچھے چھپا رہا اور ہفتوں تک کسی نے اس کی بابت کچھ نہ سنا اور بادشاہ اُداس ہو گیا اور اپنی آپ کو ملامت کرنے لگا اور درباری شرمندہ ہوئے کیوں کہ انہوں نے کومبین کا مذاق اُڑایا تھا۔

انہوں نے کہیں جا کر اطمینان کا سانس لیا جب ہفتوں کے بعد حفاظتی مینار کے محافظ نے بگل بجایا اور کومبین نے ایک سرزمین دریافت کر لی ہے" اور درباری چونکہ اس کا مذاق نہ اُڑانا چاہتے تھے اس لئے انہوں نے رنجیدہ چہرے بنائے رکھے اور پوچھا" کیا نام ہے اس اور وہ کہاں واقع ہے؟"

"اس کا ابھی کوئی نام نہیں ہے کیونکہ میں اسے ابھی دریافت کیا ہے۔ اور پائی جاتی ہے وہ باہر سمندر کے بیچوں بیچ۔" کومبین نے جواب دیا۔

"اس وہ داڑھی والا ملاح اُٹھا اور کہنے لگا: خوب کومبین میں آمیر یگو ویسپوچی اس سرزمین کی تلاش میں جاتا ہوں مجھے بتاؤ کہ وہ کہاں پر واقع ہے؟"

"آپ سمندر کا رخ کرتے ہیں اور پھر سیدھے جاتے اور آپ کو کشتی رانی کرنی ہوگی

اُس وقت تک جب تک آپ اس سرزمین کو دریافت نہ کرلیں۔ آپ کو ہمت نہ ہارنی چاہیے۔"

کولمبین نے کہا اور اسے سخت ڈر لگ رہا تھا کیونکہ وہ جھوٹا تھا اور اسے معلوم تھا کہ اس سرزمین کا وجود نہیں پایا جاتا۔ اور اس کی نیند جاتی رہی۔

مگر آمیریگو ویسپوچی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔

کسی کو علم نہیں تھا کہ وہ کسی طرف گیا تھا۔

شائد وہ جنگل میں چھپا رہا۔

پھر بگل بجے اور آمیریگو واپس لوٹا۔

کولمبین کا چہرہ لال سرخ تھا۔ وہ اپنے اندر مشہور ملاح کی طرف دیکھنے کی ہمت نہ پاتا تھا۔ ویسپوچی بادشاہ کے سامنے ایستادہ ہوا۔ اس نے لمبا سانس لیا۔ کولمبین کو آنکھ ماری اور اونچی اور قابل فہم آواز میں کہا۔ اسطرہ کہ سب اسے سن سکتے تھے۔ "میرے بادشاہ" کہا اس نے میرے بادشاہ۔ وہ سرزمین پائی جاتی ہے"

کولمبین جو بہت خوش تھا کہ ویسپوچی نے اس کا بھید نہ کھولا تھا اس کی طرف بھاگ کے گیا اس سے مصافحہ کیا اور پکارا "آمیریگو میرے پیارے آمیریگو"

اور لوگوں نے سمجھا کہ یہ اس سرزمین کا نام تھا اور انہوں نے اس سرزمین کو جس کا وجود نہیں پایا جاتا "امریکہ" کا نام دے دیا۔

اب تم ایک پورے مرد ہو" بادشاہ نے کولمبین سے کہا "آج سے تمہارا نام کولمبس ہو گا"

اور کولمبس مشہور ہو گیا اور سب لوگ اس کی عزت کرنے لگے اور آپس میں سر گوشیاں کرتے "اس نے امریکہ دریافت کیا ہے"

اور سب لوگ سمجھتے تھے کہ امریکہ کا وجود پایا جاتا ہے۔ صرف کولمبس کو یقین نہ تھا۔ عمر بھر اسے اس بارے میں شک رہا۔ مگر اسے ہمت نہ ہوئی اصل حقیقت کے بارے میں پوچھنے کی۔

جلد بعد دوسرے لوگ امریکہ کی طرف روانہ ہوئے۔ پھر بے شمار لوگ اور جو لوگ واپس لوٹے وہ کہتے تھے "امریکہ پایا جاتا ہے"

''میں'' اُس شخص نے کہا جس سے میں نے یہ کہانی سُنی ہے ''میں کبھی امریکہ نہیں گیا ہوں۔ مجھے علم نہیں ہے کہ آیا امریکہ پایا جاتا ہے۔ شائد لوگ یونہی کہہ دیتے ہیں کولمبس کا دل رکھنے کی خاطر۔ اور جب دو آدمی ایک دوسرے سے امریکہ کی باتیں کرتے ہیں تو وہ اب بھی ایک دوسرے کو آنکھ مارتے ہیں۔ امریکہ وہ شائد ہی کبھی کہتے ہیں۔ اکثر مبہم طور پر کہتے ہیں ''سٹیٹس'' یا ''سمندر پار'' وغیرہ۔

شائد جو لوگ امریکہ جانا چاہتے ہیں. ہوائی جہاز میں یا بحری جہاز میں کولمبین کی کہانی سنائی جاتی ہے اور پھر وہ کہیں چھپ جاتے ہیں اور بعد میں واپس لوٹتے ہیں اور کاؤ بوائیز، آسمان سے باتیں کرتی ہوئی عمارتوں، آبشار نیاگرا، میسی سپی، نیویارک، اور سان فرانسکو کی باتیں سناتے ہیں۔

بہر صورت سبھی ایک سی باتیں سناتے ہیں اور سبھی وہی کچھ سناتے ہیں جو انہیں سفر سے قبل معلوم تھا اور یہ بات بہت مشکوک ہے۔

لوگ اب تک اس بارے میں آپس میں جھگڑ رہے ہیں کہ کولمبس کون تھا؟

مجھے اس کی حقیقت کا علم ہے۔

ایک موضوع کئی انداز

ایڈافنک
ترجمہ: امجد طفیل

''ایڈافنک پولینڈ میں ۱۹۲۱ء میں پیدا ہوئیں اس نے موسیقی کی تعلیم حاصل کی۔ پولینڈ پر نازی جرمنی کے قبضے کے بعد وہ ۱۹۴۲ء تک وہاں رہی پھر اُس نے روپوشی اختیار کر لی اور جنگ کے خاتمے تک پوشیدہ رہی ۱۹۵۷ء میں وہ اپنے شوہر اور بیٹی کے ساتھ اسرائیل ہجرت کر آئی۔ جہاں وہ اب بھی مقیم ہے۔ ایڈا فنک کو ''نیویارک ٹائمز'' نے اُن لکھنے والوں میں شمار کیا ہے جنہوں نے لوگوں کی توجہ ان گنت مرنے والوں کی طرف دلائی۔

ایڈا فنک کے افسانوں کا مجموعہ (A Scrap of Time (1987)اور ناول The Journey(1992) شائع ہو چکے ہیں۔ اپنے افسانوی مجموعے پر وہ 1995ء میں Anne Frank Prize برائے ادب حاصل کر چکی ہے۔ اُس کے کام کا دنیا کی گیارہ زبانوں میں (اُردو کے علاوہ) ترجمہ ہو چکا ہے 1995 میں ہی اُسے Yad Vashem Prize دیا گیا جو ہالوکاسٹ کے حوالے سے فکشن پر دیا جانے والا سب سے اہم ایوارڈ ہے۔

زیرِ نظر کہانی اُس کے دوسرے مجموعے (Trace 1997) سے ہی لی گئی ہے اس مختصر کہانی میں انسان کی بے بسی اور لاچاری کو موضوع بنایا گیا ہے اگرچہ اس کہانی کا مواد نازی جرمنی کے یہودیوں پر مظالم سے تیار کیا گیا ہے لیکن یہ آج

کے حالات میں فلسطینیوں پر یہودیوں کے مظالم کی بھی ہو بہو وضاحت کرتی ہے۔"

(1)

وہ کیمپ سے رہائی پا چکا تھا اور اُس گیٹ کو پار کر چکا تھا جس پر البرٹ میکٹ فیری تحریر تھا وہ اپنے وجود میں ایسی مسرت محسوس کر رہا تھا جس سے وہ اب تک ناواقف رہا تھا۔

گیٹ سے باہر کچی پکی سڑک دور تک پھیلی تھی ۔حد نگاہ تک سنسان اور سیدھی سڑک ۔اُس نے سنسان اسفالٹ بچھی سڑک پر آہستہ خرامی روشنی کے ساتھ چلنا شروع کیا ۔زرد آسمان پر زرد سورج چمک رہا تھا۔

اچانک کافی دور اُسے ایک شخص اپنی طرف دوڑتا نظر آیا شروع میں وہ بالکل نہ پہچان سکا کہ وہ کون ہے جب دونوں کے درمیان فاصلہ کافی کم ہو گیا تب ہی اُس نے جانا کہ وہ لڑکی اُس کی محبوبہ ہے وہ اسے ملنے کے لئے بھاگ رہی تھی اُس کے بال فضا میں لہرا رہے تھے۔

کچھ ہی دیر میں لرزتے اور مسکراتے ہوئے اُس کے بازوؤں میں سما گئی "کیا تمہارے پاس ایک سگریٹ ہے" اُس نے دوڑنے سے بے ترتیب ہونے والی سانسوں کے دوران پوچھا۔ وہ منجمند ہو گیا اُسے یاد آیا کہ وہ اپنے سگریٹ کیمپ میں لٹکتے کوٹ میں چھوڑ آیا ہے اور وہ خوب جانتا تھا کہ جس لڑکی سے وہ محبت کرتا ہے اُس کی خواہش کو پورا کرنے کے لئے اُسے واپس جانا پڑے گا اور وہ گیا

(2)

وہ کیمپ سے رہائی پا چکا تھا اور اُس گیٹ کو پار کر چکا تھا جس پر البرٹ میکٹ فیری تحریر تھا وہ اپنے وجود میں ایسی مسرت محسوس کر رہا تھا جس سے وہ اب تک ناواقف تھا۔

گیٹ سے باہر تازہ اُگا جنگل تھا اُس نے سنسان اسفالٹ بچھی سڑک پر روشنی کے ساتھ چلنا شروع کیا۔ وہ درختوں، جھاڑیوں اور گھانس پھونس کے پاس سے گزرا جبکہ چاندکی دودھیاں روشنی اُس کے راستے میں بچھی تھی۔

اچانک اُس نے اوپر دیکھا اور اُس نے محسوس کیا کہ اُس کے سر پر بچھا آسمان چاند سے تہی اور سیاہ ہے اور وہ سمجھ گیا کہ جس روشنی میں وہ نہایا ہوا ہے وہ محافظوں کے مینار سے اُس پر پڑ رہی ہے یہ روشنی اُس کا پیچھا کر رہی ہے اور اب اُس تک پہنچ چکی ہے۔ وہ سمجھ گیا کہ اُسے واپس کیمپ میں جانا ہوگا اور اُس نے ویسا ہی کیا۔

(3)

وہ کیمپ سے رہائی پا چکا تھا اور اُس گیٹ کو پار کر چکا تھا جس پر البرٹ میکٹ فیری تحریر تھا وہ اپنے وجود میں ایسی مسرت محسوس کر رہا تھا جس سے وہ اب تک ناواقف تھا۔

گیٹ سے آگے کچی پکی سڑک پھیلی تھی سڑک تا حدِ نظر تک سنسان اور ہموار تھی اُس نے سنسان اسالٹ بچھی سڑک پر روشنی کے ساتھ چلنا شروع کیا۔ زرد آسمان پر زرد سورج چمک رہا تھا وہ چلتا رہا اور اُس نے وقت کی ساری پہچان کھو دی۔ اچانک اُس نے دیکھا کہ ایک رکاوٹ نے سڑک روک رکھی ہے۔ ایک سفید سائن بورڈ پر تیر کے نشان سے راستے کی نشاندہی کی گئی تھی۔ اُس نے فرمابرداری سے تیر کی نشاندہی پر چلا وہ آہستہ خرابی سے سنسان اور کچی پکی سڑک پر چلتا رہا جو اُس سڑک سے ہوبہو مشابہ تھی جس کو اُس نے چھوڑا تھا وہ چلتا رہا اور اُس نے وقت کا احساس گم کر دیا اُسے پھر سڑک پر ایک رکاوٹ دکھائی دی وہ رکا اور اُس نے اپنے اردگرد نگاہ ڈالی۔ کچھ بھی نہیں، ویرانی، زرد آسمان، میں زرد سورج، اُس نے اُس جانب چلنا شروع کیا جدھر تیر اشارہ کر رہا تھا۔ وہ چلتا رہا اور اُس وقت کا احساس گم کر دیا کہ اُسے اپنے سامنے گیٹ نظر آیا۔ جس پر البرٹ بیکٹ فیری تحریر تھا۔ گیٹ کے سامنے ایک ایس ایس کا جوان کھڑا تھا۔ جس نے انگلی کے اشارے سے اُسے اندر جانے کو کہا۔

خصوصی مطالعہ

''ایک قدیم خیال کی نگرانی میں''......ایک تاثر

ابرار احمد

نظم چاہے آزاد ہو یا نثری، پوری شخصیت کا تقاضہ کرتی ہے۔خاص طور پر نثری نظم میں تو لکھنے والے کو کسی خارجی سہارے کی مدد بھی دستیاب نہیں ہوتی ۔ یہ ایک طرح سے تنے ہوئے رسے پر چل کر دکھانے کا نام ہے۔شاعر کو یہ ثابت کرنا پڑتا ہے کہ اس نے نثری قرینے میں کوئی ایسی بات رکھ دی ہے جو اسکی تخلیق کو شاعری کے احاطے میں داخل کر سکے۔

نثری نظم لفظ کی شاعری تو ہے ہی لیکن اس کی اصل محرک ،خیال، جذبے، یا فکر کی وہ سطح ہے جو مروّج اصناف میں سمائے جانے سے انکار کرتی ہے ۔یوں جب تخلیقی تجربہ اپنی پُر وفور شکل میں شاعر پر منکشف ہوتا ہے تو حد بندیوں کو توڑتا ہوا آزادی کی فضا میں جا نکلتا ہے ۔لیکن یہی آزادی شاعر کا امتحان بھی ہے۔جہاں جہاں ہمارے سہل پسند شعراء نے اسے غیر محتاط انداز میں اپنایا ہے، نثری نظم کے اعتبار کو کم کیا ہے۔لیکن ہمارے باکمال اور ذمہ دار شعراء جو دیگر شعری اضاف میں اپنے تخلیقی جوہر دکھاتے رہتے ہیں یا اس کی صلاحیت رکھتے ہیں جب نثری نظم کی طرف آتے ہیں اس صنف کے امکانات چمک اُٹھتے ہیں ۔نثری نظم کی تخلیق بذاتِ خود ایک ایسا ارفع شعری تجربہ ہے جو اور اصناف میں شاید ممکن ہی نہیں ۔۔۔۔میں اس صنف کی بابت اٹھائے جانے والے سوالات کو اس لیے درخورِ اعتنا نہیں سمجھتا کہ جب خلاقانہ ذہن کے حامل بہت سے شعراء اس صنف میں طبع آزمائی کرنے پر آمادہ بھی ہیں اور یہ سلسلہ جاری بھی رکھنا چاہتے ہیں تو پھر نثری نظم کے جواز کی بحث غیر متعلق اور فضول قرار پا جاتی ہے۔

نثری شاعری کی عمر اتنی زیادہ نہیں کہ ہم اس میں سے کسی استوار روایت کو برامد کر سکیں نہ ہی کامیاب نثری نظم کا فی الحال کوئی معین معروضی پیمانہ مقرر کیا جا سکتا ہے اس صنف

میں رنگا رنگی اور تخلیقی ہمہ جہتی موجود ہے۔انجم سلیمی اس چہل پہل میں ایک خوبصورت اضافہ ہے نثری نظم کی بابت ایک اور سوال تواتر سے اٹھایا جاتا ہے کہ کیا یہ صنف ہماری کسی تہذیبی ضرورت کو پورا کرتی ہے؟اور یہ بات ایسے لوگ کرتے ہیں جو خود کسی جامد تہذیبی حصار میں بیٹھے دنیا کا نظارہ کرتے رہتے ہیں اور بھول جاتے ہیں کہ تہذیب ارتقائی مراحل بھی طے کرتی ہے تہذیبیں باہم متصادم ہو جائیں تو بھی ایک دوسرے سے کچھ نہ کچھ حاصل بھی کرتی رہتی ہیں ہمارا آج کا انسان تبدیلی کے اس صبر آزما بحران کے عین وسط میں کھڑا ہے۔اوراس کے ذہن ،اسکے باطن اوراسکے خارج میں ان گنت نئے سوالات سر اُٹھاتے چلے جارہے ہیں یہ سوال مختلف نوع کے ہیں آغاز ہی میں اگر میں یہ کہہ دوں کہ انجم سلیمی کی شاعری بھی ہمارے مقامی تناظر میں ایک نیا تہذیبی سوال اُٹھاتی ہے جسے اُس نے قدیم خیال ،یاقدیم خبر کا نام دیا ہے تو بے جا نہ ہو گا۔شیلے نے کہا تھا کہ شاعر دنیا کے **Unacknowleged legisletors** ہیں گویا اصناف ہوں ،موضوع ہو،خیال ہو،یا معاشرے ہوں۔شاعر کے پاس اس بابت اسی نوع کی قانون سازی کا اختیار ہے۔اور انجم سلیمی بھی اپنے اختیار کو استعمال کرنے کا استحقاق،قرینہ اور صلاحیت رکھتا ہے۔اس کی کتاب کے بطن سے بعض نئے سوالات جنم لیتے ہیں۔یہ سوالات کیا ہیں' وہ انہیں شاعرانہ غلاف میں لپیٹ کہ پیش کرتا ہے جسے **Unfold** کرنا کچھ زیادہ مشکل بھی نہیں ہے۔

انجم سلیمی کا قدیم خیال کیا ہے؟اسکے لیے اُس کے پاس موجود قدیم خبر سے رجوع کرنا پڑتا ہے ،یہ قدیم خبر وہ ہے جو حجروں ، خانقاہوں ،اور درگاہوں کی پناہ میں رہی ۔یہ خبر دراصل بدن کی ایک اور افادی جہت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔جس خبر کے افشانہ ہونے کے سبب اس کے بیجوں کو بویا نہ جا سکا اور جو بانجھ نہ ہوتے ہوئے بھی حاملہ نہ ہو سکی۔اس حاملہ نہ ہو سکنے والی قدیم خبر کا نوحہ اور انکشاف اس کی نظموں میں جا بجا بکھرا پڑا ہے۔وہ حرام کر دیئے جانے والے جسموں کو ایک دوسرے پر حلال کرنے کی دعا مانگتا ہے اور بدن پر عائد پابندیوں کے خلاف شاعرانہ لہجے میں بات کرتا ہے۔

اے خدا ہم تجھے گواہ کرتے ہیں
ہم اپنی روحوں کی یکسوئی
اور سرشاری کے طالب ہیں
سو ہمارے جسم ایک دوسرے پر حلال کر
ہمارے نمک دانوں کو بھرا رکھ

(آیتِ وصال)

آج سانپوں سے وصال کی رات ہے
آنسو خشک ہیں، غسل کیسے کروں
میرے زخموں کے کیڑے
میرے سائے سے بڑے ہو رہے ہیں

(گریہ)

تمہاری پیاس میرے آنسوؤں سے زیادہ ہے
بارش کا لباس پہنو
اور کسی کنوئیں میں جا سوؤ!

(اِفتی)

انجم سلیمی نے اپنی موجودگی کے معانی بدن کے حوالے سے ہی دریافت کیئے ہیں۔ اور یہ بدن کے مروّجہ اور غیر مروّجہ ہر دو طرح کے استعمال کی آزادی کی طلب سے عبارت ہیں ۔اور وہ یہ آزادی کی طلب کرتا ہے یا اس پر ایمان لاتا دکھائی دیتا ہے کہ انسان کم از کم اپنے بدن کے معاملے میں مکمل اختیار رکھتا ہو۔جنسی حوالے سے اس کے ہاں **taboos** ٹوٹتے دکھائی دیتے ہیں اور یوں اس کی شاعری مرّوج ،دستور اور اخلاقیات کے خلاف ایک شعری اور مابعد الطبعیاتی بغاوت کی عمدہ مثال بن جاتی ہے۔

مجھ میں کیا جھانکتے ہو

تمہاری ہوس گیر کشتیاں
میرے ساحلوں پر اوندھی پڑی ہیں
تمہارے ہاتھ تو پتوار بھی نہیں آئے
اور سمندر دور دور تک سوکھا پڑا ہے

(اِفتی)

لیکن موضوعات کے حوالے سے اس کی نظموں میں تنوع اور ہمہ جہتی بھی موجود ہے اور اس کے بطور فرد بے شمار مسائل اسکی نظموں میں شناخت کیے جاسکتے ہیں وہ بھی ہم اور ہماری نسل کے مشترکہ مسائل ہیں۔

اسکی شاعری میں بھی اس کے دیگر قابلِ ذکر معاصرین کی طرح وارفتگی اور تخلیقی وفور بعض اوقات ایسی پر اثر تخلیقات کا سبب بنتا ہے جو موجود و معدوم کے احساس سے ماورا ہو کر ہمیں زندگی کے کسی اور ہی منطق میں لے جاتی ہیں جہاں وقت ،وقت نہیں رہتا ،دنیا دنیا نہیں رہتی ۔اور یوں لگتا ہے جیسے شاعر ہوش وحواس کی حدود سے باہر کہیں مقیم ہے اور ایک ارفع مقام سے چیزوں سے مکالمہ کر رہا ہے۔

ویسے بھی ......میں صبر ہوں ......دیوار نہیں
جو ہجرت نہ کرسکوں
ادھر گھر میں کسی چراغ کا دل کانپا ہے
اُدھر دور دور کہیں ......
اونگھتی ہوئی زمیں پر کوئی پھول چٹکنے کی آواز سنائی دی ہے
دیکھ رہا ہوں.....
میں نے ابھی جوتا نہیں پہنا
اور بہت سے راستے .....

ابھی سے میرے اطراف میں بھنبھنانے لگے ہیں
(شاید میں خود کو شہر بدر کر دوں)

میری خاموشی پر
تمہاری آواز کا کفن کم پڑ رہا ہے
تو چلاتے کیوں ہو
جانتے نہیں....
شہر پہلے ہی میری تہمت سے گونج رہا ہے
(میری بے لباسی تمہارا پہناوا نہیں)

آپ نے دیکھا وہ کتنی ذہانت اور چابکدستی سے معروضی منطق کو توڑ کر اپنی باطنی دنیا میں داخل ہوتا ہے اور ہمیں ساتھ ساتھ لیے پھرتا ہے۔'ورق الخیال'، میں یہی کیفیت ایک باقاعدہ نشے کی حالت میں تبدیل ہوتی دکھائی دیتی ہے۔جہاں گہری سبز خاموشی ہے، بنفشی پھولوں کی روشنی ہے، سرشاری اور دیوانگی کا عالم ہے

باوا جی ــ واہ
سنو تو۔
ستاروں کی جھنکار
مٹی کے پیالوں سے چھلکنے لگی ہے
(ورق الخیال)

نظم کے لہجے اور اس کی بنت کے حوالے سے انجم سلیمی، سارہ شگفتہ اور نسرین انجم بھٹی کے قریب دکھائی دیتا ہے۔سارہ شگفتہ کی نظمیں اپنی دلپذیری اور **ecstasy** کی حامل لائنوں کے باوجود اکثر مقامات پر اپنا معنوی دائرہ مکمل نہیں کرتیں۔عجیب بات یہ ہے کہ اس کے باوجود آپ اسے معمولی شاعرہ قرار نہیں دے سکتے۔کچھ ایسا ہی معاملہ نسرین بھٹی کا ہے اگر چہ اس کی نظموں میں فالتو مواد بھی کافی مقدار میں موجود ہے۔لیکن انجم سلیمی کی کوئی ایک نظم

بھی ہمیں مفہوم یا خیال کی سطح پر عدم تکمیلیت کا احساس نہیں دلاتی۔وہ اپنی نظموں میں بالآخر اپنی بات پوری کرتا ہے یوں ہم اس شاعری سے تخلیق لطف کے ساتھ ساتھ ایک جہانِ معانی سے بھی آشنا ہوتے ہیں اسکی نظم اپنا دائرہ مکمل کرتی ہے اور فالتو مواد سے پاک بھی نظر آتی ہے۔

ایک قبر تو میں کہیں بھی کما سکتا ہوں
مٹی میرے تلوے چاٹتی ہے
اور انسان.....
انسان میرے لہو میں بھونکتے ہیں
خاموشی کے خالی بدن میں
کوئی دھن مجھے گنگناتی رہتی ہے
اداسی اور کہاں ہے
کاش خدا مجھے دیکھ رہا ہو (تنہائی کا سفرنامہ)
سجدہ میری پیشانی کا زخم ہے
مگر میرا مرہم سقراط کے پیالے میں پڑا ہے
خدا کا بوسہ میرا پہناوا تھا (انحراف)
شور مت کرو۔
زمیں کی آنکھ کھل جائے گی (بے لباس میرا پہناوا نہیں)

انجم سلیمی کی نظموں سے جو انسان برآمد ہوتا ہے۔وہ بے اختیار ہے لیکن حیات و موت کی حقیقت سے آشنا اور اسکی مضحکہ خیزی پر ہنسنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔اسے اپنی عدم تکمیل کا دکھ ہے اور اپنے ٹکڑوں کے ادھر اُدھر بکھر جانے کا ملال بھی۔

اور کسی عزیز جنازے کو کندھا دیتے ہوئے
ہنسی کہاں سے پھوٹ پڑتی ہے (مجھے ہنسنا اور رونا نہیں آتا)

میں نے اپنے پاس رکھ لیے
کچی نیند میں جاگے ہوئے خواب

مشک کافور میں بھیگی ہوئی سانسیں
اور خدا جیسی ایک تنہائی (ایک ہم خیال کی موت)

اسکی کئی نظمیں کیفیاتی نظمیں ہیں جو ہمیں ایک خاص موڈ میں لے جاتی ہیں۔ "پانی کی آواز" میں وہ اپنی تنہائی اور اکتاہٹ میں تھکن زدہ رات کا سامنا کرتا ہے اور "میں جمع ہو رہا ہوں" میں وہ موجود سے اُوپر اٹھ کر وقت کے ایک بڑے اور عظیم دھارے میں بہتا دکھائی دیتا ہے۔

"وقت مجھ سے ملنے آئے گا
میں نے اپنی سرگوشیاں دیواروں میں رکھ دی ہیں
خالی کمرہ مجھ سے بھرا ہوا ہے
مجھے ابھی دستک مت دو (میں جمع ہو رہا ہوں)

کلوننگ کے تجربے کے حوالے سے کہی گئی اسکی نظم بھی خصوصی تذکرے کے لائق ہے جس میں وہ بطور انسان اپنی شناخت کے مضحکہ خیز ہونے پر افسوس کرتا ہے۔

"خود سے پوچھتا ہوں میں اپنا نام.....
اور جواب میں سنوارتا ہوں اپنے خال و خد
مجھ پر ہنستے ہنستے.....
ٹوٹ جاتا ہے میرا آئینہ!"

ہر باشعور تخلیق کار کی طرح اسکے مسائل متنوع ہیں اور اسی طور اسکے موضوعات بھی

۔اس کا ایک مسئلہ یقین کی گم شدگی ہے۔دوسروں کے بغیر وہ جی نہیں سکتا لیکن وہ اس کے لہو میں بھو نکتے ہیں "ہنری مِلر" نے لِکھا تھا

"لوگ جوؤں کی طرح ہوتے ہیں۔آپ خارش کرتے جائیں یہاں تک کہ خون نکل آتا ہے لیکن آپ کبھی مکمل طور پر ان جوؤں سے نجات نہیں حاصل کر سکتے۔" دراصل وہ اپنی اس طرح کی موجودگی کے مفہوم سے بیزار ہے اور بے معنویت سے نبرد آزما رہتا ہے ۔پھر وہ بعض معصومانہ سوالات کے ذریعے ذہنِ آزاد میں پیدا ہونے والی الجھنوں کو شعری پیکر عطا کرتا ہے

"رنگ کیا وہی ہوتا ہے
جو دوسروں پر چڑھتا ہے
آنکھ کیا وہی ہوتی ہے
جس سے ہم دیکھتے ہیں" (ہم کون ہوتے ہیں)

اِن کے ہاں جدید اور تیزی سے تبدیل ہوتی ہوئی دنیا کا منظر نامہ بھی ہے جس میں رشتوں اور اقدار کی شکست و ریخت کا عمل نہایت تیزی سے جاری ہے اور وہ بطور فرد اس معاشرے میں پہلے ہی مغائرت کا شکار تھا یہ اجنبیت اب اسکے گھر میں بھی در آئی ہے کتنا بے رشتہ، کتنا بے گھر، کتنا بے وطن کر دیا ہے

"ہمیں ہمارے بچوں نے .....
ہمارے پاس تو صرف دیواریں بچی ہیں
جن پر لٹکائی جا سکتی ہے
بے مصرف رشتوں کی فراغت
اور وقت بہت ہے ہمارے پاس"
(بے مصرف رشتوں کی فراغت)

وہ ملول اور افسردہ ہے۔اسکے اندر ایک شہر ماتم آباد ہے جہاں اس کا جنم دن جشن گریہ کی صورت منایا جاتا ہے۔پھر ایک شہر اسکے باہر بھی آباد ہے۔وہاں بھی اسکے لیے تنہائی اور علاحدگی ہی مقدر ہے۔یہ تنہائی اسے اپنے باطن میں آباد کرتی ہے۔اور ذات میں ایک بصیرت افزاء صورت پیدا کرتی ہے۔

''تمہارے دکھ نے
میرے اندر ایک شہر ماتم دریافت کیا
جہاں ہر روز میرے جنم پر جشنِ گریہ منایا جاتا ہے'' (گریہ)

انجم سلیمی ان نئے شعراء میں شامل ہے جو اپنی شناخت کی صورت گری کے عمل سے گذر رہے ہیں'قدیم خیال کی نگرانی میں' اسی انفرادیت کے حصول کی جانب ایک بامعنی پیش رفت ہے۔خوبصورت اور کامیاب۔اپنی نظموں میں وہ ایک روشن خیال اور ترقی پسند دانش ور دکھائی دیتا ہے۔ایک ایسا بغاوت آمادہ انسان جس کی اصل طاقت محبت ہے اور جس کا شعری تجربہ Sub line کی جانب محوسفر ہے۔اسکی نظموں میں باریک یا نازک (subtle) اور کھردرے (crude)، جذبات واحساسات ایک حسن انگیز وحدت میں ڈھل کر اسکی نظموں کو انفرادیت اور اعتبار عطا کرتے ہیں

قدیم خیال کی نگرانی میں سفر کرنے والا ہمارا یہ شاعر موجود کے اندھیرے میں چراغ کی صورت جل رہا ہے۔مرّوج اخلاقیات اور طرزِ زندگی کے بتوں پر حملہ آور ہوتا ہے تسلسل اور بہادری کے ساتھ۔اور زندگی کو آج کے انسان سے ہم آہنگ ہونے کا ایک موقع اور دینا چاہتا ہے۔اس ہم آہنگی اور تبدیلی کی اس طلب اور کشمکش میں ہم سب اسکے ساتھ کھڑے ہیں۔

خصوصی مطالعہ

دوزاویئے

حسن کوزہ گر

ن۔م راشد

(1)

جہاں زاد، نیچے گلی میں ترے در کے آگے
یہ میں سوختہ سر حسن کوزہ گر ہوں!
تجھے صبح بازار میں بوڑھے عطار یوسف
کی دوکان پر میں نے دیکھا
تو تیری نگاہوں میں وہ تابناکی تھی
میں جس کی حسرت میں
نو سال دیوانہ پھرتا رہا ہوں
جہاں زاد، نو سال دیوانہ پھرتا رہا ہوں!
یہ وہ دور تھا جس میں میں نے
کبھی اپنے رنجور کوزوں کی جانب
پلٹ کر نہ دیکھا......
وہ کوزے مرے دوست چابک کے پتلے
گل و رنگ و روغن کی مخلوق بے جاں
وہ سرگوشیوں میں یہ کہتے
''حسن کوزہ گر اب کہاں ہے؟

وہ ہم سے خود اپنے عمل سے
خداوند بن کر خداؤں کے مانند
ہے روئے گرداں!"
جہاں زاد نو سال کا دور یوں مجھ پہ گزرا
کہ جیسے کسی شہرِ مدفون پر وقت گزرے
تغاروں میں مٹی
کبھی جس کی خوشبو سے وارفتہ ہوتا تھا میں
سنگ بستہ پڑی تھی
صراحی و مینا و جام و سبو اور فانوس و گلداں
مری ہیچ مایہ معیشت کے
اظہارِ فن کے سہارے
شکستہ پڑے تھے
میں خود، میں حسن کوزہ گر پا بہ گِل
خاک بر سر برہنہ
سر "چاک" ژولیدہ مو، سر بہ زانو
کسی غمزدہ دیوتا کی طرح واہمہ کے
گِل ولا سے خوابوں کے
سیال کوزے بناتا رہا تھا
جہاں زاد نو سال پہلے
تو ناداں تھی لیکن تجھے یہ خبر تھی
کہ میں نے، حسن کوزہ گر نے
تری قاف کی سی افق تاب آنکھوں
میں دیکھی ہے وہ تابناکی
کہ جس سے مرے جسم و جاں، ابر و مہتاب کا

رہگور بن گئے تھے
جہاں زاد بغداد کی خواب گوں رات
وہ رودِ دجلہ کا ساحل
وہ کشتی وہ ملاح کی بند آنکھیں
کسی خستہ جاں رنج بر کوزہ گر کے لیے
ایک ہی رات وہ کہربا تھی
کہ جس سے ابھی تک ہے پیوست
اس کا وجود......
اس کی جاں اس کا پیکر
مگر ایک ہی رات کا ذوق دریا کی وہ لہر نکلا
حسن کوزہ گر جس میں ڈوبا تو ابھرا نہیں!
جہاں زاد اس دور میں روز، ہر روز
وہ سوختہ بخت آ کر
مجھے دیکھتی چاک پر پا بہ گل سر بہ زانو
تو شانوں سے مجھ کو ہلاتی......
(وہی چاک جو سالہا سال جینے کا تنہا سہارا رہا تھا!)
وہ شانوں سے مجھ کو ہلاتی
"حسن کوزہ گر ہوش میں آ
حسن اپنے ویران گھر پر نظر کر

یہ بچوں کے تنور کیوں کر بھریں گے
حسن، اے محبت کے مارے
محبت امیروں کی بازی
حسن، اپنے دیوار و در پر نظر کر"

مرے کان میں یہ نوائے حزیں یوں تھی جیسے
کسی ڈوبتے شخص کو زیرِ گرداب کوئی پکارے!
وہ اشکوں کے انبار پھولوں کے انبار تھے ہاں
مگر میں حسن کوزہ گر شہرِ اوہام کے ان خرابوں کا مجذوب تھا
میں کوئی صدا کوئی جنبش
کسی مرغِ پرّاں کا سایہ
کسی زندگی کا نشان تک نہیں تھا!
جہاں زاد، میں آج تیری گلی میں
یہاں رات کی سرد گوں تیرگی میں
سر و مو پریشاں
دریچے سے وہ قاف کی سی طلسمی نگاہیں
مجھے آج پھر جھانکتی ہیں
زمانہ، جہاں زاد وہ چاک ہے
جس پہ مینا و جام و سبو
اور فانوس و گلداں
کے مانند بنتے بگڑتے ہیں انساں
میں انساں ہوں لیکن
یہ نو سال جو غم کے قالب میں گزرے
حسن کوزہ گر آج اک تودۂ خاک ہے جس
میں نم کا اثر تک نہیں ہے
جہاں زاد بازار میں صبح عطار یوسف
کی دوکان پر تیری آنکھیں
پھر اک بار کچھ کہہ گئی ہیں
ان آنکھوں کی تابندہ شوخی

سے اٹھی ہے پھر تودۂ خام میں
نم کی ہلکی سی لرزش
یہی شاید اس خاک کو گل بنا دے!
تمنا کی وسعت کی کس کو خبر ہے جہاں زاد لیکن
تو چاہے تو بن جاؤں میں پھر
وہی کوزہ گر جس کے کوزے
تھے ہر کاخ و کو اور ہر شہر و قریہ کی نازش
تھے جن سے امیر و گدا کے مساکن درخشاں
تمنا کی وسعت کی کس کو خبر ہے جہاں زاد لیکن
تو چاہے تو میں پھر پلٹ جاؤں ان اپنے
مہجور کوزوں کی جانب
گل و لا کے سوکھے تغاروں کی جانب معیشت کے اظہار فن کے سہاروں کی
جانب
کہ میں اس گل و لا سے، اس رنگ و روغن
سے پھر وہ شرارے نکالوں کہ جن سے
دلوں کے خرابے ہوں روشن

(2)

جہاں زاد

اے حسن کوزہ گر
تو نے جانا کہ میں
جسم و جاں کے تعلق کی روشن گزرگاہ سے
اک جہاں کا سفر جھیل کر

اس رفاقت کی دہلیز تک آ گئی ہوں
کاش تو جان سکتا
کہ اس صحن خانہ سے دہلیز تک کے سفر میں
جہاں زاد کو کیوں زمانے لگے ہیں
حسن!
اس سفر میں جہاں زاد کو
ایک اک گام پر وقت کے تازیانے لگے ہیں حسن!
وقت، مالک بھی ہے، دیوتا بھی
محافظ بھی ہے اور خواجہ سرا بھی

یہ دیکھا ہے میں نے
کہ جب بھی دریچوں میں تازہ شگوفہ کھلا ہے
ہوا سے وہ ہنس کر ذرا سا گلے بھی ملا ہے
تو خواجہ سرا کی نظر سے کہاں بچ سکا ہے
مگر دیکھ مجھ کو
کہ میں نے یہاں ٹھیک نو سال تک
پھول کاڑھے ہیں خوابوں کے بستر پہ لیکن
ابھی تک کوئی ان پہ سویا نہیں
پھول تازہ، شگفتہ اور آزردہ ہیں

میں نے نو سال صورت گری کی ہے
تیرے ہر اک لمس کی
رات بھر
میں نے آنکھیں بھگوئی ہیں کوزوں میں

اس رفاقت کی دہلیز تک آئی ہوں
کاش تو جان سکتا
کہ اس صحن خانہ سے دہلیز تک کے سفر میں
جہاں زاد کو کیوں زمانے لگے ہیں
حسن!
اس سفر میں جہاں زاد کو
ایک اک گام پر وقت کے تازیانے لگے ہیں حسن!
وقت مالک بھی ہے دیوتا بھی
محافظ بھی ہے اور خواجہ سرا بھی

یہ دیکھا ہے میں نے
کہ جب بھی دریچوں میں تازہ شگوفہ کھلا ہے
ہوا سے وہ ہنس کر ذرا سا گلے بھی ملا ہے
تو خواجہ سرا کی نظر سے کہاں بچ سکا ہے
مگر دیکھ مجھ کو
کہ میں نے یہاں ٹھیک نو سال تک
پھول کاڑھے ہیں خوابوں کے بستر پہ لیکن
ابھی تک کوئی ان پہ سویا نہیں
پھول تازہ، شگفتہ اور آزردہ ہیں

میں نے نو سال صورت گری کی ہے
تیرے ہر اک لمس کی
رات بھر
میں نے آنکھیں بھگوئی ہیں کوزوں میں

اور صبح دم
حلق کو تر کیا آنسوؤں سے بہت
یہ مسافت
یہ نو سال کی بے محابا مسافت
ترے در کے آگے مجھے کھینچ لائی
مگر تو یہاں
چاک پر اپنی دھن میں مگن ہے
نگاہیں اُٹھا
دیکھ تو میں جہاں زاد تیری
ترے سامنے ہوں

مگر تو نہ سچ ہی کہا تھا
"زمانہ، جہاں زاد! وہ چاک ہے
جس پر مینا و جام و سبو اور
فانوس و گلداں کے مانند بنتے بگڑتے ہیں انسان
سو اب ہم
جو صدیوں کی لمبی مسافت سے لوٹے ہیں
تو اپنے رنجور کوزوں میں جو جھا ہوا ہے
یہ تیرا قصور اور نہ میری خطا ہے

کوئی کوزہ گر تو ہمارا بھی ہوگا
سو یہ اس کی حکمت
کہ اس نے ہمیں چاک پر ڈھالتے وقت
لمحوں کا پھیرا اس نزاکت سے رکھا

کہ ہم اپنی اپنی جگہ صرف ششدر کھڑے تھے
کئی دست چابک کے بے جان پتلے
مرے اور تیرے درمیاں سج گئے تھے
سو یہ اس کی حکمت
مگر وقت اس درجہ سفاک کیوں ہے
یہ مشاطۂ زندگی اتنی چالاک کیوں ہے
مرے اور ترے درمیاں
نو برس جس نے لا کر بجائے
کہ ساحل سے کشتی تک آتے ہوئے
جیسے تختے کے ہمراہ دل ڈگمگائے

وہی نو برس
جو مرے اور ترے درمیاں
وقت کی کرچیاں ہیں
زمانہ بھی کیسی عجب کہکشاں ہے
یہ دنیائے سیارگاں ہے کہ جس میں
ہزاروں کواکب
مسلسل کسی چاک پر گھومتے ہیں
یہ اجسام کے گرد اجسام کا رقص ہی زندگی ہے
مری جاں
مری جان
تو چاک کے ساتھ مٹی کے رشتے کو پہچانتا تھا
حسن!
تو نے مٹی کے بے جان پتلوں سے

تخلیق کے جاں گسل مرحلوں میں
سدا گفتگو، سوطرح گفتگو کی

ذہانت کے پتلے، محبت کے خالق
فقط یہ بتا دے
کہ تیرے عناصر کے اجزائے ترکیب میں
واہمہ کیسے آیا؟
حسن تو وہاں جھونپڑے میں
اکیلا گلے مل کے رویا تھا کس سے
لبیب اور تو اور میں
اور حقیقت میں کوئی نہیں تھا
ترا واہمہ
میرے لب میرے گیسو سے لپٹا رہا تھا

لبیب ایک سایا
جسے تو نے روگ اپنی جاں کا بنایا
یہ سایا کہیں گر حقیقت بھی ہوتا
تو آخر کو تو اس حقیقت سے کیوں بے خبر تھا
کہ ہر جسم کے ساتھ اک آفتاب
اور مہتاب لازم
یہ تثلیث قائم ہے قائم رہے گی
وہ چاہے لبیب
اور چاہے تری سوختہ بخت سی شکل میں ہو
مجسم رہے گی

یہ تمکنت قائم ہے قائم رہے گی

حسن!

میں ترے سامنے آئینہ تھی

ترے ہجر اور وصل کا آئینہ

انہماک و تعلق کی مٹی سے گوندھے ہوئے

جسم کو

تیری آنکھوں کی حدت نے چمکایا تھا

تیری خلوت کی حیرت نے

وہ رنگ وروغن کئے تھے

کہ آئینے ششدر رکھڑے رہ گئے تھے

مگر تیری خلوت کی حیرت میں

وحشت کا جو شائبہ تھا

نگاہوں سے میری کہاں چھپ سکا تھا

مرے اور ترے درمیاں وصل کی ہر گھڑی میں

نہ جانے کہاں سے

جانفشانی کے شعلوں سے دہکے ہوئے

زندگی کی ابد تاب تنور پر

انگلیاں ترے بچوں کی تھامے کھڑی

بھوک سے برسر جنگ تھی

جس کے نزدیک یہ

تیرے کوزے، ترا فن، تری آگ سب

میری آنکھیں، مرے پھول، اور خواب سب

زندگی کے ابد تاب تنور کی راکھ تھے
وہ بھی اپنی جگہ حق بہ جانب مگر
تیری اس سوختہ بخت کو کیا خبر
جب زمیں اپنے محور کی تجدید میں
حرف لا سے گزر جائے گی

اے حسن!
چاک پر سے ذرا اپنی نظریں اٹھا
تو مرے نو برس تک بنائے گئے پھول تو دیکھ لے
پھول تازہ، شگفتہ اور آرزدہ ہیں
یوں نہ ہو کہ انہیں
بھوک اور مفلسی کے ستائے ہوئے
میرے بچے نیلام کر آئیں جا کر کہیں
تیرے کوزوں کی مانند بازار میں

اے حسن!
دامن وقت پر جتنے گل اور بوٹے کھلے ہیں
جہاں زاد کی زخم پوروں نے رنگ ان میں
اپنے جنوں کے بھرے ہیں
یہ تاوان ہیں چمپئی انگلیوں کا
ترے جام و مینا پہ
جس خال و خد کی نزاکت کی پرچھائیاں تھیں
تجھے کیا خبر یہ کن آنکھوں کی بینائیاں تھیں

حسن!
یہ محبت
کہ جس کو تری سوختہ بخت گردانتی ہے

''امیروں کی بازی''

تو میری تیس یہ امیروں کی بازی کہاں
صرف بازی گری ہے
محبت ہمیشہ سے مفلس کا سرمایۂ جان رہی ہے
یہ تو وہ پونجی ہے جس تک
امیروں کے ہاتھ اب بھی پہنچے نہیں ہیں
تجھے یہ گماں تھا
کہ عورت محبت کی بازی میں
بے جان پتے کی صورت
کسی دست چابک کی مرہون منت
وہ اس کھیل میں ایک مہرے کی صورت
کہ جب جس نے چاہا
تو ہزاروں برس بعد بھی
یہ ازل کے گھروندوں کی مٹی میں مدفون
پھول اور بوٹے، یہ کوزے اور ان میں انہی قاف آنکھوں سے چھلکے ہوئے
سرخ پانی کی تلچھٹ
کسی کوزہ گر کے جواں لمس سے جی اُٹھے تو
جہاں زاد اس کے لیے پھر جنم لے گی
اور نو برس رقص کرتے گزر جائیں گے

تیری اس سوختہ بخت کو کیا خبر
وہ رات
وہ حلب کی کارواں سرا کا حوض
جس کو میں نے جسم و جاں کی خوشبوئیں کشید کر کے

قطرہ قطرہ نو برس میں آنسوؤں سے پر کیا
وہ ایک رات صرف ایک رات میں
تمام خشک ہو گیا
ہم اپنے وصل کی تمازتوں میں ایسے جل بجھے
کہ راکھ تک نہیں بچی
یہ ایک جاں کی تشنگی
مجھے تجھے بیک زباں
بھلا کہاں کہاں نہ کھینچتی پھری
مگر یہ تو نے کیا کہا
"کہ تیرے جیسی عورتیں جہاں زاد
ایسی اُلجھنیں ہیں جن کو آج تک
کوئی نہیں سمجھا سکا
کہ عورتوں کی ساخت ہے وہ طنز اپنے آپ پر
جواب جس کا ہم نہیں"

تو پھر یہ جام و مینا و سبو و حوض و درود نیل
اس زمیں کی گود میں
ازل سے حرف گیر تاب ناک خواب کے لیے
کہیں بھی کچھ بہم نہیں)
اسے ایک گھر سے اُٹھا کر
کسی دوسرے گھر کا مالک بنایا
کہ عورت فقط ایک پتھر کی مورت
یہ تصویر حیرت
یونہی چپ کھڑی ہے یونہی چپ رہے گی

مگر یوں نہیں ہے

حسن! تو نے دیکھا
کہ میں قید و اوہام و بندان روایات میں بوڑھے عطار یوسف کی دوکان پر
اپنی آنکھیں تجھے نذر کرتی رہی
بوڑھا عطار وہ کیمیاءگر کہ جس نے
زمانوں کے جنگل سے چہروں کے پھول اور بوٹے چنے
وہ مجھے اور تجھے جانتا تھا مگر
میں نے بازار میں
تجھ سے آنکھوں کا اور دل کا سودا کیا

اے حسن!
میرے ایک اک دریچے پہ
کہنہ روایات و ظالم عقائد کا جنگل اُگا تھا
حسن! کاش تو
میری آنکھوں سے میرے دریچے کو تکتا
تو یہ جان سکتا
جہاں تو کھڑا ہے
وہاں ایک اک درز سے
میری آنکھیں، مرا جسم
چھن چھن کے کٹ کٹ کے
گرتا رہا تھا!

نظمیں

تبسم کاشمیری

میں تھک گیا ہوں

مشکل ہے زمین کے گول زینے پر
صدیوں تک چڑھتے جانا
مضروب شہزادیوں کو لئے ہوئے
فصیلوں پر دوڑنا
بھول بھلیوں یا پناہ گاہوں میں گم ہو جانا

یا ایک دعا کے ساتھ
خانقاہوں میں برسوں تک جاگتے رہنا
اور ایک نقش پہن کے
دھوئیں کے عفریتوں کا سامنا کرنا!

یا پھر بد قماش حاکموں کے
جگر میں خنجر اتارنا
اور اپنے سینے کو
جلتے تیروں کے سامنے کر دینا

زمین کے گول زینے پر چڑھتے چڑھتے
اب میری خواہشیں بہت مختصر رہ گئی ہیں
میں چاہتا ہوں
زمین کے اس کرّے پر ہر سمت گھوڑا دوڑانا
جادوگروں کو قتل کرنا
اساطیری پرندوں سے ہم کلام ہونا
سو سالوں سے سوئی ہوئی ایک بستی کو جگانا
اور ایک کہنہ گلدان میں کوکنار کو سجانا

میں اب تھک گیا ہوں
زمیں کے گول زینے پر چڑھتے چڑھتے
پرانی خانقاہوں میں مناجات کرتے
روشنی کے سینے پر گڑی میخیں نکالتے
اور تاریخ کے مضروب اوراق پر مرہم لگاتے

میں اب ایک مہتابی میں شراب پیوں گا
شمالی پہاڑوں کا شہد کھاؤں گا
اور خزاں کی ایک جھونپڑی میں
ایک خوش مقال دوشیزہ سے سرِشام باتیں کروں گا
اور آخرِ شب اس کے مے آشام ہونٹ چوموں گا!

خواب کا گھونسلا

انار کے پیڑوں کا ایک باغ
ترائیوں کا ایک قدیم قلعہ
یا بازگشتوں کا ایک پل
مجھے نہیں چاہیے

گھوڑے، سپاہی، اور ہتھیار
ترکشوں کے انبار
یا سیخ پا ہاتھیوں کی ایک قطار

کسی گل پیرہن کی خلوت
یا کسی سوسن بدن کی قربت
یا کسی محفلِ شب کی ایک جلوت

مجھے نہیں چاہیے
کوئی عظیم خیال
یا کوئی عظیم کتاب
یا کوئی ساعتِ لازوال!

مجھے اب کچھ بھی نہیں چاہیے
مرے لیے بس مرے خواب کا گھونسلا ہی کافی ہے!

آدم کا المیہ

وہ زمین جہاں آدم نے پہلی بار پاؤں رکھا تھا
جہاں آدم اور حوّا نے
پہلی صبح سورج کو ابھرتے ہوئے دیکھا
اور جہاں پہلی شام اس نے ایک چٹان پر کھڑے ہوکے
حوّا کے ساتھ شام کا پہلا ستارہ
اور مغرب میں ڈوبتے ہوئے سورج کو دیکھا

جہاں انھوں نے پہلی بار
آسمان پر چمکتے ہوئے چاند
اور لازمان کہکشاؤں کو حیرت کے ساتھ دیکھا
اور جہاں وہ ہوا کا ملبوس پہن کر
پہلی بارش میں دوڑتے پھرتے تھے
اور جہاں وہ اپنے بدنوں پر ڈھیروں زرِگل سجاتے تھے
اور پتوں سے بنائے ہوئے تاج
اپنے روشن سروں پر سجاتے
اور پیار کے اولیں گیت گاتے تھے

وہ زمین جہاں آدم کے ساتھ
فاختاؤں کی ٹولیاں اڑتی پھرتی تھیں
وہ جنگل جہاں حوّا شیریں شہد کھاتی تھی
وہ میدان جن میں آدم
بیٹوں کے ساتھ گھوڑسواری کرتا تھا

وہ جھلیں کہ جن کے شفاف پانیوں سے
وہ اپنی پیاس بجھاتا تھا
اور وہ وادیاں کہ جہاں وہ
اپنی اولاد کے لیے نئے مسکن بناتا تھا!
وہ زمیں۔۔۔ آدم کی وہ پیاری زمین۔۔۔
جھیلوں، پہاڑوں، جنگلوں
اور بستیوں سے آراستہ زمین
آدم کے بیٹے اس زمین کو
نابود کرنے والے ہیں
جو ہر شعلوں کے ملعون بھیانک الاؤ
آدم زاد کی مرصع بستیوں
اور آئینہ کی طرح سجے ہوئے
مرصع شہروں کے اوپر
ایک وحشیانہ رقص میں مصروف ہیں
مرے خدا!
اُف مرے خدا!
شائد آسمانوں پہ موجود روحِ آدم
غم زدہ آنکھوں کے ساتھ
اپنے بیٹوں کا نوحہ لکھنے کے لئے
قلم اور کاغذ ہاتھ میں لے چکی ہے!

وحید احمد

صوتی بے راہروی

لوگ تو مر جاتے ہیں
ہم کو مار کے
لیکن ان کے گھروں میں فون لگے رہتے ہیں
جب شہنائی کھانے کو آتی ہے
تو میں ان کو ٹیلیفون کیا کرتا ہوں
اک مایوس امید میں
شاید
تاروں کی لمبی دھاتوں میں
اُن کی گم گشتہ
زندہ
آوازوں کی تلچھٹ بیٹھی ہو
جو میری آواز کی شے پر
تاروں کے پیندے سے اُٹھ کر ساغر گوش میں بھر جائے
اور میں اک ٹائم مشین میں بیٹھ کر ناؤ نوش کروں

کل شب میں نے

اک گم گشتہ فون ملایا
''خاں صاحب ہیں؟'' میں نے پوچھا
ذرا توقف سے آواز آئی
''میں بول رہا ہوں !!''
بیٹے کی آواز میں اسی کے باپ کی تلچھٹ بیٹھی تھی
میں نے ساغرِ گوش میں وہ آواز بھری
پھر شب بھر ناؤ نوش کیا

وہ میری نظم بُنتی ہے

آ ؤ مل کر نظم بُنیں
دونوں کی اکلوتی نظم
نظم سنوں میں رس بھرتی
شریانوں میں ہوتی نظم
شبنم کے قطروں جیسی
اور پھر خون بلوتی نظم
دستک دیتی رہتی ہے
کروٹ کروٹ سوتی نظم
طاق بدن میں جلتی ہے
بن شعلے کے جوتی نظم
گاہے سر چکراتی ہے
دل کو گاہے ڈبوتی نظم
بجلی کے کوندے جیسی
چلتی نوک چبھوتی نظم

کان لگا کر سنتا ہوں
چپ چاپ ہنستی روتی نظم
ہاتھ لگا کر دیکھتا ہوں
تیرا جسم پروتی نظم
تیرے اندر مالا میں
ہو جاتے ہیں موتی نظم
تجھ میں جا گدرائی ہے
مجھ سے ہوتی ہوتی نظم

علاج بالمثل

نشتر زخم لگاتا ہے تو نشتر سے کھلواتا ہوں
سلواتا ہوں
پھنیر نیل اتارتا ہے تو منکے میں رسواتا ہوں
کھنچواتا ہوں
پانی گری گھولتا ہے
تو پانی کا ٹھنڈا پیالہ منگواتا ہوں
جب شب زندہ داری میں مے چڑھتی ہے
تو صبح صبوحی کی سیڑھی لگواتا ہوں
عورت پرکا دیتی ہے تو عورت کو بُلواتا ہوں
دکھلاتا ہوں
اک عادت کے گھاؤ پہ دوسری عادت باندھا کرتا ہوں
میں عورت کے زخم کے اوپر عورت باندھا کرتا ہوں

آرے

(فضل حسین راہی کے نام)

میرے اندر اندھا آرا چلتا ہے
برقی آرا
جس کے گونجتے دندانوں پر دھند چمکتی رہتی ہے
جو مس کرنے سے پہلے ہی
ریشے کاٹنے لگتا ہے
اس ہموار گھڑے شعلے کی مثل
جو چھونے سے پہلے ہی ہاتھ جلانے لگتا ہے
دل کے قتلے کٹ کٹ کر جب جگر کی چھت پر گرتے ہیں
تو شش کی باری آتی ہے

سانس کے گرتے پتے جب پتے کی کونپل ڈھانپتے ہیں
تو ریڑھ کی اینٹیں نرم پلستر چھوڑتی ہیں
اور کولہے کے پیالے میں ڈھیر لگاتی ہیں
ساتھ ہی مہروں کے سب قرض، ہوا میں اُڑنے لگتے ہیں
جن کے گرد
کٹی سانسوں کے ہالے شور مچاتے ہیں

اک دن آرا عمل میں تھا
جب میں نے اک دیرینہ یار کو گلے لگایا

اُس نے کہا'' کیوں گونج رہے ہو؟''
میں نے جواباً عرض کیا۔

''تیرے اندر بھی تو گونج برستی ہے!
اے میرے لرزیدہ یارِ غار بتا
تیرا آرا برقی ہے یا دستی؟؟''

علی محمد فرشی

ریت

تیرے آتش فشانوں سے بہتے ہوئے
سُرخ سیلاب کی پیش گوئی
اولمپس کے آتش کدے میں
پرومیتھیس اور اگنی کا سمبندھ ہونے سے پہلے
بہت پہلے تاریخ کے غار میں ایک
یک چشمے عفریت نے اس کہانی میں کی تھی
جسے پڑھ کے خود اس پہ دیوانگی کا وہ دورہ پڑا
خود کو اندھا کیا
پھر سناتا رہا داستاں اندھی طاقت کی
بربادیوں پر رلاتا رہا
آنکھ سے سات ساگر بہے
ریت لیکن ہمیشہ کی پیاسی
بجھاتی رہی، آنسوؤں سے مرے، پیاس کی آگ کو

تو نہیں جانتا ریت کی پیاس کو
ریت کی بھوک کو

ریت کی بھوک ایسی کہ جس میں سما جائیں
لوہا اُگلتے پہاڑوں کے سب سلسلے
پیاس ایسی کہ جس میں اُتر جائیں
سارے سمندر
ترے آنسوؤں کے!

مگر تیرے آنسو ٹپکنے میں کچھ دیر ہے
دیر کتنی لگی
ہاتھیوں کی قطاروں کو
زیرِ زمیں
تیل اور تار بننے کی میعاد سے خوب واقف ہے تو
تو اسی تیل کی بو پہ پاگل ہوا
اور دھمکتا دھڑپتا ہوا
آ گیا ریت کے راج میں
وقت کے آج میں
وقت کا آج تیرا ہے جس میں
مریخ و مرانخ سے آگے رسائی ہے تیری
مگر ریت تو پر نہیں، طاقت پر نہیں، دیکھتی
پاؤں کو تولتی ہے
کسے سولتی ہے!

قیوم ناصر

جواز

دانت کر یکنے والے لوگوں سے ذہنی دوری
ہماری جسمانی اذیتوں کا سبب ٹھہری
ایک لمحے مسکرانے اور دوسرے لمحے آنسو بہانے والے لوگ
آؤٹ ڈیٹڈ سمجھے جاتے ہیں
جھوٹ ہماری گھٹی میں
اور سچ ہونٹوں کا زیور بنا
تم نے میرے دائیں بازو پر دانت گاڑے تھے
مگر اُن کے زخم میرے بائیں بازو پر نمایاں ہوئے
دیکھو! میں تم سے محبت کا اظہار اس لئے نہیں کرتا
کہ کہیں تم مجھے قسمیں کھانے پر مجبور نہ کرو
اور آنکھوں کا آنکھوں سے اور دل کا دل سے
کوئی تعلق ہو تو ایسے سوچا جا سکتا ہے
اگر کوئی ایسی قربت نہ ہو
تو نفرت کا جواز ڈھونڈنے میں
عمر بیت سکتی ہے
میں اور تم

دنیا کی نظروں سے اپنا تعلق چھپاتے چھپاتے
بڑھاپے کی دہلیز پر سجدہ ریزی کر رہے ہیں
واپسی ناممکن ہے
اور ٹریفک کی بتّی سبز ہونے میں چند لمحے باقی ہیں
آؤ اتنی دیر میں
اپنی اپنی کھال اُتار کے اک دوسرے کو دے دیں
نفرت کا جواز میری اور تمہاری مٹھیوں میں ہونا چاہیے
کیا خبر کب کوئی ہم سے
ہمارے ہی بارے میں پوچھ لے

رفیق سندیلوی

بڑا چکر لگائیں

کسی دن آ
پرانی کھائیوں کو پار کر کے
دلدلوں میں پاؤں رکھیں
نرسلوں کو کاٹ ڈالیں
پیش منظر کے لئے رستہ بنائیں
آ کسی دن
دھند میں جکڑی ہوئی
کانٹوں بھری یہ باڑھ
جس میں وقت کی بجلی رواں ہے
جو زمین و آسماں کو
کاٹتی ہے
بیچ سے
اُس کو ہٹائیں
آ کسی دن
جھولے جھولتے پُل سے اُتر کر
نقشۂ تقویم میں

پُر پیچ کہساروں کے اندر
گھومتی بل کھاتی ندی میں
غوطہ زن ہوں
تیرتے جائیں
کسی دن آ
بڑا چکّر لگائیں!

میں اُس کا ہوں

میں اُس کا ہوں
جو میری آگ ہے
اور میرا دریا ہے
جو بارش کے تقاطر میں
ازل سے جھلملاتا ہے
لپکتے سرخ رو شعلوں میں
جس کا سانس جاری ہے
جو نوری ہے نہ ناری ہے
جو آدھی شب کے گم گشتہ اُفق پر
میرے حاضر کا ستارہ ہے
میں اُس کو اپنی تاریکی کے دل میں
اپنے محمل میں
بُلاتا ہوں
میں اُس کا ہوں

پُر پیچ کہساروں کے اندر
گھومتی بل کھاتی ندی میں
غوطہ زن ہوں
تیرتے جائیں
کسی دن آ
بڑا چکر لگائیں!

میں اُس کا ہوں

میں اُس کا ہوں
جو میری آگ ہے
اور میرا دریا ہے
جو بارش کے نقاطر میں
ازل سے جھلملاتا ہے
لپکتے سرخ رو شعلوں میں
جس کا سانس جاری ہے
جو نوری ہے نہ ناری ہے
جو آدھی شب کے گم گشتہ اُفق پر
میرے حاضر کا ستارہ ہے
میں اُس کو اپنی تاریکی کے دل میں
اپنے محمل میں
بُلاتا ہوں
میں اُس کا ہوں

میں اُس کا ہوں
جو میری خاک ہے
اور میرے کوچے کی ہوا ہے
جو سُبک قدموں سے آتا ہے
زمانی سیڑھیوں پر
لرزۂ نامحری میں
ڈگمگاتا ہے
اندھیرے میں
جو اپنے جسم خوش پوشاک کو
سب سے چُھپاتا ہے
میں اُس کو پردۂ بے پردگی میں دیکھتا ہوں
میں اُس کا ہوں!

جو سڑک صدیوں سے میرے ساتھ تھی

جوارِ ہست میں
سانسوں کی صورت
آمد و شد کے رُخوں پر
ہر بلند و پست میں
چکر لگاتی
خم بناتی
قوس میں مُڑتی
مسلسل دشت و صحرا چھانتی
شہروں، مضافاتوں، پلوں

سُنسان رستوں سے گزرتی
اپنی ناہموار اور ہموار
دنیاؤں کے گہرے دھیان میں
دم توڑنے والی چڑھائی پر
کبھی قابو سے باہر سر پھری ڈھلوان میں

چپ چاپ
اپنے طول کے لامختتم آثار میں
تاریخ کے ادوار میں
اک غار میں
کژدم کی صورت رینگتی
ہرنی کی صورت چوکڑی بھر کے
اچانک اپنے کہنہ کولتار
اور زنگ کی ماری ہوئی بجری سے ڈر کے
ایک دم بارِ عناصر سے بکھر کے
کثرتِ اجزا میں
جانے کس خلا میں
رجعتِ تقویم میں
یا پھر زماں کے ارتقا میں
پاؤں کے تلوؤں کے نیچے سے نکل کر
کھو گئی ہے
جو سڑک صدیوں سے میرے ساتھ تھی
نظروں سے اُوجھل ہو گئی ہے!

مجھ سے کچھ مت کہو

مجھ سے کچھ مت کہو

یہ سماعت ابھی
ان سُنی کے شرابور رستے میں ہے
ایسے دستے میں ہے
جو کسی چپ کے
گھیرے تعاقب میں
چلتے ہوئے
رُخ بدلتے ہوئے
بڑھ رہی ہے
کہ جیسے کوئی آبجو
جیسے شریان میں

سر پھرے جنگجوؤں کا لہو
جیسے چلّے سے نکلا ہوا تیر ہو
مجھ سے کچھ مت کہو
یہ سماعت ابھی
سننے والے گروہوں میں شامل نہیں
اک عجب ناشنیدہ
صداؤں کے دستے میں ہے
اَن سُنی کے شرابور رستے میں ہے!

قدیمی کھیل میں

قدیمی کھیل میں
بازی لگی تھی جان کی
دونوں کھلاڑی دوڑ گے تھے
اور مکمل دو غلے تھے
دو دھڑوں سے ایک سر کا
ایک دھڑ سے دوسروں کا
بوجھ اُٹھائے
اجگروں کا
پنترے پہ پنترا کھاتے تھے
داؤ پر نیا داؤ لگاتے تھے
مری تلوار کی جھنکار پر
اک قوس میں دیدے گھماتے تھے
پاؤں سے مٹی اُڑاتے تھے
فریبی چال چلتے
مُسکراتے تھے
ازل کے جابر و قاہر
وہاں میدان میں
بس دو ہی دو تھے
جنگ کے ماہر
تن تنہا تھا میں
اپنا بچاؤ کر رہا تھا
اُن کی پھرتی دیکھ کر

اندر ہی اندر ڈر رہا تھا
ڈر کی تہہ میں
جیسے اک آتش فشاں تھا
کھیل کا میداں تھا
جو سارے کا سارا ڈولتا تھا
ڈولتے ہی ڈولتے
بس ایک گہرے موڑ پر
یکبارگی میں نے دو دستہ وار سے
اُن کے سروں کو کاٹ ڈالا
اب وہاں میدان میں
بس ایک سر تھا
تین دھڑ والا
یا شاید ایک دھڑ تھا
تین سر والا
بھیانک راکھشس
تنہا کھلاڑی!

اگر میں واقعی غائب ہوا ہوں

ایک شب میں
گھومتی کرسی پہ بیٹھا تھا
سفیدی اور سیاہی میں گھری
رنگوں بھری سکرین کے آگے
اُفق پر

دھیرے دھیرے
اک سنہری ریشمیں تصویر
بے صوت وصدا
اپنے ہی اجزا کے تحیّر میں
عموداً کھل رہی تھی
سیدھے کونے میں
کسی دُنیا کا نقشہ
چوکھٹے میں
عاجلانہ سی روانی سے
مسلسل گھومتا تھا
ایک کھڑکی میں نئی کھڑکی
نئی کھڑکی میں
آگے اور کھڑکی
کھڑکیوں کا سلسلہ تھا
مرکری لہروں میں
کتنے پیکروں کا
رس بھرا
مخلوط و مدغم رقص تھا
اس رقص میں
اک شخص تھا
جو چند لمحے قبل تو
اس گھومتی کرسی پہ بیٹھا تھا
مگر اب وہ بھی غائب ہو گیا تھا
جس جگہ پر

وقت اور تاریخ

دونوں ہی نمایاں تھے

وہاں

یا پھر کہاں
تحلیل کی کس سمت میں

کچھ کہہ نہیں سکتا

اگر میں واقعی غائب ہوا ہوں

تو سفیدی اور سیاہی میں گھری

تصویر کا سایہ

زیادہ دیر تک
رنگوں بھری سکرین کے نقطوں میں
قائم رہ نہیں سکتا!

مقصود وفا

اپنے حجر میں

کون سے گھر میں ہو تم!
میری کسی کھوئی ہوئی خواہش میں
تم
جو اس وقت مرے جسم کی حدت میں گھلی جاتی ہو
اپنا یہ ہاتھ مرے ہاتھ میں دو
آگ سینکو کہ جسے سرد ہوئے پندرہ برس ہونے لگے
پندرہ برس!
سینکڑوں میل کے یخ بستہ کسی فاصلے پر
وہ ترے نقش جو دھندلا بھی چکے ہوں گے
مگر آج بھی لو دیتے ہیں
دھند میں لپٹی ہوئی دوری پر
جل بجھے خواب کی ویرانی میں
راکھ جب جگہیں بدلتی ہے تو آنچ آتی ہے
روشِ وقت یہ کیا فاصلے گزرے ہیں مجھے یاد نہیں
میں کسی کنج تمنا میں بسر ہوتا رہا
اور مرے خواب کا سایہ

(جو کبھی جسم بھی تھا)

مڑ گیا مڑتے ہوئے زینے پر آہستہ خرام
ہو گیا میری تنگ و تاز معیشت میں تمام
کرم خوردہ سے شب و روز کے اُوراق اُٹھاتا ہوں تو لگتا ہے مجھے
یہ محبت!
جو لہو بن کے رگ و پے میں دھڑکتی تھی کبھی کی ہی نہیں
اب مرے واسطے تم یوں ہو کہ تم تھیں ہی نہیں
تم!
جو اس وقت مرے جسم کی حدت میں گھلی جاتی ہو

خاور اعجاز

اِستدعا

زمانے!
غم زندگی کے الاؤ میں جلتے
ترے ہجر صحراؤں میں چلتے چلتے
میں اب خاک ہونے کو ہوں
ایک بھیدوں بھری نیند سونے کو ہوں
جسم پنجرے میں جب اک پرندہ پھڑکتا ہے
دل اس طرح سے دھڑکتا ہے
جیسے کوئی زلزلہ آنے والا ہے
لگتا ہے تو بھی مکر جانے والا ہے
میری طرف دیکھ
میں نے وہی روشنی اُوڑھ رکھی ہے
تو نے جو روزِ ازل مجھ کو تن ڈھاپنے کے لئے دی
میں اب تک اُسی ہالۂ نور میں چل رہا ہوں
مگر جل رہا ہوں
کہاں پاؤں رکھوں
کہ نیچے زمیں تانبہ بنتی چلی جا رہی ہے

جہنم میں ڈھلتی چلی جا رہی ہے

زمانے!
اگر کوئی جنت نہیں ہے ہمارے لئے
اپنا کوئی عمل بھی اطاعت کے زمرے میں آتا نہیں
تو ہمیں بھی خدا کی قسم تیرا برتاؤ بھاتا نہیں
اے زمانے!
اسے میرا شکوہ ہی جانو
مگر اک مری بات مانو
مرے آنسوؤں کو کبھی اک صحیفے میں ڈھالو
تو جانو
یہ خاموش فریاد سے پُر ستارے
کہاں گر رہے ہیں
یہ بادل نہیں تیرے آکاش پر میرے نالے ہیں
جو غم کی بوندوں کو دل میں لیے پھر رہے ہیں
کہ دھرتی تو اپنی ہی خوشیوں میں ڈوبی ہوئی ہے
اسے ان کی کوئی ضرورت نہیں ہے
زمانے!
ترے نقش کون و مکاں کے
بشارت بھرے حرف چھو کر بھی دیکھے
مگر خواب کا قفل کھلتا نہیں ہے
سرا اس کا کوئی بھی ملتا نہیں ہے
چراغِ دُعا ٹمٹمانے لگا ہے
مجھے خود سے بھی خوف آنے لگا ہے

کہ سپنے میں ٹھہرا ہوا عہد گل ختم ہوتا ہے
ساحل پہ بیٹھا ہوا اک سمندر ہے جو خود کو روتا ہے
اس کو اُسی بچھڑے صحرا کا راستہ دکھا دے
کوئی اضطراب اس کے دل میں جگا دے
نیا ایک طوفان اس کی تہوں سے اُٹھا دے

کہاں رکھا ہے اپنا آئینہ میں نے

بہت بدلی ہوئی حالت مجھے محسوس ہوتی ہے
بدن پر اک لبادہ چیتھڑوں کی شکل میں لپٹا ہے
عزت کے سبھی ٹانکے اُدھڑتے جا رہے ہیں
اور میرا جسم عُریاں ہو رہا ہے
جسم اور ان چیتھڑوں کے درمیاں جو فاصلہ ہے
دن بدن تیزی سے بڑھتا جا رہا ہے
.اور مرے اندر جو اک تہذیب کا رشتہ ہے
کٹتا جا رہا ہے
میرے چہرے پر گُزرتے موسموں نے
جانے کیا تحریر کر ڈالا ہے
مجھ کو اپنی صورت بھولتی سی جا رہی ہے
لاؤ تو دیکھوں
کہاں رکھا ہے اپنا آئینہ میں نے!

جواز جعفری

زیتون کی شاخ سے اُٹھتا دُھواں

جنگ
ہمارے سروں پر پھڑ پھڑاتی ہے
اور موت کا الہ دین
چراغ ہاتھ میں لئے
ایک اشارے کا منتظر!
زیتوں کی شاخوں سے اُٹھتا دھواں
اندھے
ناکارہ
اور ٹوٹے پھوٹے جسموں کا انبار
ہماری آنکھوں کی لوح پر لکھ دیا گیا!
میں زمین کے سینے پر کھینچی
بانجھ لکیروں پر
زندگی
آزادی
اور امن کے پھول بو رہا ہوں!
"امن بذریعہ جنگ"

اسلحہ فروشوں کی سازش ہے
جنگی قوتوں کا ایک دوسرے سے
حیوانی رشتہ ہے!

علم ہمیں ہلاک کر رہا ہے

ایک پھٹے پرانے خواب کا کونا تھامے
ہم فٹ پاتھ تک آ پہنچے

شورزدہ شہر کی بے حس گلیوں میں
ہم ایٹم بم کو
آدھا نیچے اور آدھا، اُوپر اوڑھے
اپنے کشکول بدست بازو پر سر رکھے
بے خبر سو رہے ہیں!

چاروں اور لہلہاتی بھوک کے درمیان
ہمارے بلکتے بچے
روزانہ دور مار میزائل چاٹ کر
حُب الوطن کے بوسیدہ ٹاٹ پر سو جاتے ہیں!

ناف کو چھوتی جہاد پیشہ زبانیں
اسلحہ پرستوں کی نمائندگی پر کمر بستہ ہیں
زندگی
محبت

اور آزادی کا نمائندہ کون ہے؟

ہمارا ہنر
ہمیشہ ہتھیاروں کو بہتر بنانے میں صرف ہوا
علم ہمیں ہلاک کر رہا ہے!

غلام حسین ساجد

نیند میں چلتی ہوا

ڈھونڈتی ہوگی اُسے!
ڈھونڈتی ہوگی مجھے!
میں کہ نخچیرِ طلسمِ دوش ہوں
میرا ملنا آج بھی مشکل نہیں
میرے خال و خد، مرا ملبوس، میری گفتگو
آج بھی ویسی ہے جیسی چند عشرے پیشتر تھی
میں اُسی بے مائیگی سے جی رہا ہوں، سانس لیتا ہوں
انہیں پھولوں، پرندوں، گلعذاروں، اور چراغوں کے اساطیری اُجالے میں
اُنہی گلیوں، فضاؤں، خاکدانوں سے گزرتا ہوں
جہاں میرے قدم مٹی کے گدلے لمس سے واقف ہوئے تھے
جہاں میری نگاہوں پر کتابِ حاضر و غائب کھلی تھی
جہاں میری زباں نے لفظ چکھے تھے

کسیلے لفظ، جن کو تھوکنے کی آرزو میری لہو میں آج بھی موجود ہے لیکن بہت دن سے مجھے ان بے ثمر لفظوں کی سنگت میں عجب کچھ لطف سا آنے لگا تھا سو میں ان سے دور ہونے کا تصور بھی نہیں کرتا مبادا یہ چراغ و آئینہ میرے لئے بے سود ہو جائیں، مرے کہنے، مرے سننے کی طاقت کھو نہ جائے میں اپنے آپ

سے موجود سے اور غیب کے اسرار سے معمور دنیا سے کہیں محروم ہو جاؤں!
جہاں میرے لہو میں خوف نے اک بے ردا کابوس کی بنیاد رکھی تھی
مرے اطراف میں پھولوں، پرندوں اور چراغوں کے اساطیری حوالے
آج بھی میری بصارت کے لئے انمول تحفہ ہیں
ابھی تک کچھ نہیں بدلا

ہاں! یہی مٹی ہے جس پر میں نے اپنے نقش پا چھوڑے تھے
فردا کی درخشاں صبح کا منظر تراشا تھا
ابھی تک کچھ نہیں بدلا

ابھی تک کچھ نہیں بدلا
تو کیوں یہ نیند میں چلتی ہوا بے صبر ہے اتنی
مجھے پانا، مجھے مس کر کے میری روح کے پاتال میں خفتہ محبت کو ہوا دینا
بہت آسان ہے اب تک
تو یوں بے صبر رہنے کی ضرورت کیوں!
اسے مجھ سے نہیں شاید اُسی بے مہر سے ملنے کی خواہش ہے
جسے میں کھو چکا ہوں
وقت کی اندھی گلی میں
جس نے فردا سے گلے ملنے کی خاطر مجھ سے ناطہ توڑنے میں عافیت محسوس کی تھی
اب بھلا اُس کا پلٹ پانا کہاں ممکن؟
جانتا ہوں نیند میں بہتی ہوا
ڈھونڈتی ہے اب اُسے
کاش وہ اتنا سمجھ پاتی!
جسے فردا کی تاریکی نے نگلا ہو

اُسے ماضی کے اجلے خاکداں پر پاؤں دھرنے کی اجازت مل نہیں سکتی
اجازت مل بھی جائے تو پلٹنے پر کوئی شے
اپنی حالت، اپنی کیفیت پہ قائم مل نہیں سکتی
زمانوں کے قدم واپس پلٹنے کو نہیں اُٹھتے!

اشرف یوسفی

نئے موسم کی نوید

اُداسی اُوڑھ کر سونا کہاں کی زندگی ہے

اٹھو

اٹھو، اٹھ کر ذرا کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھو

سحر کی شاخ پر پہلے پرندے کی صدا چہکار میں

بدلی ہوئی ہے

ہوا کے قافلے باہر گلی میں منتظر ہیں

کواڑوں پر جھکی بیلوں کے پلّو خوشبوؤں سے

بھر گئے ہیں

نئی رت آنگنوں تک آ گئی ہے

ذرا ماتھے سے بالوں کو ہٹا کر دھوپ کو

تھوڑا سا رستہ دو

پہاڑوں پر جمی چاندی سرکنے دو

نئی رُت آ گئی ہے

روشنی کی فصل پکنے دو

ایک بے نام رفاقت

نظم اُس کے لئے
جس کا کوئی نام نہیں
حرف اُس کے لئے
جس سے کوئی کام نہیں
جس کے سائے میں مری صبح نہیں شام نہیں
میری اک راہ سے
ٹکراتا ہے رستہ اُس کا
اُس کے پیکر کی بکھرتی ہوئی
ساحر خوشبو
باندھ لیتی ہے مرے پائے سفر کو
پل بھر
بھول جاتا ہوں
کسی رنج فرداں کی چبھن
روشنی آتی ہے اک روزن در سے پل بھر
شام کا سلسلہ ملتا ہے
سحر سے پل بھر

اقبال نوید

شجر اپنی زمین جب چھوڑتے ہیں

سبھی کچھ تھا
جسے ہم چھوڑ کے گھر سے نکلنے کے لئے بے تاب رہتے تھے
سبھی کچھ تھا
مگر ہم یہ سمجھتے تھے
کہ اپنے واسطے اس سرزمیں پر کچھ نہیں رکھا
درودیوار اندر سے قفس معلوم ہوتے تھے
محبت اور نفرت تھی
جو اپنی تھی
ہوائیں، بارشیں، موسم
سبھی وہ کچھ جو ہر اک شخص کو قدرت سے ملتا ہے
وہ ہنگامے جنہیں آنکھیں ترستی ہیں
وہ اپنے لوگ
جو اب آنسوؤں کے گھر میں رہتے ہیں
مگر اس وقت جب ہم سانس بھی لیتے
گھٹن ایسی کے جیسے دم نکلتا ہو
یہی لگتا تھا

جیسے اجنبی لوگوں میں زندہ ہیں
ہمیشہ خواب کی دہلیز پر بیٹھے ہوئے یہ سوچتے رہتے
کہ اپنی آنکھ جب کھولیں
تو منظر ہی بدل جائے
کسے معلوم تھا
منظر بدلنے سے وہی کردار رہتے ہیں
وہی دیوار رہتی ہے
وہی زنجیر پاؤں میں
وہی تصویر آنکھوں میں
نگاہوں میں وہ سب کچھ ہے
کہ جب سرسبز شاخوں پر ہمیشہ پھول کھلتے تھے
خزاں کی رُت میں بھی اک تازگی محسوس ہوتی تھی
مگر اب زندگی کاغذ کے پھولوں اور خوشبو کانچ کی بوتل کے اندر قید ہم پر
مسکراتی ہے
ہمارے ہاتھ خالی ہیں مگر ذہنوں میں گزرے روز و شب کی ایک البم ہے
خبر کیا تھی
شجر اپنی زمیں جب چھوڑتے ہیں
سوکھ جاتے ہیں

فرخ راجا

ورکنگ لیڈی

وہ منظر دیکھنے والے
جنہیں آفاق کی رونق کہا جائے
نہیں دیکھے
جنہیں رس گھولنے سے کچھ تعلق تھا
وہ نغمے، سُن نہیں پائے
لبوں پر تھیں
مگر کتنی ہی باتیں کاغذی کشتی کی صورت بہہ گئیں
منہ زور پانی میں زمانے کی
بجھے خوابوں، سسکتے موسموں، بے زار چہروں کی کہانی
ختم ہونے ہی نہیں پاتی
سفر منزل سے خالی ہیں
جو ملتے ہیں وہ جملوں کی پرانی پوٹلی
ہمراہ رکھتے ہیں
جسے تبدیل کرنا اُن کے بس میں اب نہیں شاید
ہوا بھی ساحلوں سے آ کے ٹکرائے تو موسم
بانجھ رہتے ہیں

ذرا سی روشنی
گھر کے اندھیروں میں کہاں تک نور پھیلائے؟

مرے ساتھی!
مرے جذب محبت کو
تری بے چین اور نازک طبیعت
زندگی کے بوجھ کے نیچے
مسلسل سسکیاں لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے
میں آنکھوں کے دریچوں سے تمہیں
کب سے بلاتا ہوں؟
کہ باہر چاندنی راتیں ہماری راہ تکتی ہیں
سخن
سنسان رستوں میں
تری آواز کے اُڑتے پرندوں کے تعاقب میں
برہنہ پا سفر میں ہے
یہ ملنا کیسا ملنا ہے؟
کہ جس سے دُوریاں بڑھتی چلی جائیں
وہ آنکھیں کیسی آنکھیں ہیں؟
جو جذبوں کے کُھلے اوراق کو پڑھنے سے قاصر ہیں
یہ کمرا کیسا کمرا ہے؟
جہاں آ کر
تھکے ہارے ہوئے جسموں کو
بے سُدھ ہو کے سونا ہے
کہ اگلی صبح پھر دفتر کو جانے کے لئے تیار ہونا ہے!

آیتیں تفسیر کے بازار میں

علم کے مندر میں دیکھیں، آئینوں کے درمیاں
حیرتوں کے دیویاں
خواب اور اُمید کے روشن ستاروں کا سفر
کچھ گماں کے فاصلے
کم نہ جن سے ہوسکیں
منزلیں دشت زماں کی
مکاں کے یا مکاں کے فاصلے
جو ملا وہ ذات کی مسجد کے حجرے میں کہیں
اوڑھ کر رنگین قبا
افتخار و کبر کی پہنائیوں میں کھو گیا
دامن حرص و ہوس میں لفظ بے معنی ہوئے
آیتیں تفسیر کے بازار میں
زینت نوکِ سناں
ناتواں ہے جسم علم و آگہی
حلقۂ زنجیر میں
خیر کے بے بس مجسم قافلے
ناقہ ہائے بے کجاوہ پر سوار
ہاتھ مجبوری کی رسی سے بندھے
کچھ تو ہے!
جو عقل سے ہے ماورا
آنکھ کی حد سے پرے

کیا مرا ذوقِ سماعت کج نہیں؟
پھر مری تخلیق کے اوصاف گنوانے کا مطلب کیا ہوا؟
بس یہی؟
ناتوانی، بے بسی
اور من میں رقص کرتی سرکشی
بے قراری، بے یقینی کارواں اک قافلہ
گنبدِ افکار میں
گونجتی ہے آج بھی جس کی صدا!

ارشد معراج

اتھوپیا کے باسی کا سپاسنامہ

چکا چوند ہے
آنکھ خیرہ ہوئی جا رہی ہے
سورج میاں!
اب تمہاری ضرورت نہیں
بستر لپیٹو......
کہ لیبارٹری میں بہت ہیں
تمہاری طرح اوندھے لیٹے ہوئے
ارتقاء کے محل کی کھلی کھڑکیوں سے ہوا آ رہی ہے
جو پیغام ہر پل نئے لا رہی ہے
محبت کا یہ کھیل ہے
محبت میں ہی یہ برستے گرجتے
دھواں دھار شعلے اُڑاتے ہوئے
اُڑ رہے ہیں
یہاں سے وہاں تک
وہاں سے وہاں تک
سمندر کی ویلیں ہوں یا شارکیں

سبز کچھوے، مگر مچھ
انہی کی محبت سے محفوظ ہیں
میری اوقات کیا
میں رہوں ناں رہوں
میں جو ہوں تو فقط اُن کا ممنون ہوں
ورنہ مجھ سے کڑوڑوں بنانا تو اب کوئی مشکل نہیں

زمیں زاد

وہی ابتداء
وہی فاصلے
مرے روبرو مرے راستے
میں جہاں رہا میں وہاں نہ تھا
وہی کھینچ کر مجھے لے گئے تھے
فرات و دجلہ کے نام پر
جو سوار آئے تھے دور سے
مری فصل ساری وہ کھا گئے
مرے نام جو بھی رقم ہوئے
مری اصل کیا تھے وہ رابطے......؟
مرے تن بدن
مرے نطق کے جو تھے ذائقے
وہ کہاں گئے......؟
جو زمیں سے پاؤں اُٹھا لئے
تو یہ خاک کیسے پناہ دے

مری راہ کیسے پڑی رہے
میں ہوں دم بخود کروں کیا مگر
مرا سرنگوں کھلے آسماں
میں غلام تھا میں غلام ہوں
تری تیز آنکھوں کے پانیوں میں جو بہہ گیا
جو الاؤ تھا وہ بھی بجھ گیا
مری شام نگری میں شام ہے

زاہد حسین

HERMAPHRODITE

اُس کو شک تھا
خدا نے دو آدھے جسم عموداً جوڑ کے
اُس کو تعمیر کیا ہے
جس میں اک حصہ اپنا اور ایک پرایا ہے
وہ آدھے آدھے دو جسموں کا حامل ہے
وہ اکثر رات کے کالے چہرے سے ڈر جاتا
تو اپنی ہی گود میں چھپ کر رونے لگتا
خود سے باتیں کرتا
دیواروں سے سر ٹکراتا
اپنی تکمیل کی خاطر
دونوں آدھے جسموں کو
بستر پر تنہا چھوڑ کے
اپنے اصلی حصے کی تلاش میں کھو جاتا
لیکن خالی ہاتھوں کو جب
دوزخ کی جانب لٹکائے واپس آتا
تو گیلے بستر پر
اپنی ہی گردن میں بازو ڈالے

خود سے لپٹ کر سو جاتا

نارسائی کا پُل

تصویر کے دونوں رُخ کالے تھے
اگلا۔۔۔اور پچھلا بھی
خوف کی مکڑی آنکھوں میں جالا بُنتی
جاتی تھی
سب کچھ۔۔۔دھندلا کرتی جاتی تھی
میں نے جب بھی تقدیر کے سینے پر ہاتھ رکھا تھا
اِس کو مُردہ پایا تھا
ہاتھوں پر اُبھری خون کی شریانیں۔۔۔
مہندی کا تاثر تھیں
رات کی پاکٹ میں جو بھی خواب چھپایا تھا
اب باسی تھا

ذہن کے ہر خلیئے میں خوف بھرا تھا
مجھ کو کس کا بستر گرمانے کو بھیجا جائے گا
رسموں کے کن باٹوں میں تولا جائے گا
میں جب بھی بابا سے قسمت کا رونا روتی تھی
وہ آنکھیں موند کے کہہ دیتا تھا
"رشتے تو اوپر بنتے ہیں"

رنگوں کی حقیقت

جہاں سے بات چلتی ہے
وہیں پر آ کے رُکتی ہے

کہ رنگوں سے بنی ہے
ہر پرانی اور نئی تخلیق
ہر اک زندگی اور موت
ان کے درمیاں ہر چیز
زندہ اور مردہ۔۔۔
زمیں اور آسماں کے راز
پانے والی آنکھیں بھی
حقیقت اور خوابوں کو
ملانے والا راستہ بھی
تمہیں معلوم ہوگا!
کہ جب دو رنگ ملتے ہیں
نیا اک رنگ بنتا ہے
یہی اک قاعدہ ہے
جس پہ سب کچھ خلق ہوتا ہے
میں کہتا ہوں
کہ بے رنگی بھی اپنا رنگ رکھتی ہے
تمہاری اور میری زندگی دو رنگ ہیں
اور دو الگ رنگوں کا حاصل ہیں
ہمارے ملنے سے جو رنگ پیدا ہوگا

ہم سے مختلف ہو گا۔۔۔۔۔!
نئی تخلیق کی پوری صلاحیت کے ساتھ

ذات کے مرکزِ ثقل پر

مجھے دیوار کے دونوں طرف واضح
دکھائی دے رہا ہے
یہ دنیا اب کھلا میدان لگتی ہے
جہاں پر سرحدیں فرضی ہیں ساری
مری راتیں طمانیت سے خالی ہیں
میں سوتا ہوں تو دروازے سے خدشوں کی
کئی آنکھیں مسلسل جھانکتی ہیں
خواب سارے بستروں کی سلوٹوں میں کھو گئے ہیں
اب تو نیندیں بھی حقیقت کا اشارہ ہیں

جو ہونا ہے
جو آگے ہونے والا ہے
آنکھ کی سکرین پر پھیلا ہوا ہے
جسم میں اب خون نہیں
اِک خوف گردش کر رہا ہے
میں تنہا رہ گیا ہوں
یہاں پر آدمی جنگل بنائے
صنوبر کے درختوں کی
طرح پھیلے ہیں جن کا اِرتقاء
گردن کے لمبے ہونے میں ہے

اور پاؤں تو زمین نے باندھ رکھے ہیں
آنکھ کی حدّ میں کوئی انسان اب باقی نہیں ہے
میں تنہا رہ گیا ہوں
سوچتا ہوں
کہاں جاؤں؟
یا مر جاؤں..................!

قاسم یعقوب

بدن کی تعمیرِ نو

اندھیرے میں پڑی مٹی میں پانی
روشنی کی بوند کی خواہش میں ملتا ہے
کیمیائی خواب کتنے اہتمام انگیز ہوتے ہیں
بھٹکتی خوشبوؤں کو جمع کرتے ہیں
پہاڑوں پر پڑی بینائیوں کی وسعتوں کو
جوڑ کر ترتیب میں رکھتے ہیں
اور آنکھیں بناتے ہیں
یہ کیسا چاک ہے
جو اپنے پہلے دائرے کو پانے سے پہلے
ہی اپنے نقش کی تکمیل پاتا ہے
یہ گانے والیوں کو کون لاتا ہے
مجھے اُس نے بتایا ہے
کہ ماتھے سے پسینہ بہہ رہا ہے
بُو بدن میں بھر رہی ہے
اپاہج حرکتیں تعمیر کا ملبوس
پھر خود پر پہنتی ہیں

تھوک منہ بھر کے نگلتا ہوں
ابھی تک اپنا بے حس جسم
اپنے کوزہ گر ہاتھوں میں رکھ کر
ازل سے جاری پیدائش میں زندہ ہوں

برگد سے واپسی

وہ بچی گمشدہ حیرت سے آثار قدیمہ والا صفحہ کھول کر
اسکول کی بک پڑھ رہی ہے
اُسے معلوم ہی کب ہے
جسے نروان ملتا ہے
وہ صدیاں اُوڑھ کر صفحوں میں بڈھا بن کے رہتا ہے
وہ پڑھتے پڑھتے جب تصویر پر نظریں جماتی ہے
تو اس کو آنکھ کے حلقوں میں مردہ خواہشوں کی
زردیاں محسوس ہوتی ہیں
گھنے برگد کے سائے میں پڑے رہنے سے
اس کی گال پر سورج کا بوسا ہی نہیں ہے
اس کے سر کے بال کی سب تازگی جنگل کے سبزے میں پڑی ہے

اُسے بدھا پہ رحم آیا
وہ بچی ہاتھ میں پنسل پکڑ کر سوچتی ہے
اور پھر تصویر کے اُوپر
لکیریں کھینچ کر مونچھیں بناتی ہے
اور اس تبدیلی سے اندر ہی اندر مسکراتی ہے

کہ جیسے اس نے "دانش" کی سبھی کمزوریاں
اپنی لکیروں سے چھپا دی ہیں
اُسے معلوم ہی کب ہے
کہ اُس کے ہاتھ کی جنبش نے اندر کی
سبھی آلائشیں چہرے پہ رکھ دی ہیں
وہ جن کو جسم سے آزاد کر کے ایک عرصے سے تیا گی تھا
اب آثار قدیمہ والے صفحے پر
دنایا اور ستا کے
کوئی مفہوم ہی باقی نہیں ہیں
ذرا مونچھیں بنانے سے سبھی دکھ مٹ گئے ہیں
مارگ کی کوئی ضرورت ہی نہیں
بدھا کپل وستو کا شہزادہ دوبارہ بن گیا ہے

ایک کتبے کی تلاش میں

ہواؤں کے تعاقب میں
میں اک تتلی سے ٹکرا کے زمیں پر گر پڑا ہوں
پروں کی گدگداہٹ سے
مرے ماتھے سے خوں بہنے لگا ہے
لہو روکوں
کہ اپنی پیاس پر اپنی توجہ مرتکز رکھوں
حلق کو میں
اب کنویں کی شکل کیسے دوں
مجھے یکسانیت سے خوف آتا ہے

زیادہ دیر اک ہی کیفیت میں زندہ رہنا کتنا مشکل ہے
چلو پھر حسرتوں کی نوحہ خوانی میں چھپے جوذائقے ہیں
ڈھونڈتے ہیں
میں اُڑ سکتا ہوں
لیکن میری بے تابی کو جانے کونسی موجِ ہوا آغوش میں لے گی
میں تھک کے بیٹھ سکتا ہوں
مگر ساری زمیں میرے لیے اُونڈھی پڑی ہے
مجھ سے منہ موڑے ہوئی ہے
مری سوچوں کے مرکز سے نکلتے راستوں پر
میرے نقشِ پا کے بے ترتیب خاکوں میں
اب آنکھیں اگ گئیں ہیں
ہوا کے ہاتھ میں وہ لوح ہے
جو میرا کتبہ ہے
کوئی نزدیک ہے جو سُن رہا ہو
مجھے کچھ پوچھنا ہے
ہواؤں کے تعاقب میں
اگر میں مر گیا تو کون میری قبر پر کتبہ دبائے گا

وہ جلدی میں تھا

(اپنے ریٹائرڈ ریلوے آفیسر ماموں کے نام جو ٹرین کی زد میں آ گئے)

وہ جب دنیا میں آیا تھا
تو اک بے نقش ہاتھوں والا انسان تھا
وہ خود حیران تھا

جلدی میں وہ اپنی لکیریں بھول آیا ہے؟
اُسے پہچان کی آخر ضرورت تھی
لہٰذا اُس کو اپنا جوتشی بننا پڑا
اک دن وہ بے دھیانی میں ہاتھوں پر لکیریں رکھ رہا تھا
مگر اس کی شعوری کوششوں میں لاشعوری ہو رہا تھا
میں نے اس کے ہاتھ سے باتوں میں پوچھا!
''تمہاری دو لکیریں مستطیلی کیوں ہیں؟
جیسے ریل کی پٹڑی بچھی ہو''
میرے استفسار پر خاموش تھا
جیسے وہ خود اس واہمے میں ہو
اسے تبدیل کرنا چاہتا ہو
مجھے اس کا جواب اک ریل کی پٹڑی کے پہلو سے ملا
جہاں وہ خون میں لت پت پڑا تھا
نہ اُس کی آنکھ بدلی تھی
نہ اس کے جسم میں خم تھا
مگر اب ہاتھ کی دونوں لکیریں مل گئیں تھیں

ایک انقلابی کی موت

مری پیاس کو چند قطرے ہی کافی تھے
لیکن سمندر کا پانی تو نمکین تھا
اور میرے بدن میں کثافت تو پہلے ہی موجود تھی
آنت در آنت جو سانس رو کے کھڑی تھی
مرے بازوؤں میں وہ حرکت بھی باقی نہیں تھی

جو پتوار کو منتقل ہو سکے
میری کشتی ذرا جس سے آگے چلے
مرے جسم کو ڈھانپنے والے کپڑے بھی آدھے ہوئے جارہے تھے
سر پہ سورج کی کرنیں بھی اب قوس بننے لگی تھیں
اور خشکی (جو اس تر نظارے کی ضد ہو) کا کوئی
نشان دور تک بھی نہیں تھا

میں ہمت نہیں ہارنا چاہتا تھا
مگر اپنی بے دست و پائی کا اندازہ کرنے سے
بے خم ارادوں کو خم دار ہونے سے کیسے بچاتا؟

کہاں بھاگ جاتا؟
دور تک پھیلے پانی کی یکسانیت میں
مجھے تیرتا ایک پتا نظر آیا
جو چھاؤں دیتے شجر کے تصور میں ملبوس تھا
جونہی اُس کو پکڑا
تو اک تیز ریلے کی شدت سے غرقاب تھا

میں تہہ آب تھا
کئی روز طغیانیوں کے
نشیبوں، فرازوں سے ہوتا ہوا
ایک دن مردہ حالت میں ساحل پہ پایا گیا
مرے ہاتھ میں ایک پتہ تھا
اور منہ میں نمکین پانی

رائیگانی کی بشارت

ہوا نے کنجِ گم گشتہ میں آ کر
میری پلکوں پر جمی ویرانیوں کی خاک کو جھاڑا
اور اپنی شبنم افشانی سے میری بانجھ پلکوں کو
گہرباری میں بدلا
یہ سمجھتی ہے
میں اس کے ہاتھ میں انگلی تھام کر
پھر کسی نادیدہ پربت کے سفر کی ضد کروں گا
تا ابد ہمرہ پھروں گا
وقت اک ڈسپوزیبل رشتہ کی صورت ہے
جو اک منظر کو لے کر دوسرے منظر میں داخل ہی نہیں ہوتا
مجھے تکمیل کی سرحد پہ آ کر رائیگانی کی
بشارت دی گئی ہے
میں جو ریزہ ریزہ ملبہ بنتی آبادی کا نوحہ خواں ہوں
میرے ہاتھ کی جنبش قلم سے پھول کی پتی بنانا چاہتی ہے
مگر میں ملبے کی اینٹوں کی گنتی کر رہا ہوں
کنجِ گم گشتہ میں بیٹھا
یاد آنے والے لمحوں کو بھلانے کے لئے دہرا رہا ہوں

طویل نظم

یونس متین

ہمارے ہاتھ اک سُولی بنائیں گے

سرِ اقرار ہیں شہرِ خرابی کے سبھی نادار مفلس
بے زباں مزدور، عریاں تن گرسنہ
دُھول کے ریوڑ اڑاتے بھوک کے مارے گڈریے بھی
کہ ہر سردار کے سینے کے روزن میں مہکتا ہے
زرِ خالص کا گوسالہ،
عقیدت کے سخن کی ادھ جلی شاخیں خرد کے صحن میں سایہ نہیں کرتیں
اندھیرے پھیل جائیں تو
کسی بھی دزدِ بے پرواہ کی آنکھوں میں رستے جاگ جاتے ہیں
ہوا زنجیر کرنا
یا شب تیرہ مقدر میں
جریدہ ہاتھ سے شمعیں جلانا معجزہ ٹھہرا
تو پھر یہ معجزہ ہم سے روا ہے
ہم رسولوں کی طرح زندہ رہے ہیں وقت کے مُردار ہاتھوں میں
زیاں کے ریگزاروں میں
کٹیلی دھوپ کے ہمراہ چلتے بھی
نہیں رکھی
کسی بادل، کسی بارش، یا نخلستان کی خواہش

زمانے کو ہتھیلی پر لئے پھرتے ہیں
شب کو جاگتے ہیں دن کسی کی یاد میں سو کر گزرتا ہے
جدھر سے بھی گزرتے ہیں
سبھی نادار مفلس بے زباں مزدور عریاں تن گرسنہ ڈھول کے ریوڑ اُڑاتے
بھوک کے مارے گڈریے ساتھ ہوتے ہیں
زرِ خالص کا گوسالہ ابھی تک سانس لیتا ہے
ہمارے ہاتھ اک سُولی بنانے کو ترستے ہیں

زمانے کی اندھیری رات میں بھٹکے ہوئے ریوڑ
سرِ شاخِ فلک
روشن ستارے کی تمنا میں
انہی رستوں پہ جا نکلے
کہ جن کا انت ان کے پاؤں کے نیچے کسی چشمے کی خواہش تھا
وہی میدان!
سوکھی جھاڑیوں کے منظروں میں دُور تک پھیلا
وہی زندان!
جسمیں اپنے بچوں کے جوان ہونے کے عرصے کی اسیری تھی
فلک سے خوانِ نعمت کے اُترنے کی تمنا تھی
سرِ یوروشلم کچی کنواری لڑکیوں کے گیت گلیوں میں تہہ خاک تمنا تھے
مگر بھیڑوں کے ریوڑ چاندنی کی خواہشوں میں تھے
گڈریے چلدیے بیت اللحم کی سمت اک روشن ستارے کے تعاقب میں
تو ہر اک شخص نے سوچا
شب تاریک کا سارا سفر تو پو پھٹے تک کاٹ لینا ہے!
کہ یہ لمحہ وہی ہے نور کے اظہار کا

اور اب کثافت کا حوالہ معتبر ہوگا

ہوا آزاد تھی

انکار کا موسم ''وہ جن سے ایڑیوں پر کاٹنے کی ٹھان رکھی تھی''

اُسی کا تھا

پسِ دیوار گریہ

کاٹھ کی سولی سجی تھی کس نے سوچا تھا

زرِ خالص کا گوسالہ دھکتی آگ میں اب نقش کھو بیٹھا

مگر کچھ ہاتھ ایک سولی بنانے کو ترستے تھے

پسِ دیوارِ گریہ کاٹھ کی سولی سجی تھی

ابنِ مریم کے بریدہ ہاتھ میں اک شمع روشن تھی

وہ شمع گیسوؤں میں جسکی روشن چاند ہوتے ہیں

ہمارے ہاتھ اک سولی بنانے کو ترستے ہیں

ستارہ بجھ چکا ہے

شمعِ روشن تربۂ تیرہ شبی میں سر بہ زانو گنگ بیٹھی ہے

وہی صورت!

وہی ہونے کا گوسالہ

دہکتی آگ کا زربفت پہنے

پھر پلٹ آیا

دلوں میں گھر بنانے کو

گھروں کو سقفِ آتش پر اٹھانے کو

ستارہ مر چکا تھا

''ہاں ستارہ آسمانوں میں چھپنے غاروں کے اندر تھا''

خس و خاشاک سے دریائے آتش کی روانی کس طرح رکتی!

وہی لکھا ہوا ٹھہرا

کہ بوڑھی سرخمیدہ راہبہ بالوں میں اپنے خاک ڈالے
اپنا ماتھا پیٹتی اس سلطنت کی بے ستون چھت سے نکل آئی
تو فطرت کی روانی میں

وہی لمحہ، وہی پل لوٹ آیا جب سرِ شاخِ فلک
اس آخری روشن ستارے کا چمکتا پھول کھلتا تھا
خدا کے ہاتھ کا وہ آخری روشن ستارا جگمگا اُٹھا
ستارا جگمگا اُٹھا

سرِ غارِ حرا روشن ستارہ جگمگا اُٹھا
شبِ تیرہ نسب قامت سمیٹے ایک نقطے میں سمٹ آئی
سیہ نقطے میں ہے روپوش صدیوں سے
زرِ خالص کا گوسالہ

زمانے
وقت کی سیڑھی پہ چڑھتے آخری زینے کی جانب محو گرداں ہیں
کہ بہتا قرن ہو سب کچھ
کوئی پل ہو، صدی ہو، سب سفر میں ہے
قرانِ چشم و خوابِ نارسا اک جستجو تخلیق کرتا ہے
سفر تخلیق کرتا ہے
کوئی چلنے سے پہلے اپنے پیروں میں سفر کی ساری میخیں گاڑ لیتا ہے
کہ ان روشن نشانوں پر سفر آسان ہو جائے
سفر آسان تھا!
ہر شخص کے کاندھے پہ اپنی اپنی سولی تھی
گریزاں تھی ہوا روشن چراغوں کو بجھانے سے
سرِ دنیا زمانے کے جلو میں
ابنِ آدم کا سفر جاری و ساری تھا

کہ نقطہ پھیلتا ہے!

ہاں وہی نقطہ

سیہ نقطہ

کہ جو ہیئت بدل لینے پر قادر ہے

کسی بھی نظم کی صورت میں پھیلے اس سیہ نقطے میں پنہاں

اک شبِ تیرہ نسب انگڑائی لیتی ہے

زرِ خالص کا محوِ خواب گوسالہ

دہکتی آگ کا زربفت پہنے دھیرے دھیرے جاگ اُٹھتا ہے

ہوا روشن چراغوں کو بجھاتی ہے

سیہ نقطے کی اندھی پسلیوں سے

"پیدا ہونے والے بادل"

یوں سرِ بیت المقدس ایستادہ ہیں

کہ ہاتھوں کو دکھائی کچھ نہیں دیتا

گڈریے بے جہت

رستے سے ہٹ کر ایک جانب

خستہ تن دیوار کے سائے میں بیٹھے ہانپتے ہیں

اور سرِ بغداد!

تاتاری اُترتے ہیں

وہ جن کے برق کے مانند گھوڑوں کے سموں سے

آگ کی چنگاریوں کے بے بہا لشکر نکلتے ہیں

کتابیں بین کرتی ہیں

چمکتے ضوفشاں علم و ہنر کے حرف اپنے ہی لہو کی قبر میں جب دفن ہوتے ہیں

تو نقطے میں چھپا سونے کا گوسالہ

ستاروں کے بدن پر طنز کرتا ہے
یہی وہ طنز کا نشتر ہے
جس کی نوکِ عریاں سے عمامے شاہی پوشاکیں قبائیں چاک ہوتی ہیں
ستارے ماند پڑتے ہیں
خدا کے ہاتھ کے سارے ستارے ماند پڑتے ہیں
ہمارے ہاتھ اک سولی بنانے کو ترستے ہیں
مقابل آئینے کے ہے زرِ خالص کا گوسالہ
ستارہ بھی مگر زندہ ہے میرے ہاتھ کی بنجر زمینوں میں
میں آئینہ
عروسِ زندگی کو مسکراتے دیکھ کر اک دن
جواباً مسکرایا تھا
تو سیمے آلی کی صورت آج تک ہوں راکھ کا اک ڈھیر
جس کی تہہ میں چنگاری نہیں کوئی
مگر شعلہ جو دل میں تھا سو زندہ ہے
مغل زادہ ہوں لیکن صورتِ حلاّج ہوں
تقدیر زیرِ پا، ہوائیں بند مٹھی میں
چراغِ شام کا جلنا بھی میری دسترس میں ہے
مری آوارگی و عشق و مستی بے خودی سولی بنی گی
مگر شعلہ جو دل سے رُوح تک نکلا سو زندہ ہے
نمو جاری ہے
اور میں ارتقا میں ہوں
زرِ خالص کا گوسالہ مرے قدموں کے نیچے ہے
جدھر سے بھی گزرتا ہوں
سبھی نادار و مفلس، بے زباں مزدور، عریاں تن گرسنہ

دھول کے ریوڑ اڑاتے بھوک کے مارے گڈریے ساتھ ہوتے ہیں

ہمارے ہاتھ کا کاسہ
سرِ فرشِ زمیں بکھرے ہوئے ٹکڑوں کی صورت ہے
ہم خاک میں ہیں پاؤں
دستِ ایستادہ نے اٹھا رکھے ہیں ساتوں آسمان جن پر
ہزاروں کہکشاؤں کی بسی ہیں بستیاں کیا کیا
کثافت آشنا شیشے کی گہرائی کا پیمانہ نہیں کوئی
جبھی تو اس زمیں پر ابنِ آدم کا حوالہ معتبر ٹھہرا
ہوا کی زنگ آلود نگاہوں نے شبِ تیرہ نسب کی بیعتیں بڑھ کر اٹھا لی ہیں

خدا کے ہاتھ خالی ہیں
مگر ہم خود و سر مست
جن کے ہاتھ کا کاسہ سرِ فرشِ زمیں بکھرے ہوئے ٹکڑوں کی صورت ہے
طلسمِ خاک میں شعلے کی شوریدہ سری سے ہم
لہو پر کوشکِ صد روزن دیوار کی بنیاد رکھیں گے
وہ کوشک جس کے ہر روزن میں اک روشن ستارے کی مکمل روشنی ہوگی
ہوائیں جبس لکھیں گی
تو وا کر دیں گے اپنی بند مٹھی کو
سیہ نقطے میں گم ہو جائے گا سونے کا گوسالہ
ہمارے ہاتھ اک سولی بنائیں گے
ستارے مسکرائیں گے
خدا کے ہاتھ کے سارے ستارے مسکرائیں گے
کہ اس بنجر زمیں پر ابنِ آدم کا حوالہ معتبر ٹھہرے!!!

عالمی ادب (نظم)

شاعری

پیٹر کرمن

ترجمہ: خالد اقبال یاسر

پیٹر کرمن(Peter Curman)

پیٹر کرمن ۱۹۴۱ء میں پیدا ہوا۔وہ سویڈن کا ایک معروف شاعر ہے ۔ اب تک شاعری میں اس کی دس سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں ان کے علاوہ اس نے منتخبات بھی مرتب کئے ہیں ، ایک عشقیہ ناول میں لکھا ہے اور تنقید کے میدان میں بھی قلم آزمائی کی ہے ۔

کرمن ۱۹۸۷ء سے لے کر ۱۹۹۵ء تک سویڈن کے ادیبوں کی انجمن کا صدر رہا ہے اور آج کل وہ سویڈن کے ادیبوں اور فنکاروں کی ایک مشترکہ مجلس کا چیئرمین ہے یہ مجلس لگ بھگ انیس تخلیقی انجمنوں کی نمائندہ تنظیم ہے جو سویڈن کے ادب اور ثقافت کے فروغ کی خاطر سرگرم عمل ہیں۔ وہ بحیرہ

بالٹک ، بحیرہ اسود اور ایجین میں ۱۹۹۲ء اور ۱۹۹۴ء کی ادبی سیاحتوں کے روح رواں تھا جن کے نتیجے میں یونیسکو کے تحت سویڈن کے جزیرے گوٹ لینڈ اور یونانی جزیرے رہوڈز میں ادبیوں اور مترجمین کے مراکز قائم ہیں۔

پیٹر کرمن نے پوڈیم کی بھی ابتداء کی جو سویڈن کا ڈیجیٹل اشاعت گھر ہے اس کا مقصد پوری دنیا کے قارئین تک ادب کی ترسیل کے لئے جدید تکنیک کا استعمال عام کرنا ہے۔

نیلام

یہاں ہوں میں
آدھی عمر پر نیلامی کرتا ہوا
ایک شاعرانہ نیلامیاں
جو کچھ میرا تھا
لگ بھگ سارے کا سارا
پہلے ہی نیلام ہو چکا ہے
میری بیویاں ، میری ناکامیاں ، میرے خواب
اب میں اپنی باقی ماندہ زندگی نیلام کر رہا ہوں
تم مجھے اپنی اس آراستہ ، موزوں
اور خوش خیال عمر مختصر کا کیا دو گے؟
یا اس بے مایہ خواب کا

جواب بھی آرزو سے پیچیدہ ہے؟
سازوسامان کی ایک ایک چوکی ایک ساتھ
باری باری نیلام کرنے سے پہلے
میں کس قدر انجان تھا
کہ کتنا رطب ویابس بچ رہا تھا
مگر اب میں سب کا سب ایک ہی بار جانے دوں گا

تو میرے دوستو
جو ابھی تک خزانے کا خواب دیکھتے ہو
ان کے ئے موقع ہے
تم ایک زندگی کے بدلے کیا دو گے

زندگی

یہی وقت ہے
دستبرداروں اور امیدواروں کے بغیر
آنکھ میں زندگی پر نگاہ کرنے کا
اس اعتراف کی خاطر کہ ہم
سو زمانہ ہو سکے جو ہم کبھی بننا چاہتے تھے
بلکہ ایک خستہ شکستہ جتھہ
اور ارزل پسماندگان ہیں
سرطان کے سبب جراحت زدہ
بائی پاس کے ساتھ یا محض سادہ گنٹھیا کے مریض
اولڈ اوک سیونگز بنک مشورہ دیتا ہے
کہ ہم ضعیف العمری میں تحفظ کا وسیلہ پس انداز کریں

مگر زندگی کہیں اور جاتی نظر آتی ہے
ہم میں سے بعض کسی بھی عمر کو پہنچ نہیں سکتے
دوسرے شفاخانوں یا تیمارداروں میں پہنچ جاتے ہیں
جبکہ جعلی افراد اصراف اور کاروباری ظہراتے کرتے ہیں
زندگی اتنی بے لحاظ ہے
کہ ہماری خصوصی تقویموں پر نہیں چلتی
یہ ہمارے جھنجھلاہٹ بھرے احتجاجوں سے بے نیاز
اپنی راہ چلتی ہے
اقلیم تخلیق کے ایک جزو کے طور پر ہم دہشت زدہ ہیں
اس لئے ہمارے کوئی معنی نہیں؟

ہیروشیما

جس روز پاکستان نے اپنے ایٹم بم کا تجربہ کیا
ہیروشیما کا موسم اتنا ہی روشن اور دلفریب تھا
جتنا چھ اگست ۱۹۴۵ء کو تھا
جب ''انیولا گے'' آسمان پر ایک ذرا سے سرمئی نکتے کی طرح ظاہر ہوا
یقیناً ثقافتی اسباب کے پیش نظر وہ کیوٹو پر بمباری سے باز رہے
جسے جاپان نہیں ''انسانیت کی میراث کہا جاتا ہے
ہیروشیما کا معاملہ اور تھا
یہ ان کا تھا جو لوگ وہاں اپنی زندگیاں جی رہے تھے۔
صبح آٹھ بجکر پندرہ منٹ تک اس سرمئی نکتے نے ایک چھوٹا سا انڈہ چھوڑا
جس نے خود سورج کو تیرہ و تار ہونے پر مجبور کر دیا
جوہری بم کے عجائب خانے میں ان لوگوں کی تصاویر ہیں

جیسا چھ اگست ۱۹۴۵ء کو تھا

دوران

سال گزرتے ہیں
تم اپنے بچوں میں دیکھتے ہو
اور جنازہ گاہوں میں اپنی بڑھتی ہوئی دلچسپی میں
کہ تم بڑے ہو رہے ہو
کیا تم نے اپنے سفید ملبوس سے معاملہ کر لیا ہے
میں اکثر اپنی بیٹی کا منا سا پاؤں ہاتھ میں لیے سویا کرتا تھا
مگر آج جیسی جسارت کون کرتا ہے؟
خواب میں زندگی تیری سے بے الزام آتی ہے

اس رات میں ایک فلم شوٹ میں تھا
میں نے اپنے والدین کو چاپلوسی خانے میں دیکھا
میں ایسے میں، آس پاس فرش پر رینگ رہا تھا
راشن کے کوپنوں سے کھیل رہا تھا
اندھیری کھڑکیوں کے باہر جنگ تھی
مگر وہ کبھی کمرے میں نہیں آئی
جہاں میں بلیک آوٹ کے پردوں سے گھر گھر کھیلتا

یادیں میرے پاؤں میں کرچیوں کی طرح باقی ہیں
بعض ابھی بھی ایذا اور درد دیتی ہیں
جو تم نے بسر کیا کبھی تمہارے جسم سے نہیں نکلتا

خواب میں تم اپنی ساری عمر ماہی گیری کے
ایک بڑے ٹرالر کی طرح گھسیٹتے ہو
میں صبح سویرے اٹھ بیٹھتا ہوں
اپنے منہ میں اُداسی کی ایک میٹھی لذت لیے

ڈیلفی کا رتھ بان

ابھی تک ٹکٹکی باندھے
ڈیلفی کے عجائب گھر میں بت ایستادہ ہے
زیرِ محراب کامرانی، فتح کے رتھ پر
کمر بستہ اور ایک بھی عضلہ ہلائے بنا
وہ تناسب کی علامت ہے
جو وقت اور موت سے ماوراء ہے
اپنی اور ہماری
یقینی فتح کے وفور سے بے نیاز
وہ اپنے بائیں ہاتھ میں ساری لگامیں تھامے ہوئے ہے

اس کا چوغہ بھاری تہوں میں آویزاں ہے
جیسے گزرتی ہوا اس پر اثر نہیں کرتی
اس کے چہرے کے خدوخال اب بھی حسین اور ویسے ہی ناموجود ہیں
جسے وہ کبھی تھے جب پولیز الوس کے اعزاز میں انہیں تراشا گیا
اس کی آنکھیں اپنی ہوشیار پتلیوں سے
ہم پر زندانِ وقت سے نگاہ کرتی ہیں
زندگی کے گردابوں کے بیچ تسلی رکھو

یہی ہمیں ڈیلفی کا سوار سمجھاتا ہے
کسی کی جیت یا ہار میں خود کو بہنے نہ دو
زندگی کے نشیب و فراز میں سختی سے جمے رہو
بے قابو زندگی کی لگاموں پر مضبوط گرفت کے ساتھ

شاعری

پابلو نیرودا
ترجمہ: ڈاکٹر وحید احمد

تو وہ تھی عمر ۔۔ جس میں شاعری پہنچتی تھی
مجھ کو ڈھونڈتی
معلوم کب ہے کب مجھے معلوم ہے
وہ کس جگہ آ گئی

رود رواں سے ۔۔۔ یا زمستاں سے
مجھے معلوم کب ہے ۔۔۔ کس طرح! ۔۔۔ کیسے!!
نہیں ہرگز، وہ آوازیں نہیں تھیں
لفظ کب تھے اور سناٹا کہاں تھا وہ ۔۔۔ نہیں ہرگز نہیں
بس اک گلی تھی جس سے بلوایا گیا مجھ کو
کہیں سے پھوٹتی اک رات کی شاخیں تھیں
بھڑکیلا الاؤ جل رہا تھا
یا میں تنہا لوٹ کر آتا تھا ۔۔۔ بے چہرہ
جب اس نے مجھ پر اپنا عکس رکھا تھا
مجھے معلوم کب تھا، بولنا کیا ہے!
مرے لب سل گئے تھے اسم کی بے اسم قسموں سے
مری آنکھوں پہ پردہ پڑ گیا تھا
بس کوئی شے چل رہی تھی روح کے اندر

کوئی تپ اٹھ رہی تھی میرے اندر یا کوئی گم گشتہ پر بکھرے ہوئے تھے
اور پھر میں نے
خود اپنا رستہ پیدا کرلیا
اُس رمز والی آگ کی عقدہ کشائی کر کے
پہلی ایک دھندلی سطر لکھی
دھندلی
بے غایت
بہت مہمل
نہایت پاک دانش، ایک ایسے شخص کو جو جانتا کچھ بھی نہیں
اور اچانک میں نے کیا دیکھا
کہ نیلے آسمان کی ساری گرہیں کُھل گئی ہیں
اور کھلے پھرتے ہیں سیّارے
ہمکتی سانس لیتی، جھومتی ہر بالیاں
بر مائے سائے۔
آگ سے۔ پھولوں سے اور تیروں سے
گھومتی، چکر لگاتی رات
کائنات
اور میں ایک خورد بینی شخص
تاروں سے بھری پہنائی کے نشے میں غلطاں
گھومتی یکسانیت اور جھومتے اسرار کی مبہم شبیہوں سے خمار آلود
اپنے آپ کو پاتال کا حصّہ سمجھتا تھا
میں تاروں کے گھماؤ میں تھا یکسر
اور میرا دل
طنابیں توڑ کر پھیلی ہوا میں تیرتا تھا

نارنگی کے بانجھ پیڑ کا گیت

لورکا

ترجمہ: ڈاکٹر وحید احمد

لکڑ ہارے ۔۔۔کاٹ
میرا سایہ کاٹ
شاید میں بے ثمری کی چھتنار اذیت سے بچ جاؤں ۔۔۔کاٹ
مرا سایہ کاٹ

کیوں میں شیشوں کی جنگل میں پیدا ہوا
دن کیوں مرے چاروں جانب
دن بھر گھومتا رہتا ہے
رات مجھے کیوں ہر شب پیدا کر دیتی ہے
شیشہ شیشہ تاروں میں

زندہ رہنا چاہتا ہوں
خود کو دیکھے بنا
سپنے بُننا چاہتا ہوں
رات یہ چاہے دن
جن میں میری چیونٹیوں، خول اور چوکر کی

یوں کایا کلپ ہو جائے
کہ ان کی بجائے
پنچھیوں اور ہریالی کی سرسر ہر سو لہرائے
لکڑ ہارے۔۔۔۔کاٹ

مرا سایہ کاٹ
شاید میں بے ثمری کی چھتنار اذیت سے بچ جاؤں

ادبی سلسلہ
نقاط
کے اجراء پر
مبارکباد
Stylish
Paints
Manufacturers:
Farooq Bashir & Company
Sadiq Market, Faisalabad
041-8625686

غزلیں

ریاض مجید

(1)

البموں میں بند کچھ ماضی کے منظر رہ گئے
چند لمحے چند تصویروں کے اندر رہ گئے

چند یادیں ہیں درودیوار میں بکھری ہوئی
اُڑ چکے لمحوں کے کچھ ٹوٹے ہوئے پَر رہ گئے

خون الاؤ تھا تو ہم کو صبر آتا ہی نہ تھا
بجھ گئے تو ہم بھی پھر خاموش ہوکر رہ گئے

گھر کے سائے میں چلے آئے تو کتنا سکھ ہُوا
دنیا بھر کے غم مری چوکھٹ سے باہر رہ گئے

سخت تھا خوش فہمیوں کے دشت کا اندھا سفر
راہ میں تھک ہار کر خواہش کے لشکر رہ گئے

سنگ باری کر کے سب اپنے گھروں کو جا چکے
میرے چاروں سمت خون آلود پتھر رہ گئے

وہ ہمیں ملتا کبھی تو اپنا دکھ کہتے ریاض
دل میں کیا ارمان تھے جو دل کے اندر رہ گئے

(2)

آتے جاتے چہرے تکتا رہتا ہوں
دن بھر کھلی کتابیں پڑھتا رہتا ہوں

گھر کی تنہائی کا دھیان ڈراتا ہے
یوں ہی بازاروں میں پھرتا رہتا ہوں

کسے خبر ہے کون سی دید ہو آخری دید
ہر اک چیز کو غور سے تکتا رہتا ہوں

لوگوں سے تکرار بہت ہی مہنگی پڑی
اپنے آپ سے بھی اب لڑتا رہتا ہوں

نیند ہی تو عافیت کا اک گوشہ ہے
اکثر دوپہروں تک سوتا رہتا ہوں

پھیلتی لہریں جی کو اچھی لگتی ہیں
تالابوں میں پتھر پھینکتا رہتا ہوں

وہ ہمیں ملتا کبھی تو اپنا دکھ کہتے ریاضؔ
دل میں کیا ارمان تھے جو دل کے اندر رہ گئے

(2)

آتے جاتے چہرے تکتا رہتا ہوں
دن بھر کھلی کتابیں پڑھتا رہتا ہوں

گھر کی تنہائی کا دھیان ڈراتا ہے
یوں ہی بازاروں میں پھرتا رہتا ہوں

کسے خبر ہے کون سی دید ہو آخری دید
ہر اک چیز کو غور سے تکتا رہتا ہوں

لوگوں سے تکرار بہت ہی مہنگی پڑی
اپنے آپ سے بھی اب لڑتا رہتا ہوں

نیند ہی تو عافیت کا اک گوشہ ہے
اکثر دوپہروں تک سوتا رہتا ہوں

پھیلتی لہریں جی کو اچھی لگتی ہیں
تالابوں میں پتھر پھینکتا رہتا ہوں

کس میں ہمت ہے جو سچی بات سُنے؟
سچی سوچتا، جھوٹی کہتا رہتا ہوں!

دیکھتا ہوں اک لمحے کو آئینہ مگر
کیا یہ میں تھا پہروں سوچتا رہتا ہوں

ہر اک لمحے کا ہے اپنا قرض ریاضؔ
میں لمحوں کا قرض چکاتا رہتا ہوں

یوسف حسن

جس کی لہروں میں مری تقدیر غلطیدہ رہی
دل کی ہر دھڑکن اُسی دریا کی گرویدہ رہی

اُس کے پتھر بھی پرندوں کی طرح اُڑتے رہے
میرے آنگن کی ہوا بھی پر تراشیدہ رہی

جانے کیا جادو جگایا آرزو کی آنچ نے
کوئی لے میرے رگ و پے میں نہ خوابیدہ رہی

اک دھواں سا دور تک ترے تعاقب میں گیا
اک چمک سی دیر تک سایوں میں لرزیدہ رہی

آسمان کی ساکھ تھی یا وہ زمین کی راکھ تھی
کسی کی تابانی سے تیرے شام ترسیدہ رہی

اک انوکھے درد کی خوشبو ہے تیری گرد میں
اے ہوا تو کن خرابوں میں خرابیدہ رہی

آئینہ تھے ہم پہ دشت و در کے سارے سلسلے
ایک تیری قربتوں کی راہ پیچیدہ رہی

شاہین مفتی

وہ اشک جو آنکھوں سے ڈھلا ہے نہ ڈھلے گا
طوفان کی صورت یونہی سینے میں پلے گا

اک شاخ الم جس پہ صدا پھول کھلیں گے
اک قرب کا موسم کہ کٹا ہے نہ کٹے گا

مشعل تو سر راہ گذر لے کے چلے ہو
یلغار ہوا کو بھی کوئی روک سکے گا

پھر آج بساطِ غم ہستی پہ کھڑے ہیں
پھر وقت کوئی ہم سے نئی چال چلے گا

گم گشتہ منزل ہیں ہم اس دشت بلا میں
اب اپنے تعاقب میں کوئی آ نہ سکے گا

خاور اعجاز

پہلی نیلی چھت گزرے تو پھر اک نیلی چھت
ایک غصیلی چھت کے اوپر اور غصیلی چھت

اُس نے ایک یقیں میں رکھا عرش پہ فرش نیا
میں نے ایک گماں کے موسم میں تبدیلی چھت

کون لگاتا ہے دیواروں پر سبزے کی تہہ
کون ہَری دیواروں پر رکھتا ہے پیلی چھت

آتش دان کی رنجش بھی ٹھنڈی ہو جاتی ہے
چمنی کے چاروں جانب ہو جب برفیلی چھت

دیر تلک چھت پر برسی ہے ساون کی بارش
دیر تلک سلگے گی اس موسم میں گیلی چھت

مقصود وفا

اِک تماشا سا بس رہا ہے میاں
یہ جہاں خار و خس رہا ہے میاں

یہ محبت بھی ! ہاں محبت بھی
کاروبارِ ہوس رہا ہے میاں

چھینٹ تک بھی نہیں گلاس میں اور
چھت پہ بادل برس رہا ہے میاں

آنکھ نظارۂ دگر میں ہے
دل کسی کو ترس رہا ہے میاں

میں وہاں پر ہوا اکیلا جہاں
شہر کا شہر بس رہا ہے میاں

رات میرے نگار خانے میں
سلسلۂ جرس رہا ہے میاں

ایسے سینے میں سانس گھٹتی ہے
دل بھی جیسے قفس رہا ہے میاں

نعیم ثاقب

(1)

تو کہتا ہے باہر اپنی حد سے ہوں
اس کا مطلب ہے میں پورے قد سے ہوں

دیکھنا ہے تو دل کی آنکھ سے دیکھ مجھے
پڑا ہوا میں باہر خال و خد سے ہوں

کرتا رہتا تھا میں اپنا آپ انکار
سو مسمار بھی میں اپنی ہی زد سے ہوں

میں بھی لیے پھرتا ہوں سر کو ہاتھوں میں
یعنی میں بھی سلسلۂ سرمد سے ہوں

پڑا ہوا ہوں دیر سے ثاقب سجدے میں
مجھ کو نہیں معلوم میں کس معبد سے ہوں

(2)

دشمن ہے یا کوئی حواری مجھ میں ہے
ایک تصادم ہے جو جاری مجھ میں ہے

اپنے آپ کو یاد نہیں رہتا ہوں میں
کب سے یہ کیفیت طاری مجھ میں ہے

اِک اِک سانس لگا رکھی ہے داؤ پر
میرا اک ناکام جواری مجھ میں ہے

تو بھی بھول گیا ہے مجھ کو حیراں ہوں
میں سمجھا تھا یہ فنکاری مجھ میں ہے

ایک الاؤ ہے جو جلتا رہتا ہے
ایک کہانی ہے جو جاری مجھ میں ہے

ارشد محمود ناشاد

(1)

درد کا نقش بنا ، کرب کی تصویر ہوا
میں جنوں کیشِ ازل ، کشتۂ تقدیر ہوا

مجھ کو مسمار نہ کر عرصۂ نادانی میں
میں زمانوں کی ریاضت سے ہوں تعمیر ہوا

زخم کیا زخم کہ جو چارہ گری کو ترسے
خواب کیا خواب جو منت کش تعبیر ہوا

کیوں بلاتا ہے چمن زار مجھے اپنی طرف
اب تو ویرانہ مرے پاؤں کی زنجیر ہوا

ہاتھ آتی نہیں اب کوئی یقیں کی صورت
بے دھیانی میں عجب وہم بغل گیر ہوا

مجھ کو جو درد بھی چھو جائے وہ راحت ہو جائے
آتشِ ہجر کی لذت سے میں اکسیر ہوا

کوئی پیرایۂ اظہار ملے اُس کو بھی
ورقِ دل پہ جو افسانہ کہ تحریر ہوا

(2)

ہم جنوں پیشہ کہ رہتے تھے تری ذات میں گُم
ہو گئے سلسلۂ گردشِ حالات میں گُم

عرصۂ وصل میں بھی حرف تمنا نہ کھلا
حسن الہام رہا پردۂ آیات میں گم

عقل انگشت بہ دنداں ہے نظر حیراں ہے
کون سی چیز ہوئی ارض و سماوات میں گُم

کتنے کنعان ہوئے خوابِ زلیخا میں اسیر
کتنے یعقوب رہے ہجر کے صدمات میں گُم

کوئی مائل بے سماعت نہ ہوا صد افسوس!
نغمۂ درد رہا سینۂ جذبات میں گُم

میں ترے شہر سے گزرا ہوں بگولے کی طرح
اپنی دُنیا میں مگن اپنے خیالات میں گُم

نعمان شوق

(1)

وحشتوں کے پر کتر سکتا ہوں میں
آسمانوں سے اُتر سکتا ہوں میں

کون سمجھائے مرے مدّاح کو
تالیوں سے بھی بکھر سکتا ہوں میں

کوئی کشتی میری کمزوری نہیں
بیچ دریا رقص کر سکتا ہوں میں

اس نے خود مختار مجھ کو کر دیا
چین سے جب چاہوں مر سکتا ہوں میں

آزما ہرگز نہ مجھ کو بار بار
پہلی جیسی بھول کر سکتا ہوں میں

ماورائے لمس ہے اس کا بدن
صرف اسے محسوس کر سکتا ہوں میں

کر دیا کم ظرف نے جینا حرام
ہو گیا معلوم ڈر سکتا ہوں میں

ٹوٹ سکتا ہوں بھروسے کی طرح
آپ کو حیران کر سکتا ہوں میں

(2)

معاملہ یہ خودی کا نہ بے خودی کا ہے
تمام پھیلا ہوا سلسلہ نفی کا ہے

یہ جان لو تو ڈرو گے بجھے چراغ سے بھی
وہ رابطہ جو مرے ساتھ روشنی کا ہے

سمجھ رہا تھا کہ گمراہ کر رہی ہے ہوس
یہ راستہ تو مگر آپ کی گلی کا ہے

نفس کی آمد و شد سے کچھ اطمینان نہیں
مرا ارادہ کسی اور زندگی کا ہے

بدن کو ورنہ لباسوں سے کیا ملا اب تک
یہاں سوال تو ذہنوں کی گندگی کا ہے

وہ سانپ جس نے مجھے آج تک ڈسا ہی نہیں
تمام زہر سخن میں مرے اسی کا ہے

اعجاز توکّل

(1)

رائیگانی کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے میں
خوش ہوں اب عشق میں نقصان اُٹھاتے ہوئے میں

آنکھ سے خواب نکل آئے ہیں اشکوں کی جگہ
اتنا رویا ہوں ترے شہر سے جاتے ہوئے میں

درو دیوار بھی ٹھہرے نہ خموشی کیخلاف
رہ گیا گھر میں فقط شور مچاتے ہوئے میں

مرقدِ قیس مرے سامنے ہے صورت میں
آن پہنچا ہوں یہاں خاک اُڑاتے ہوئے میں

بس محبت میں ذرا چاہیے رونے کا جواز
سوچتا ہی نہیں پھر اشک بہاتے ہوئے میں

وہ بھی دن تھے میں ترے ساتھ تھا سائے کی طرح
اب تو ڈرتا ہوں ترے سامنے آتے ہوئے میں

(2)

گھٹن کے زیرِ اثر گفتگو نہیں کرتے
ہوا رکے تو شجر گفتگو نہیں کرتے

یہ اہلِ ہجر ہیں کم بولتے ہیں ویسے بھی
یہ لوگ شام و سحر گفتگو نہیں کرتے

کسی کسی کو ملتا ہے مرتبہ ایسا
تمام نیزوں پہ سر گفتگو نہیں کرتے

یہ خامشی ہمیں لمحوں میں مار سکتی ہے
ہم اپنے ساتھ اگر گفتگو نہیں کرتے

جو آنکھ محوِ سخن ہو تو چپ ضروری ہے
نظر کے پیشِ نظر گفتگو نہیں کرتے

میں ایک عمر سے قبروں سے لگ کے بیٹھا ہوں
یہ رفتگاں بھی مگر گفتگو نہیں کرتے

ارشد خامر

(1)

اشک بہتے گئے سہولت سے
شعر میں نے کہے سہولت سے

دنیا ہوتی نہ درمیان اگر
ہم تجھے دیکھتے سہولت سے

زہر گھلنے لگا ہواؤں میں
لوگ مرنے لگے سہولت سے

میں کُھلے دل کا آدمی تھا مجھے
لوگ آ کر ملے سہولت سے

شکر ہے زندگی کے سائے میں
سانس ہم نے لئے سہولت سے

در کھلے ہیں ہوا بھی ہے لیکن
جل رہے ہیں دیے سہولت سے

دیکھ کر اِس کو سامنے خاور
میرے بازو کھلے سہولت سے

(2)

جب بھی اس شخص کا چہرہ نظر آتا ہے مجھے
اپنی آنکھوں سے زیادہ نظر آتا ہے مجھے

مجھ پہ اتنا بھی نہ کھل جائے بصارت میری
جسے دیکھوں وہی اُلٹا نظر آتا ہے مجھے

محو حیرت ہوں کہ پلکیں بھی جھپک سکتا ہوں
ہر طرف ایک تماشہ نظر آتا ہے مجھے

اس کی وسعت کے میں اسرار میں گم کیسے رہوں
آسمان آنکھ سے چھوٹا نظر آتا ہے مجھے

جانے کس زاویے سے میری نظر اُٹھتی ہے
جیسے دیکھوں جسے ویسا نظر آتا ہے

اس سے بہتر تھا کہ کھلتی ہی نہ آنکھیں خاؔمر
جیسی حالت میں زمانہ نظر آتا ہے

(3)

گرچہ پلکیں مری باہر کی طرف کھلتی ہیں
لیکن آنکھیں مری اندر کی طرف کھلتی ہیں

شہر اس طرز پہ تعمیر کیا لوگوں نے
کھڑکیاں ساری اُسی گھر کی طرف کھلتی ہیں

دوڑ سکتا ہے وہ رفتار کی حد سے بڑھ کر
اُسکی راہیں تو مقدر کی طرف کھلتی ہیں

سرخ بیلوں سے لپٹ جاتی ہے تاریکی شب
ظلمتیں شام کے منظر کی طرف کھلتی ہیں

پانی ہاتھوں پہ اُٹھا لیتا ہے ان کو خاؔمر
کشتیاں جونہی سمندر کی طرف کھلتی ہیں

(4)

یاد رفتہ پلٹ بھی سکتی ہے
فکر کی شاخ کٹ بھی سکتی ہے

بدحواسی میں دوڑتی ہوئی آگ
دھیان رکھنا پلٹ بھی سکتی ہے

غم کے جذبات سے نہ بھر دل کو
اب یہ ناؤ اُلٹ بھی سکتی ہے

عمر کی اتنی خواہشیں نہ بڑھا
زندگی اس میں گھٹ بھی سکتی ہے

پھیلتے خواب دیکھ کر خامرؔ
آنکھ اچانک سمٹ بھی سکتی ہے

زاہد نبی

عکس ہوں ، آئینوں سے نِکلوں گا
وقت کی گردشوں سے نکلوں گا

مجھ کو ہونا ہے آفتاب اِک دن
میں انہی آنگنوں سے نِکلوں گا

کچھ نئے سلسلے بنانے ہیں
کچھ نئی صورتوں سے نِکلوں گا

خود کو لے آؤں گا کسی ڈھب پر
ذات کے جنگلوں سے نِکلوں گا

میں شرر کی طرح ہوں زاہدؔ
اِس لئے پتھروں سے نِکلوں گا

ثنا اللہ ظہیر

(1)

تری شکست کا اعلان تو نہیں کریں گے
جو تیرا کام ہے دربان تو نہیں کریں گے

سیاہ رات کے آنگن میں کود کر ہم لوگ
دیئے جلائیں گے نقصان تو نہیں کریں گے

میں اپنی ذات کی حیرت سرا سے گزرا ہوں
یہ تجربے مجھے حیران تو نہیں کریں گے

یہ ٹھیک ہے کہ ضروری ہے کار گریہ بھی
پر اس کو ہجر کے دوران تو نہیں کریں گے

نکال دیں گے تجھے شہر کی طرف پھر بھی
ہم اپنے دشت کو ویران تو نہیں کریں گے

یہ سوچنا تھا تمہیں دائرے بناتے ہوئے
یہ پیچ تم کو پریشان تو نہیں کریں گے

ظہیر اس کی رگوں میں لہو اتار کے ہم
زمین پر کوئی احسان تو نہیں کریں گے

(2)

کچھ اس لئے بھی مجھے آئینہ پسند نہیں
میں صاف گوئی میں بھی انتہا پسند نہیں

ہم اُس سے خیر کی امید کیا رکھیں جس کو
دیئے سے ربط نہیں اور ہوا پسند نہیں

مرا خلوص کہ اُسکی جگہ پر کٹ رہا ہوں
وہ شاخ جس کو مرا گھونسلا پسند نہیں

تمام عمر پڑاؤ میں کاٹنا ہو گی
سفر ہے شوق مگر راستہ پسند نہیں

تمہارے سامنے سچ بولنے سے رک گئے ہیں
ہمیں بتاؤ تمہیں اور کیا پسند نہیں

یہ اور بات کہ دل میں جگہ نہ دیں گے اُسے
مگر وہ شخص ہمیں اب بھی نا پسند نہیں

ظہیر اُس کو بچانا ہے ڈوبنے سے مجھے
وہ دوست جس کو مرا تیرنا پسند نہیں

(3)

جو مہرباں ہے ستم گر بھی رہ چکا ہے کبھی
اسی کے ہاتھ میں پتھر بھی رہ چکا ہے کبھی

میں آسمان پہ اُڑنے کے خواب دیکھتا ہوں
کہ اک خلا مرے اندر بھی رہ چکا ہے کبھی

یہیں شجر تھے پرندوں کے آشیانے تھے
اسی زمیں پہ مرا گھر بھی رہ چکا ہے کبھی

اسی لئے اُسے ملتا ہوں احترام کے ساتھ
مرا عدو مرا ہمسر بھی رہ چکا ہے کبھی

یہ اور بات کہ اب یاد بھی نہیں ہے اُسے
وہ شخص ہم کو میسر بھی رہ چکا ہے کبھی

اختر علی

(1)

سوچ لو !! مسئلہ نہ بن جائے
مستقل رابطہ نہ بن جائے

میں جسے دیکھتا ہی رہتا ہوں
وہ مرا آئینہ نہ بن جائے

حاشیہ کھینچنے سے ڈرتا ہوں
حاشیہ!! دائرہ بن جائے

اب مجھے احتیاط کرنی ہے
داستاں واقعہ نہ بن جائے

سُن رہی ہو جو دھیان سے مجھ کو
تو کہیں شاعرہ نہ بن جائے

(2)

تیرا چہرہ بھول گیا ہوں
یعنی رستہ بھول گیا ہوں

اُس کی باتیں سنتے سنتے
اپنا لہجہ بھول گیا ہوں

لوگ مجھے پہچان چکے ہیں
بھیس بدلنا بھول گیا ہوں

زخم برابر ہیں اب مجھ میں
درد کا ہونا بھول گیا ہوں

یاد میں تیری شعر کہا تھا
پہلا مصرع بھول گیا ہوں

احمد سلیم رفی

(1)

ایک دم اتنا اضافہ تو نہیں ہونے لگا
درد قطرہ ہے تو دریا تو نہیں ہونے لگا

میں تو عادی ہوں ذرا فاصلے پر چلنے کا
اپنے لشکر سے علیحدہ تو نہیں ہونے لگا

ایسا ہو جائے تو حالات سدھر جائیں مگر
ظاہری بات ہے ایسا تو نہیں ہونے لگا

کیوں جھجکتا ہے مرے دوست گلے ملنے سے
میں ترے جسم کا حصہ تو نہیں ہونے لگا

وہ رفی ایک زمانے سے کسی اور کا ہے
ایک دو دن میں تمہارا تو نہیں ہونے لگا

(2)

میں نے زندان پہ انکشاف کیا
بے گناہی کا اعتراف کیا

کس نے برسوں کی خامشی توڑی
کس نے دیوار میں شگاف کیا

کوئی شرمندگی نہیں تھی اسے
میں نے جس شخص کو معاف کیا

میں نے اُس کو ملا دیا اس سے
اس نے مجھ کو مرے خلاف کیا

ایک دوجے کے دل میں رہ کر بھی
ایک دوجے کا دل نہ صاف کیا

پہلے کانوں میں گھول دی سب کے
پھر کہانی سے انحراف کیا

ساری دنیا تھی میرے ساتھ رفی
گھر کے لوگوں نے اختلاف کیا

(3)

جچا نہ شہر تو پھر گاؤں میں چلے آئے
انہی پرانے مسیحاؤں میں چلے آئے

جو برف تھی وہ چٹانوں کا روپ دھار گئی
جو کوہسار تھے دریاؤں میں چلے آئے

جڑوں سے کاٹتے پھرتے تھے ایک دوسرے کو
پر ایک دوسرے کی چھاؤں میں چلے آئے

ہم اسکے واسطے تتلی پکڑنے نکلے تھے
نہ جانے کس طرح صحراؤں میں چلے آئے

زیادتی بھی تری تھی یہ دیکھ پھر بھی ہم
تجھے منانے ترے پاؤں میں چلے آئے

ہم اپنے جیسوں میں کتنے سکوں سے زندہ تھے
ہمارا جرم کہ داناؤں میں چلے آئے

کہاں پہ آکے کہانی سنائی ہم نے رفی
یہ کن مبالغہ آراؤں میں چلے آئے

اشفاق بابر

(1)

میں نے کیا ملال کوئی اور بھی کرے
اِس شہر کا خیال کوئی اور بھی کرے

رو رو کے کر رہا ہوں دُعا سب کے واسطے
اے ربِ ذوالجلال کوئی اور بھی کرے

اُس حُسن سے گریز کیا میں نے جس طرح
پیش ایسی اک مثال کوئی اور بھی کرے

جب میں نے ہی کیا نہیں اپنا کبھی خیال
کیونکر مرا خیال کوئی اور بھی کرے

خوش ہو رہا ہوں رُوند کے میں اپنے آپ کو
جینا مرا محال کوئی اور بھی کرے

مجنوں کے بعد ہوں مرے بعد کون ہے
اب عشق میں کمال کوئی اور بھی کرے

بابر میں خود سے پوچھتا رہتا ہوں کون ہوں
خود سے یہی سوال کوئی اور بھی کرے

(2)

زمیں بناتے نہیں آسماں بناتے ہیں
جو کچھ بناتے ہیں ہم رائیگاں بناتے ہیں

تمام رات گزاریں گے کس طرح چپ چاپ
کوئی کہانی کوئی داستاں بناتے ہیں

لہو میں گوندھتے رہتے ہیں ہم جو لفظوں کو
بس اپنے واسطے جی زیاں بناتے ہیں

چلیں گے جب تو نئی راہ بھی نکالیں گے
ابھی تو بیٹھے ہوئے کارواں بناتے ہیں

یہ جو حصار ہیں چاروں طرف دُعاؤں کے
انھیں ہمارے لئے مہرباں بناتے ہیں

تم اپنی آنکھوں کی تھوڑی سی روشنی دے دو
مرے چراغ تو بابر دُھواں بناتے ہیں

نقد و نظر

پانی پہ قدم (شاعری)

شاعرہ : شاہین مفتی

تبصرہ نگار : سعید احمد

صفحات : 120

پتہ : ہم خیال پبلشرز فیصل آباد

تخلیق اپنا جواز خود فراہم کرتی ہے۔اعلٰی درجے کی شاعری کے مطالعہ سے حاصل ہونے والی مسرتِ قلبی ہی اس کی غایتِ تخلیق ہوتی ہے۔شاہین مفتی کے خوبصورت شعری مجموعے "پانی پہ قدم " کے مطالعہ سے بھی ہمیں ایک عجیب سرخوشی اور لطیف بہجت کا احساس ہوتا ہے۔شاہین کی شاعری کے مطالعہ سے حاصل ہونے والی خوشی اور سرور وانبساط کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ توازن، تناسب، تنوع اور ترنّم اس احساس کے منابعِ اربعہ ہیں۔

شاہین مفتی بڑی متوازن شخصیت کی مالک ہیں۔ان کی شاعری میں کسی خاص گروہ یا نظریے کی طرف جھکاؤ نہیں ملتا۔انہوں نے اپنی شاعری کو کسی دائیں بائیں گروہ یا نظریے اور آدرش سے گرانبار اور بوجھل نہیں کیا۔یہاں نہ تصوّف کے مسائل ہیں نہ تفلسّف کی موشگافیاں۔نہ نام نہاد ترقی پسندی ہے اور نہ سستی رومانیت۔شاہین نے لطیف جذبات اور سبک احساسات کی بے ساختہ تصویر کشی کی ہے جس میں کہیں تصنّع کا شائبہ تک نظر نہیں آتا۔

یہ مہماں جب سے پنگھٹ کا ہوا ہے
عجب احوال نٹ کھٹ کا ہوا ہے

اسے لٹکا اُسی لٹ کا ہوا ہے
دلِ وحشی وہیں اٹکا ہوا ہے

شاہین مفتی کی شاعری میں یہی تنوع اور تعداد ہمیں بیزار نہیں ہونے دیتا شاہین مفتی کی شاعری میں یہ رنگارنگی ہمیں اردو شاعری کے کئی شیڈز یاد دلاتی ہے۔اردو شاعری کے ان الوان سے شاہین مفتی کی نظم وغزل کا طیف ترکیب پاتا ہے۔

شاہین مفتی کی شاعری کی ایک اہم خصوصیت ترنم اور موسیقیت ہے۔سلیس اور سبک الفاظ،نرم وشیریں تراکیب،مترنم قوافی وردائف اور شگفتہ وشاداب زمینیں۔یہ سب اجزاء مل کر جس شاعرانہ لہجے کی تشکیل کرتے ہیں اس میں چاشنی بھی ہے اور نغمگی بھی۔

آ لگا دل سے وہی آزارِ شب
دیکھئے کیونکر بچے بیمارِ سب
تیغِ غم . تیغِ نظر ،تیغِ ستم ،تیغِ جفا
ایک جانِ ناتواں اور اتنی تلواروں کے بیچ
سوچ کے رکھیے گا پانی پہ قدم
عین دریا میں بھنور جاگتا ہے

شاہین مفتی کی شاعری میں نہ تو خود پسندی ہے اور نہ خود بیزاری ۔غزل میں زگیست پسندی کا مظاہرہ اکثر و بیشتر مقطع میں ہوتا ہے اور اس مجموعے (پانی پہ قدم) کی تمام غزلیں مقطع سے بے نیاز ہیں۔اسی طرح شاہین مفتی کی شاعری میں وہ خود بیزاری اور مایوسی بھی مفقود ہے جو اردو شاعروں کا شیوہ رہی ہے۔ان کی شاعری میں وجودیت پسندوں کی طرح وجود ایک واہمہ نظر نہیں آتا بلکہ حقیقت پسندوں کی طرح شاہین مفتی نے وجود کو تمام تر لطافتوں اور کثافتوں سمیت قبول کیا ہے۔

شاہین مفتی کی شاعری میں آتشِ عشق کی وہ ہلکی ہلکی آنچ بخوبی محسوس کی جاسکتی ہے جسے 'سوختنِ ناتمام' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

شاہین مفتی کے لہجے میں تازگی اور توانائی ہے۔دیگر شاعرات کی طرح نسائیت کا پرچار کہیں نظر نہیں آتا۔شاہین مفتی کی غزل کی طرح نظم بھی بڑی سڈول اور مسحور کن ہے۔شاہین مفتی کی نظموں میں وحدت تاثر اور قوافی کا التزام نمایاں ہے۔

''اب تم بھی نہیں ہو''، ''فل سٹاپ''، ''گُلِ نیلمیں'' ، ''یہ زیاں خانہء محبت ہے''، ''کینال ویو'' ، ''رات چاند اور میں'' اور ''اگر ہو سکے ''یادگار نظمیں ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ فن کار نے اپنے موقلم کی جنبش سے شاعرہ کے تخیل کی تجسیم کر دی ہے۔

فلسفۂ مغرب کی تاریخ

مصنف : برٹرینڈ رسل
ترجمہ نگار : پروفیسر محمد بشیر
تبصرہ نگار : قاسم یعقوب
صفحات : 980
قیمت : 695روپے
رابطہ : پورب اکیڈمی اسلام آباد

پروفیسر بشیر احمد کی شخصیت علمی ، ادبی حلقوں میں جانی پہچانی ہے انگریزی ادبیات کے اُستاد کی حیثیت سے گارڈن کالج راولپنڈی کے کئی عرصہ وابستہ رہے انگریزی اور اُردو زبان پر ان کی دسترس کا ثبوت ہے ان کی مترجم کتاب "تسخیر مسرت" پہلے بھی شائع ہو چکی ہے"فلسفہ مغرب کی تاری ان کی حال ہی میں شائع ہونے والی کتاب ہے۔

رسل (Russel) بنیادی طور پر تحلیلی حقیقت(Analytical Realism) کا حامی فلسفی تھا اس کا زیادہ کام ریاضیاتی منطق (Mathmatical Logic) کے گرد گھومتا ہے زیرتبصرہ کتاب ہمارے لئے اس لیے بھی اہم ہے کہ یہ محض فلسفیوں کے نظریات کے اقتباسات کو جوڑ کر ایک تاریخ نہیں بنائی گئی بلکہ ایک عصرِ حاضر کے اہم فلسفی کی تاریخِ عالم فلسفہ پر گہری تنقیدی تبصرہ بھی ہے جو حقیقت پرست فلسفی کی حیثیت سے خارجی عالم کے وجود کو معروضی میں ریاضیاتی اصول کے مطابق قائم دائم دیکھتا ہے۔

جبکہ متشکک فلسفی کے طور پر معروضی کو حسّی معطیات سے ماورا جا کر نہیں مانتا۔ یہ لاادریت برٹنر ینڈ رسل کے فلسفے کا بنیادی پیمانہ ہے۔

''فلسفہ مغرب کی تاریخ'' میں رسل اپنے منطقی استدلال کو مسلط کرنے کی بجائے تاریخ فلسفہ کی نامور شخصیات کے نظریات پر ان ہی کے دائرہ فکر میں تبصرہ کرتا ہے۔

کتاب کے اندر مزید 3 کتابیں بنائیں گئیں ہیں

(1) کتاب اوّل (قدیم فلسفہ)

۱	حصّہ اوّل	قبل سقراطی فلسفہ
۲	حصّہ دوئم	سقراط، افلاطون، ارسطو
۳	حصّہ سوئم	مابعد ارسطو قدیم فلسفہ

(2) کتاب دوئم (کیتھولک فلسفہ)

۱	حصّہ اوّل	علماء
۲	حصّہ دوئم	متکلمین

(3) کتاب سوئم (جدید فلسفہ)

۱	حصّہ اوّل	نشاۃِ ثانیہ سے ہوم تک
۲	حصّہ دوئم	روسو سے زمانہ حال تک

یونانی، اساطیری، اور دیو مالائی پس منظر کو اجاگر کرنے کی بجائے پہلے باب میں ہی آیونیا کے مفکرین پر بحث ہے جو رینائی دور سے گزرتی ہوئی فلسفے کے سنہری دور سقراط، افلاطون، اور ارسطو تک آتی ہے۔ کتاب دوئم میں رسل نے کیتھولک فلسفے کو علماء اور متکلمین میں تقسیم کر کے الگ الگ بحث کی ہے۔ فلسفے کی تاریخ کا تیسرا زمانہ سترہویں صدی سے آج تک ہے یہی وہ دور ہے جس میں سائنس فکر و عمل پر چھانا شروع کرتی ہے۔ برٹرنیڈ رسل بنیادی طور پر سائنسی نقطہ نظر کو ترجیح دیتا تھا۔ اس حصّہ کتاب میں وہ زیادہ دلائل سے گفتگو کرتا ملتا ہے۔

پروفیسر بشیر نے رسل کی زبان اور اس کے نقطہ نظر کو جس شستہ اور رواں اُردو میں

ڈھالا ہے بذاتِ خود یہ ایک معجزہ ہے۔ یہ صرف ترجمہ ہی نہیں بلکہ اُردو فلسفیانہ کتب میں ایک اہم اضافہ بھی ہے۔ پروفیسر بشیر کی یہ کتاب بہت ہی اہم اقتباسات کو اردو میں ہی پیش کرنے میں مدد دے گی۔

آخر میں حوالہ جات اور فرہنگ اصلاحات مترجم کے وسیع علمی وفکر گہرائی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

ثقافتی حبس اور پاکستانی سوسائٹی

مصنف : ارشد محمود

پتہ : ہم خیال پبلشرز فیصل آباد

سال اشاعت: 2004ء

قیمت : 160روپے

تبصرہ نگار : زاہد حسین

''ثقافتی حبس اور پاکستانی سوسائٹی'' ارشد محمود کی تیسری تصنیف ہے۔اس سے پہلے ان کی دو تصانیف ''تصورِ خدا'' اور ''تعلیم اور ہماری قومی الجھنیں'' شائع ہوچکی ہیں۔ارشد محمود اسلام آباد میں بسنے والا ایک ایسا ذہین ہے جو سماجی ہتھکڑیوں کوتوڑ کر باہر نکلنا چاہتا اور سوچنا چاہتا ہے،لیکن یہ کتاب کافی حد تک Xenocentrist ہوکر لکھی گئی ہے۔ثقافتی گھٹن،تنگ نظری، انتہا پسندی، مذہب یہ ایسی دیواریں ہیں جنہوں نے ہمیں ترقی کرنے سے روک دیا ہےاور ہم نے اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگیوں کواس حد تک جامد، بے کیف، خشک اور بور کرلیا ہے۔ بحیثیت حیوان جن جبلی خوشیوں پر ہمارا حق ہوسکتا تھا یہ کہہ کر کہ ہم حیوان نہیں انسان ہیں ان سے خود کومحروم کرلیا ہے اور انسان ہونے کے ناطے جن خوشیوں پر ہمارا حق تھا یہ کہہ کر رڈ کردیا کہ ہم انسان نہیں مسلمان ہیں۔حیوانیت سے انسانیت کی طرف ارتقاء میں ہم باقی قوموں کی نسبت کچھوے کی طرح آگے بڑھے ہیں۔

ارشد محمود نے روایتی انداز میں بات کرنے سے بغاوت کی ہے جس کیلئے اعتماد اور حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے اور ہمارے چاروں طرف چھائی دھند کی گہری چادر پر پھوار کا کام کیا ہے تاکہ اس اندھیری چادر کواتار کر دور تک دیکھا جاسکے۔

کتاب کے ابواب میں ارشد محمود ثقافتی گھٹن کے اسباب پر مختصر نظر ڈالتے ہوئے کہنا چاہتے ہیں کہ معاشی پسماندگی، پدرسری نظام، ماضی سے وابستگی، جدیدیت سے اختلاف، یہ وہ عوامل ہیں جو ہمیں ابھی تک بری طرح جکڑے ہوئے ہیں۔ پدرسری نظام جو جوڑا خاندان سے چلتا آ رہا ہے اسے جب تک ہم بدلنے کی کوشش نہیں کریں گے جاگیرداری کے فیصلوں سے آزاد نہیں ہو سکتے۔ ہم اس حد تک ماضی پرست ہیں کہ ہماری ہر مثال پندرہ سو سال پرانی ہوتی ہے کہ اس زمانے میں یہ تھا اس میں وہ تھا۔ خود کو دنیا کی سب سے پاک صاف قوم تصور کرتے ہوئے ہم اپنے آپ سے زیادتی بھی کرتے ہیں اور دھوکا بھی دیتے ہیں۔ عمرانیات کی رو سے یہ اصطلاح Ethnocentrism کہلاتی ہے جو ہمیں کسی نتیجے پر غیر جانبدارانہ طور پر پہنچنے نہیں دیتی۔ اسی لئے بہت ضروری ہے کہ ہم اپنے مسائل کا عقل اور سائنسی طور پر تجزیہ کریں۔

یہ کتاب پڑھنے والوں کے لئے نئے در کھولتی ہے جس سے اختلاف بھی کیا جا سکتا ہے اور حمایت بھی............ ایسے مباحث رُکے ہوئے مکالمے کے فروغ کے لئے عمدہ ثابت ہوں گے۔

کتنے پاکستان؟ (ناول)

مصنف : کملیشور
مترجم : خورشید عالم
تبصرہ نگار : ڈاکٹر محمد علی صدیقی
قیمت : 160 روپے
پتہ : مکتبہ استعارہ، 288 غفار اپارٹمنٹس، غفار منزل ایکس ٹینشن
استعارہ لین جامعہ نگر نئی دہلی 110025

یہ ناول نہیں بلکہ ایک ادیب کی عدالت میں بطور گواہ پیش ہونے والے بیانوں پر مشتمل برِ صغیر کی 5 ہزار سالہ تاریخ و تہذیب کی کہانی ہے۔

آپ چاہیں تو کملیشور کے اس دعوے سے اختلاف کریں کہ مذہبی نفرتیں انسانوں کو تقسیم کرتی ہیں، لیکن حقیقت اتنی سادہ نہیں ہوتی۔ ہر تقسیم کے پسِ پشت بہت ٹھوس اسباب ہوتے ہیں اور ان اسباب کے واقعات کو چولوں میں بٹھانا ہی سیاست کا وہ رُخ ہے جو ادیبوں کے بس کا کام نہیں۔ شاید کملیشور اسی لئے مماثلتیں تلاش کرتے ہوئے سوچتا ہے کہ کیا اب بھی پوکھران پر مور اور چاغی پر مدھ مکھیاں آتی ہیں۔

''مدھ مکھیاں، مور، کپوت، بلبل، گوریا، کھنجن، نیل کنٹھ، پپّیھاں، لالی، تتلیاں اور اب جگنو ہمارے چوباروں اور چھتوں کی منڈیروں پر کبھی نہیں آئیں گے اندھر کیر کہہ رہا تھا۔''

''اور پھر وہ پوکھرن اور چاغی کی طرف یہ جواب دیتے ہوئے غائب ہوگیا:

یہ سب انہی مذہبی کٹر پاگلوں کے چہرے ہیں جنہوں نے کئی سال پہلے
سومناتھ سے رتھ یاترا نکالی تھی اور وہاں سے چل کر بابری مسجد گرائی
تھی......"

یہ ناول اپنی جگہ کسی سے صرف اتنا مطالبہ کرتا ہے کہ ناول پڑھتے وقت اس نکتہ پر غور کریں کہ ہر مذہب اپنے پیروؤں کو اعلیٰ اخلاقی اقدار کی پیروی کی تلقین کرتا ہے لیکن ایسا کیوں ہوتا ہے کہ ہر مذہب کے سیاسی رہنما خود کو اپنی اصل مذہبی تعلیمات سے دور رکھ کر۔ سیدھے سادے عوام کی زندگیوں میں زہر گھولتے رہتے ہیں۔

"کتنے پاکستان" میں نسلِ انسانی کی تاریخ میں نفاق اور تقسیم در تقسیم کے متعدد 'episodes' پیش کئے گئے ہیں۔ اس ناول کی سب سے اچھی بات یہ ہے کہ اس میں کسی ایک مذہب، کسی ایک سیاسی رہنما اور کسی ایک سیاسی جماعت کو ہیرو یا ولن بنا کر پیش نہیں خیا گیا ہے۔ اس ناول کا ہیرو اور ولن سب ہی کسی نہ کسی وقت کج فہمی اور غلط اندیشی کا مظاہرہ کرتے دکھائی دیتے ہیں، خود بھارت کے ہندو، ہندوتوا کے نام پر تقسیم در تقسیم کی سیاست کھیل رہے ہیں۔ پاکستان کے مختلف علاقوں میں قوم پرست تنظیموں کے یہاں بھی مذہب کے بجائے تقسیم در تقسیم کی سیاست سر اٹھا رہی ہے۔ یہ درست ہے کہ تحریکِ پاکستان بالآخر تقسیمِ برصغیر کی تحریک ثابت ہوئی، لیکن اس سلسلے میں کملیشور کے یہاں، حقائق کا Selection درست نہیں۔ مثلاً وہ Cabinet Mission Plan کی تشریح کرتے وقت کانگریس اور پنڈت نہرو پر ہندوستان کی تقسیم کا الزام رکھ سکتے تھے۔ جناح اور نہرو کی طرف سے Cabinet Mission Plan کو تسلیم کرنے کے بعد اس پلان پر عمل درآمد میں آزاد ہندوستان کی پارلیمنٹ کے حتمی اختیار کی بات کرنا کیبنٹ پلان کی شرائط پر خطِ تنسیخ پھیرنے کے مترادف تھا۔ اس پلان کے ساتھ شرط یہ تھی کہ اسے اپنی کلیت میں منظور کیا جائے ورنہ شرائط کے ساتھ منظوری نارضامندی ہی تصور کی جائے گی۔

ناول نگار سے حقائق (Facts) کی متعدد غلطیاں سرزد ہوئی ہیں، مثلاً محمد علی جناح کا 7 اگست 1947ء کو دہلی سے واپسی پر ماری پور ایئرپورٹ کی جگہ کراچی ایئرپورٹ پر اترنا یا 1947ء کے رمضان المبارک کی آخری تاریخ کے بارے میں ایک غلط فہمی سے بچا

جاسکتا تھا۔ اگر کملیشور کے خیال میں قیام پاکستان کو 'سازش' کا نتیجہ تسلیم کرلیا جائے تو اس سازش میں پنڈت نہرو اور سردار پٹیل برابر کے شریک ثابت ہوتے ہیں۔

چونکہ محمد علی جناح کی طرف سے کیبنٹ مشن پلان کی منظوری کے بعد کانگریس کے حامی بورژوائیوں میں کھلبلی مچ گئی تھی کہ ایک کمزور مرکز کی مرکزی حکومت کا ہندوستان قابل قبول نہیں ہوگا جیسا کہ جی۔ ڈی برلا (G.D. Birla) کی تصنیف Memoirs میں شائع شدہ برلا کے خط سے واضح ہوتا ہے اس خط میں واضح طور پر کہا گیا کہ محمد علی جناح کی منظوری کو تسلیم نہ کیا جائے اور مشرقی ومغربی بازوؤں کے مسلم اکثریتی علاقوں کو علیحدہ ہونے دیا جائے۔

کملیشور کے ناول میں جناح Cabinet Mission Plan کی مخالفت کرتے نظر آتے ہیں جو سراسر غلط ہے اور اس غلطی کی بنیاد پر کھڑی ہونے والی پوری عمارت میں کجی آ گئی ہے۔ افسوس یہ ہے کہ اگر کملیشور حقائق کے اغلاط کو Fictionalize کرنے کے لئے ضروری خیال کرتے ہیں تب بھی اس ناول کے مطالعہ سے کملیشور کے یہاں انسان دوستی (Humanism) کے لئے تڑپ اور ہند مسلم ثقافت کے مشترکہ ورثہ کی عظمت پر کوئی اثر نہیں پڑتا لیکن تاریخی حقائق سے روگردانی ہیروز اور ولنز (Heroes & Villains) کی پہچان میں گڑبڑ پیدا کردیتی ہے۔

اب میں ناول کی تکنیک پر آتا ہوں۔ کملیشور نے انسانی تاریخ کے طویل دورانیہ پر محیط Structure کو بہت عمدگی کے ساتھ برتا ہے۔ خاص طور پر چھوٹے چھوٹے اشارے بہت بڑی بڑی باتوں کی طرف اشارے تکنیک سے زیادہ اسٹائل کی خوبیاں معلوم ہوتے ہیں۔

ناول کے شروع میں وِدّیا کے کردار کے ساتھ گزرے وقت کی وداع کا منظر اور آخر میں صرف ایک گہری چپ کے ساتھ وِدّیا کا ناول کے منظر سے دور ہوجانا کملیشور کی ماہرانہ چابکدستی کی اعلیٰ مثال ہے۔

کملیشور نے ناول میں سجاد ظہیر، امام علی خان نازش، جی۔ ایم۔ سید، الطاف حسین، عطاء اللہ مینگل وغیرہ وغیرہ کو جس طرح سے اپنے بیانیہ میں داخل اور بیانیہ سے خارج کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ پاکستان کی اندرونی سیاست پر کس قدر گہری نظر رکھتے ہیں۔

کملیشور فرقہ پرستوں کو معاف نہیں کرتے چاہے وہ کراچی سے سندھی ہندوؤں کا

افسوس ناک انخلا ہو یا سوم ناتھ رتھ یاترا کے لازمی نتیجہ کے طور پر بابری مسجد کا انہدام ہو وہ مظلوموں کا ساتھ دیتے ہوئے ملتے ہیں۔ وہ جس ورثہ کے مالک ہیں وہ سورداس، تلسی داس، کبیر اور میرا بائی کا ورثہ ہے۔ اس ورثہ کے افراد بند آنکھوں سے بھی اس قدر کچھ دیکھ لیتے ہیں جو کھلی آنکھوں والوں سے بھی اوجھل رہتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ کاش ہم حقائق کو اپنے اندر کی نہ نظر آنے والی آنکھ سے دیکھنے کی بھی کوشش کیا کریں چونکہ یہ آنکھیں دیکھنے میں غلطی نہیں کرتیں۔

خورشید عالم بحیثیت مترجم بہت کامیاب رہے ہیں۔

"نقاط" حاصل کرنے کیلئے
کراچی
☆ویلکم بک پورٹ، اردو بازار
☆اکادمی بازیافت، 20، بلاک 18 فیڈرل بی ایریا
اسلام آباد
☆مسٹر بکس، سپر مارکیٹ
☆سعید بک بینک جناح سپر مارکیٹ
لاهور
☆کلاسک، مال روڈ لاہور
☆فکشن ہاؤس، 18 مزنگ روڈ
☆تخلیقات، مزنگ روڈ
☆ماورا، مال روڈ
پشاور
☆سعید بک بنک، ارباب روڈ پشاور کینٹ
آزاد کشمیر
☆روشن خیال بک سنٹر، حافظ اسلام روڈ کوٹلی
☆زین بکس کارنر، پونچھ روڈ کوٹلی
☆فیاض روشن بک سنٹر، ارم گل روڈ کوٹلی
راولپنڈی
☆گندھارا پبلشرز، اصغر مال روڈ
سیالکوٹ
☆ینگش بک ڈپو، اردو بازار
حیدر آباد
☆غلام نبی بک سٹال
☆کریمی بک ہاؤس، بالمقابل چاندنی سینما
گوجرانواله
☆مدینہ کتاب گھر، اردو بازار
ملتان
☆کتاب نگر، حسن ارکیڈ ملتان کینٹ
☆بیکن بکس، لال باغ گلگشت کالونی
اٹک
☆خزینۂ علم وادب، اٹک سٹی
چنیوٹ
علی کتاب گھر، نزد اسلامیہ سکول
بهاولپور
☆کارواں بک سیلرز، سرائیکی چوک
سرگودها
☆احمد سعید، ایڈوانس بک ڈپو، کالج روڈ
رحیم یارخاں
☆بشیر امانت علی اینڈ سنز، ایوان صحافت، شاہی روڈ
☆اسلامی کتب خانہ، جدید بازار
فیصل آباد
☆ہیلو بکس، کارنر بھوانہ بازار
☆ملک بک ڈپو، ڈی گراؤنڈ
☆فیاض بک ڈپو، امین پور بازار
☆اقراء کمپیوٹرز اینڈ پبلیکیشنز، پریس مارکیٹ
☆بیسٹ سیلرز، ڈی گراؤنڈ
☆ضیاء بک سیلرز، ڈی گراؤنڈ
رابطہ: P-240، رحمٰن سٹریٹ سعید کالونی مدینہ ٹاؤن فیصل آباد
فون 0300-6663350

QASIM
yaqoob